هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٨﴾ (آل عمران)

بیان القرآن

حصّہ اوّل

سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ

مع تعارفِ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

انجمن خُدّامُ القرآن
خیبر پختونخوا، پشاور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک ضروری گزارش!

معزز قارئینِ کرام! اس کتاب کو عام قاری کے مطالعہ، اُمتِ مسلمہ کی راہنمائی اور ثوابِ دارین کے خاطر پاکستان ورچوئل لائبریری پر شائع کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو میری یہ کاوش پسند آئی ہے یا آپ کو اس کتاب کے مطالعے سے کوئی راہنمائی ملی ہے تو برائے مہربانی میرے اور میرے والدین کی بخشش کے لئے اللہ رب العزت سے دُعا ضرور کیجئے گا۔ شکریہ

طالبِ دُعا سعید خان

بیان القرآن

حصّہ اول

ترجمہ و مختصر تفسیر

سورۃ الفاتحہ وسورۃ البقرۃ

از

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتّب

قرآن حکیم نوعِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری اور تکمیلی پیغامِ ہدایت ہے‘ جسے نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت وتبلیغ میں مرکز ومحور کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ ﷺ نے اس قرآن کی بنیاد پر نہ صرف دنیا کو ایک نظامِ عدلِ اجتماعی عطا فرمایا بلکہ اس عادلانہ نظام پر مبنی ایک صالح معاشرہ بھی بالفعل قائم کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ نے اس قرآن کی راہنمائی میں انقلاب کے تمام مراحل طے کرتے ہوئے نوعِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا فرما دیا۔ چنانچہ یہ قرآن محض ایک کتاب نہیں ”کتابِ انقلاب“ ہے‘ اور اس شعور کے بغیر قرآن مجید کی بہت سی اہم حقیقتیں قرآن کے قاری پر منکشف نہیں ہو سکتیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کو جنہوں نے اِس دور میں قرآن حکیم کی اس حیثیت کو بڑے وسیع پیمانے پر عام کیا ہے کہ یہ کتاب اپنی دیگر امتیازی حیثیتوں کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب اور آپؐ کے برپا کردہ انقلاب کے مختلف مراحل کے لیے بمنزلۂ مینول (manual) بھی ہے‘ لہٰذا اس کا مطالعہ آنحضور ﷺ کی دعوت وتحریک اور انقلابی جدوجہد کے تناظر میں کیا جانا چاہیے اور اس کے قاری کو خود بھی ”منہجِ انقلابِ نبویؐ“ پر مبنی انقلابی جدوجہد میں شریک ہونا چاہیے۔ بصورتِ دیگر وہ قرآن حکیم کے معارف کے بہت بڑے خزانے تک رسائی سے محروم رہے گا۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے دورۂ ترجمہ قرآن (بیان القرآن) میں بھی قرآن کریم کی اس امتیازی حیثیت کو پیش نظر رکھا ہے‘ جسے دعوت رجوع الی القرآن کے انتہائی اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ اس شہرۂ آفاق ”بیان القرآن“ کو مرتب کر کے کتابی صورت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ راقم الحروف نے اللہ تعالیٰ کی تائید وتوفیق طلب کرتے ہوئے کچھ عرصہ قبل اس کام کا بیڑا اٹھایا اور پہلے ”تعارفِ قرآن“ اور پھر رفتہ رفتہ سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی ترتیب وتسوید مکمل کی۔ اب تک مکمل ہونے والا کام کتابی صورت میں ”بیان القرآن“ (حصہ اوّل) کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ قارئین کرام سے استدعا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور اس عاجز کے لیے اُس ہمت واستقامت کی دعا کریں جو اس عظیم کام کی تکمیل کے لیے درکار ہے۔

حافظ خالد محمود خضر

مدیر شعبہ مطبوعات‘ قرآن اکیڈمی لاہور

نومبر ۲۰۰۸ء

تقدیم

اسرار احمد

اِن سطور کے ناچیز راقم کو قرآن مجید کا مفسّر تو بہت دُور کی بات ہے‘ مروّجہ مفہوم کے اعتبار سے ’’عالمِ دین‘‘ ہونے کا بھی ہرگز کوئی دعویٰ نہیں ہے‘ تاہم‘ خالصتاً ’’تحدیثًا لِلنّعمة‘‘ (بمصداق ’’وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ‘‘) اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے اعتراف واظہار میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ اس نے اپنے خاص فضل وکرم سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اوائل عمر ہی میں قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک دلی اُنس اور ذہنی مناسبت قائم ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اوّلاً بالکل ہی نوعمری میں (ہائی سکول کے ابتدائی سالوں کے دوران) علاّمہ اقبال کی شاعری کے ذریعے قرآن کی عظمت‘ ملتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ کی امید اور اس کے ضمن میں قرآن کی اہمیت کا ایک گہرا نقش قلب پر قائم فرما دیا‘ پھر ایک خاندانی روایت کے مطابق ہائی سکول کی تعلیم کے دوران عربی کو ایک اضافی مضمون کی حیثیت سے اختیار کرنے کی صورت پیدا فرما دی جس سے عربی گرامر کی اساسات کا علم حاصل ہو گیا —— اور پھر میٹرک کے امتحان کے بعد فراغت کے دنوں میں‘ جبکہ ۱۹۴۷ء کے مسلم کش فسادات کے نتیجے میں ہم لگ بھگ ایک ماہ قصبہ حصار (جو اَب بھارت کی ریاست ہریانہ میں ہے) میں ہندوؤں کے حملوں سے دفاع کے لیے چند محلّوں پر مشتمل ایک دفاعی بلاک میں ’’محصور‘‘ تھے‘ قرآن حکیم سے پہلے معنوی تعارف کی یہ صورت پیدا فرما دی کہ مجھے اور میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب مرحوم کو ایک مسجد میں بیٹھ کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ماہنامہ ’’ترجمان القرآن‘‘ میں شائع ہونے والی تفسیر سورۂ یوسفؑ کے اجتماعی مطالعے اور اس پر باہمی مذاکرے کا موقع ملا‘ جس سے اندازہ ہوا کہ قرآن فصاحت و بلاغت کی معراج اور سرچشمۂ ہدایت ہی نہیں منبعِ علم وحکمت بھی ہے‘ اور واقعتاً اِس لائق ہے کہ بہترین ذہنی وفکری صلاحیتوں کو اس کے علم وفہم کے حصول میں اس طور سے صرف کیا جائے کہ اوّلاً اس کے عمومی پیغام کو صحیح طور پر سمجھیں جو کہ علم و حکمت کے اس بحرِ زخّار کی سطح پر بالکل اسی طرح تیر رہا ہے جیسے کسی تیل بردار جہاز میں شکست وریخت کے باعث اس سے نکل کر بہنے والا تیل سطحِ سمندر پر تیر رہا ہوتا ہے‘ اور پھر اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے اس کی تہہ سے اس کے فلسفہ وحکمت کے اصل موتیوں کو تلاش کریں!

الحمدللہ‘ ثم الحمدللہ‘ کہ یہ ان ہی امورِ ثلاثہ کے نتیجے کا ظہور تھا کہ جب تقسیم ہند کے وقت ایک سو ستر میل کا سفر (حصار تا ہیڈ سلیمانکی) پیدل قافلے کے ساتھ آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان پہنچنا نصیب ہوا تو فوراً تحریکِ جماعتِ اسلامی کے ساتھ عملی وابستگی ہو گئی —— (جو اوّلاً اسلامی جمعیتِ طلبہ میں شمولیت کی صورت میں تھی‘ اور اس کے بعد جماعتِ اسلامی کی رکنیت کی شکل میں!) اور اس پورے دس سالہ عرصے کے دوران جمعیت اور جماعت کے اجتماعات میں ’’درسِ قرآن‘‘ کی ذمہ داری عموماً مجھ پر عائد ہوتی رہی۔ جسے بالعموم بہت استحسان کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا —— اگرچہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سامعین کی جانب سے یہ تحسین وتعریف اقبال کے اس شعر کے عین مطابق ہے کہ ؎

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری — وگرنہ شعر مرا کیا ہے! شاعری کیا ہے!!

مزید برآں میں ہرگز اس کا دعویٰ بھی نہیں کرتا کہ میرے اس تعلّم وتدبرِ قرآن کے ذوق وشوق میں روزافزوں اضافے میں اس خارجی پسندیدگی کی بنا پر پیدا ہونے والی ’’ہمت افزائی‘‘ کو سِرے سے کوئی دخل حاصل نہیں تھا‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے دروس کے لیے تیاری کے ضمن میں جو مطالعہ کرتا اور مختلف عربی اور اردو تفاسیر سے رجوع کرتا اور پھر اپنے ذاتی غوروفکر سے بھی کام لیتا تو اس کے نتیجے میں مجھ پر قرآن کی عظمت مزید منکشف ہوتی چلی گئی —— اور اس قول کو ہرگز کسی مبالغے پر مبنی نہ سمجھا جائے کہ قرآن نے مجھے اپنا ’’اسیر‘‘ (possess) کرلیا۔ چنانچہ یہ اسی اسیری کا مظہر ہے کہ میں نے ۱۹۵۲ء ہی میں (بیس سال کی عمر میں) میڈیکل ایجوکیشن کے عین وسط میں یہ شعوری فیصلہ کرلیا تھا کہ اب یہ طب کی تعلیم بھی اور طبابت کا پیشہ بھی‘ سب میری ترجیحات میں نمبر دو پر رہیں گے‘ اوّلین ترجیح خدمتِ قرآن حکیم اور خدمتِ دینِ متین کو حاصل رہے گی! اور پھر ۱۹۷۱ء میں قمری حساب سے چالیس سال کی عمر میں جب یہ محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل وکرم سے مجھ پر اپنی شانِ ’’عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ‘‘ کے ساتھ ساتھ ’’عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ‘‘ کا بھی کسی درجے میں فیضان فرما دیا ہے تو اپنے پیشہ طبابت کو بالکل خیرباد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت قرآنِ مبین اور دینِ متین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

مجھ پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل وکرم اس اعتبار سے بھی ہوا کہ اس نے مجھے کسی ایک لکیر کا فقیر ہونے سے بچا لیا۔ —— چنانچہ قرآن کے علم وفہم کے ضمن میں میرے استفادے کا حلقہ بہت وسیع بھی ہے —— اور بعض اعتبارات سے تضادات کا حامل بھی! —— میں نے اپنی ایک تالیف ’’دعوت رجوع الی القرآن کا منظر وپس منظر‘‘ میں اس کی پوری تفصیل درج کر دی ہے کہ میرے علم وفہم قرآن کے ’’حوض‘‘ میں تفسیر قرآن کے چار سلسلوں کی نہروں سے پانی آتا رہا‘ جن پر پانچواں اضافہ میری تعلیم میں شامل علومِ طبیعیہ کے مبادیات کا علم تھا۔ پھر اللہ نے مجھے جو منطقی ذہن عطا فرمایا تھا اس کے ذریعے ان پانچ سلسلوں سے حاصل شدہ معلومات میں ’’تجمیع و توافق‘‘ (synthesis) قائم کیا۔ جس کی بنا پر بحمد اللہ میرے ’’بیان القرآن‘‘ کو ایک جامعیت حاصل ہوگئی۔ اور غالباً یہی اس کی مقبولیت کا اصل راز ہے۔ [1] واللہ اعلم!

ایک مستند ’’عالمِ دین‘‘ نہ ہونے کے باوجود جس چیز نے مجھے درس وتدریس قرآن کی جرأت (بلکہ ٹھیٹھ مذہبی حلقوں کے نزدیک ’’جسارت‘‘) کی ہمت عطا فرمائی‘ وہ نبی اکرم ﷺ کا یہ قولِ مبارک ہے کہ: ((بَلِّغُوۡا عَنِّيۡ وَلَوۡ آيَةً)) یعنی ’’پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت!‘‘ (صحیح بخاری‘ اور اس کے علاوہ ترمذی‘ احمد اور دارمی رحمۃ اللہ علیہم)۔ چنانچہ میرے نزدیک جن علومِ دینی کی تحصیل کو علماءِ کرام لازمی قرار دیتے ہیں وہ کسی کے ’’مفتی‘‘ بننے کے لیے تو لامحالہ لازمی ہیں‘ لیکن قرآن کے داعی اور مبلغ بننے کے لیے ہرگز ضروری نہیں ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کا پیغام اگرچہ تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کے لیے تھا‘ تاہم اس کے اوّلین مخاطب تو ’’اُمّی‘‘ تھے۔ چنانچہ قرآن کے اصل پیغام کو اللہ تعالیٰ نے نہایت ’’تیسیر‘‘ صورت میں‘ جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا‘ ایک اتھاہ سمندر کی سطح پر تیرنے والے تیل کے مانند پیش کیا (یہی وجہ ہے کہ سورۃ القمر میں چار بار فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ﴾ یعنی ’’ہم نے نصیحت وہدایت کے لیے قرآن کو بہت آسان بنا دیا ہے‘ تو ہے کوئی جو اس سے تذکّر حاصل کرے!‘‘)

قصہ مختصر —— لاہور میں ۱۹۶۵ء سے میرے باضابطہ حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن قائم ہوئے تو اس کے نتیجے میں پہلے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم ہوئی‘ جس کی کوکھ سے ذیلی انجمنوں کا ایک سلسلہ برآمد ہوا (کراچی‘ ملتان‘ فیصل آباد‘ جھنگ‘ کوئٹہ‘ اسلام آباد‘ پشاور) پھر ۱۹۷۶ء میں لاہور میں قرآن اکیڈمی قائم ہوئی‘ اور اس کی ’’بیٹیوں‘‘ کے طور پر کراچی‘ ملتان‘ فیصل آباد اور جھنگ میں بھی اکیڈمیاں وجود میں آئیں۔ ساتھ ہی پاکستان کے طول وعرض میں بڑے بڑے شہروں میں میرے درسِ قرآن کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ پھر قرآنی تربیت گاہوں (جو ایک ہفتہ سے لے کر ایک مہینے تک کے عرصے پر محیط ہوتی تھیں) کا سلسلہ شروع ہوا —— ادھر لاہور

میں سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ جاری ہوا اور پھر جب پاکستان ٹیلی ویژن پر یہ درسِ قرآن شروع ہوا تو اوّلاً ''الکتٰب'' پھر ''آلٓمّٓ'' پھر نبی کامل (ﷺ) اور بالآخر ''الھُدیٰ'' کا ہفتہ وار پروگرام جو پورے پندرہ مہینے اِس شان سے جاری رہا کہ ہفتے کے ایک ہی دن' ایک ہی وقت پر' پاکستان کے تمام ٹی وی سٹیشنوں سے نشر ہوتا تھا ------ تو اُس زمانے میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی بنا پر مجھے اپنے بارے میں وہ شدید اندیشہ لاحق ہو گیا تھا جس کا ذکر ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی شخص کی تباہی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کی جانب انگلیاں اٹھنی شروع ہو جائیں!'' اس پر دریافت کیا گیا کہ: ''اگر یہ کسی خیر کی بنیاد پر ہو تو کیا تب بھی؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ''ہاں تب بھی' اس لیے کہ اس سے انسان کے لغزش میں مبتلا ہونے (یعنی اس میں عُجب اور تکبر جیسی ہلاکت خیز بیماریوں کے پیدا ہو جانے) کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے ------ اِلّا یہ کہ اللہ کی رحمت شامل حال ہو!'' (اس حدیث کو محدث ذہبیؒ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' اگرچہ اس کی روایت میں کسی قدر ضعف موجود ہے۔) اس لیے کہ اس زمانے میں فی الواقع کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ میں جدھر جاتا تھا لوگ ایک دوسرے کو اشاروں کے ذریعے میری طرف متوجہ کرتے تھے ------ یہ بھی اُس زمانے کی بات ہے کہ مجھ سے متعدد لوگوں نے تفسیر قرآن لکھنے کی فرمائش کی' اور ایک پبلشر نے تو بہت اصرار کیا کہ آپ ایک ترجمۂ قرآن ہی لکھ دیں ------ لیکن میں نے ہمیشہ اور سب سے یہی کہا کہ یہ میرا مقام نہیں ہے! ------ اس دعوتِ قرآنی میں اگرچہ میرا زیادہ زور قرآن کے چیدہ چیدہ مقامات پر مشتمل ''مطالعۂ قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب'' کے درس پر رہا' لیکن بحمد اللہ دو بار پورے قرآن مجید کا درس دینے کی سعادت بھی حاصل ہوئی' اگرچہ وہ سارا ٹیپ پر ریکارڈ شدہ موجود نہیں ہے!

اس دعوتِ قرآنی کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ ۱۹۸۴ء (۱۴۰۴ھ) میں نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ہر چار رکعت تراویح سے قبل ان رکعتوں میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان ہوتی تھی ------ پھر نماز میں ان کی سماعت ہوتی تھی' جس کے نتیجے میں' بعض لوگوں میں کم اور بعض میں زیادہ' وہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جسے اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب   گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

اس عمل کے نتیجے میں نمازِ عشاء اور نمازِ تراویح کی تکمیل میں لگ بھگ چھ گھنٹے صرف ہوتے تھے ------ اور بحمد اللہ سامعین کا جوش و خروش اور ذوق و شوق دیدنی ہوتا تھا ------ اور ثم الحمد للہ کہ اب یہ سلسلہ پاکستان کے بہت سے مقامات پر میری صلبی اور معنوی اولاد کے ذریعے جاری ہے!

اس سلسلے میں دورۂ ترجمہ قرآن کا جو پروگرام ۱۹۹۸ء میں کراچی کی قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں ہوا' اس کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ اعلیٰ معیار پر کی گئی تھی۔ چنانچہ یہ بحمد اللہ آڈیو ویڈیو کیسٹوں اور C.D.s اور D.V.D.s اور ٹی وی چینلز کے ذریعے پوری دنیا میں نہایت وسیع پیمانے پر پھیل چکا ہے ------ اور اب اسے کتابی شکل میں بھی شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے' جس کی پہلی جلد آپ کی خدمت میں حاضر ہے! اس کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں انجمن خدام القرآن صوبہ سرحد کے صدر جناب ڈاکٹر اقبال صافی نے تاکید کا جو باوٴ مرکزی انجمن پر برقرار رکھا اور مالی تعاون بھی پیش کیا' اس کی بنا پر اس سے استفادہ کرنے والے ہر شخص پر ان کا یہ حق ہے کہ ان کے لیے دعائے خیر ضرور کرے۔

آخری بات یہ کہ اس ''بیان القرآن'' کے ضمن میں اگر اصحابِ علم میری غلطیوں کی نشاندہی کریں تو میں ممنون ہوں گا ------ اور آئندہ طباعت میں تصحیح بھی کر دی جائے گی۔ اس بات کو دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ میں نہ مفسر ہونے کا مدعی ہوں نہ عالم ہونے کا' بلکہ صرف اللہ کے کلامِ پاک اور اس کے دینِ متین کا ادنیٰ خادم ہوں۔ اور میری سب حضرات سے اِستدعا ہے کہ میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ میری مساعی کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بنا دے۔ آمین! یاربَّ العالمین!

(نوٹ: اِس پوری بحث میں میں نے اقامتِ دین کی عملی جدوجہد کے لیے تنظیم اسلامی کے قیام کا ذکر نہیں کیا ------ اس لیے کہ یہ ایک مستقل اور جداگانہ باب ہے' اور اس مختصر 'تقدیم' میں نہ اس کی گنجائش ہے نہ ضرورت۔ تاہم اس کے لیے میری تالیفات ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' اور ''سلسلۂ اشاعت تنظیم اسلامی'' از اوّل تا دہم کا مطالعہ مفید ہوگا۔)

دعا کا طالب

۲۶/نومبر ۲۰۰۸ء   خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

تقدیم طبع ثالث

''بیان القرآن'' (حصہ اوّل) کے پہلے دو ایڈیشن چند ہی ماہ میں (یعنی دیکھتے ہی دیکھتے!) ختم ہو گئے۔ اور یہ بات میرے لیے بہت حیرت انگیز ہے۔ اس لیے کہ میں اوّلاً تو مفسر قرآن ہی نہیں ہوں' ثانیاً میرا کسی معروف مذہبی فرقے یا مسلک سے کوئی تنظیمی تعلق بھی نہیں ہے۔ ان امور کے علی الرغم اس کی اس قدر پذیرائی یقیناً اللہ تعالیٰ کی کسی خصوصی مشیت کی مظہر ہے ------ واللہ اعلم!!

قرآن حکیم کی اس ترجمانی میں اگر کوئی خیر وجود میں آیا ہے تو وہ سراسر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے ------ اور خالصتاً اس کی عطا و مرحمت کا نتیجہ ہے۔ اور اگر کسی مقام پر کوئی غلطی ہو گئی ہے تو وہ سراسر میرے علم یا فہم کا قصور ہے' جس کے لیے اللہ تعالیٰ سے بھی عفو و درگزر کا طلب گار ہوں ------ اور اہل علم حضرات سے بھی توقع رکھتا ہوں کہ اس پر خالصتاً فرمانِ نبویؐ ''الدِّینُ النَّصِیحۃُ'' کے مطابق متنبہ فرما کر ثواب حاصل کریں گے ------ ! اور ذاتی طور پر میں بھی ممنون ہوں گا!!

اس جلد میں ابھی صرف سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی ترجمانی ہوئی ہے' گویا کہ ابھی پہاڑ ایسا بھاری کام باقی ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے توقع ہے کہ جیسے اس نے' میرے کسی ارادے یا منصوبہ بندی کے بغیر اور میری خالص لاعلمی میں پیش نظر جلد شائع کرا دی' ویسے ہی باقی بھی شائع کرا دے گا' ------ خواہ خود میری اس دنیا سے دارِ آخرت کی جانب روانگی کے بعد ہی سہی ------ آخر میں دعا ہے: اللّٰھمّ تقبّل منّی فانّک خیرُ المُتقبّلِین وتُب عَلَیَّ فانّک انت التوّابُ الرّحیم! آمین! یاربّ العٰلمین!!

۸/اگست ۲۰۰۹ء   خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

باب اوّل

قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ

تعارفِ قرآن مجید کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا ایمان' یا اصطلاحِ عام میں ہمارا عقیدہ کیا ہے؟

قرآن حکیم کے متعلق اپنا عقیدہ ہم تین سادہ جملوں میں بیان کر سکتے ہیں:

۱) قرآن اللہ کا کلام ہے۔

۲) یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

۳) یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے' اور کل کا کل من وعن موجود ہے' اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔

یہ تین جملے ہمارے عقائد کی فہرست کے اعتبار سے' قرآن حکیم کے بارے میں ہمارے عقیدے پر کفایت کریں گے۔لیکن انہی تین جملوں کے بارے میں اگر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے اور دقتِ نظر سے ان پر غور کیا جائے تو کچھ علمی حقائق سامنے آتے ہیں۔تمہیدی گفتگو میں ان میں سے بعض کی طرف اجمالاً اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام

سب سے پہلی بات کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے' خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ط﴾

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے' پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دو۔''

جب سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں' جن میں مشرکین عرب کو آخری الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو چار ماہ کی مدت کے خاتمے کے بعد تمہارا قتل عام شروع ہو جائے گا' تو اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کو ایک ہدایت یہ بھی دی گئی کہ یہ الٹی میٹم دیے جانے کے بعد اگر مشرکین میں سے کوئی آپؐ کی پناہ طلب کرے تو وہ آپؐ کے پاس آ کر مقیم ہو اور کلام اللہ کو سنے' جس پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے' پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دیا جائے۔یعنی ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہیں اس سے مطالبہ کیا جائے کہ فیصلہ کرو کہ آیا تم ایمان لاتے ہو یا نہیں۔اس وقت میں نے اس آیت کا حوالہ صرف ''کلام اللہ'' کے الفاظ کے لیے شہادت کے طور پر دیا ہے۔

کلامِ الٰہی: جملہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر

قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے میں ہی اس کی اصل عظمت کا راز مضمر ہے۔اس لیے کہ کلام متکلّم کی صفت ہوتا ہے اور اس میں متکلم کی پوری شخصیت ہویدا ہوتی ہے۔چنانچہ آپ کسی بھی شخص کا کلام سن کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے علم اور فہم و شعور کی سطح کیا ہے۔آیا وہ تعلیم یافتہ انسان ہے' مہذب ہے' متمدن ہے یا کوئی اجڈ یا گنوار ہے۔اس اعتبار سے درحقیقت یہ کلام اللہ' اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات کا مظہر ہے' اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است
مثل حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

(جو بات میرے دل میں چھپی ہوئی ہے وہ میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ یہ (قرآن حکیم) کتاب نہیں ہے' کوئی اور ہی شے ہے۔چنانچہ یہ حق تعالیٰ کی ذات کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی ہے۔نیز یہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا بھی ہے اور یہ کلام بھی کرتا ہے۔)

مختلف مفاہیم و معانی کے لیے اس شعر کا حوالہ دے دیا جاتا ہے' لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں اس کے ''چیزے دیگر'' ہونے کا کون سا پہلو اُجاگر کیا جا رہا ہے۔اس میں درحقیقت سورۃ الحدید کے اس مقام کی طرف اشارہ ہو گیا ہے کہ: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج﴾ (آیت ۳) یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ الاوّل بھی ہے اور الاٰخر بھی' وہ الظاهر بھی ہے اور الباطن بھی۔اسی طرح علامہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کی بھی یہی شان ہے۔نیز جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت الحیّ القیّوم (آیت الکرسی' سورۃ البقرۃ) ہے اسی طرح یہ کلام بھی زندہ و پائندہ ہے' ہمیشہ رہنے والا ہے۔پھر یہ صرف کلام نہیں' خود متکلّم ہے۔

یہاں کلام اور متکلم کے مابین فرق کے حوالے سے متکلمین کی اس بحث کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذاتِ حق کی صفات' ذات سے علیحدہ اور مستزاد ہیں یا عین ذات؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس بحث کا ذکر کیا ہے ؎

ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جدا یا عین ذات؟
اُمت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

یہ علم کلام کا ایک نہایت ہی پیچیدہ' غامض اور عمیق مسئلہ ہے' جس پر بڑی بحثیں ہوئیں اور بالآخر متکلمین کا اس پر تقریباً اجماع ہوا کہ ''لَا عَیْنٌ وَلَا غَیْرٌ'' یعنی اللہ کی صفات کو نہ اس کی ذات کا عین قرار دیا جا سکتا ہے نہ اس کا غیر۔اگر اس حوالے سے غور کریں تو قرآن حکیم بھی' جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' اسی کے ذیل میں آئے گا' یعنی نہ اسے اللہ کا غیر کہا جا سکتا ہے نہ اس کا عین۔

چنانچہ اس حوالے سے سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ قرآن مجید کی فی نفسہٖ عظمت کے ضمن میں اہم ترین ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اُتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا' اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ غور کریں۔''

اس تمثیل کو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طلبی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر حاضر ہونے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ وہی طلبی تھی جس میں آپ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطبہ و مکالمہ سے سرفراز فرمایا تو ان کی آتش شوق کچھ اور بھڑکی اور انہوں نے فرمائش کرتے ہوئے کہا: ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ﴾ ''اے پروردگار! مجھے اپنا دیدار عطا فرما''۔ مخاطبہ و مکالمہ کے شرف سے تو نے مجھے مشرف فرمایا ہے' اب ذرا مزید کرم فرما۔ اس پر جواب ملا: ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ ''(موسیٰ) تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے!'' ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ﴾ ''لیکن ذرا اس پہاڑ کی طرف دیکھو' میں اس پر اپنی ایک تجلّی ڈالوں گا۔ ﴿فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ﴾ ''چنانچہ اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو پھر تم بھی گمان کر لینا کہ تم مجھے دیکھ سکو گے''۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۚ﴾ ''پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ پر اپنی تجلّی ڈالی تو وہ ''دَکًّا دَکًّا'' ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

یہاں ''دَکًّا'' کے دونوں ترجمے کیے جا سکتے ہیں' یعنی ریزہ ریزہ ہو جانا' ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا' یا کوٹ کوٹ کر کسی شے کو ہموار کر دینا' برابر کر دینا۔ جیسے سورۃ الفجر کی آیت ﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾﴾ میں ان معنوں میں وارد ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں پہاڑ کے بارے میں آیا ہے۔ یعنی وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا یا دب گیا' زمین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی یہ تجلّی دیکھی جو بالواسطہ تھی' یعنی براہِ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں بلکہ پہاڑ پر تھی اور حضرت موسیٰؑ بالواسطہ اس کا نظارہ کر رہے تھے' لیکن خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت یہ ہوئی کہ ﴿خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا﴾ ''حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

یہاں ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کی بحث کا ایک عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو وہ پہاڑ دب گیا یا پھٹ گیا' ریزہ ریزہ ہو گیا' اسی طرح قرآن مجید کے متعلق فرمایا:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ﴾

یعنی کلام اللہ کی بھی وہی کیفیت اور تاثیر ہے جو کیفیت و تاثیر تجلیٔ ذاتِ الٰہی کی ہے۔ اس لیے کہ قرآن اللہ کا کلام اور اللہ کی صفت ہے۔ تو تجلیٔ صفات اور تجلیٔ ذات میں کوئی فرق نہیں۔

البتہ علامہ اقبال نے ایک جگہ اس بارے میں ذرا مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ علامہ نے حضور ﷺ کی مدح فرماتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے: ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری و تبسمی!

علامہ حضرت محمد ﷺ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقابل کر رہے ہیں کہ وہ تو تجلیٔ صفات کے بالواسطہ نظارے ہی سے بے ہوش ہو کر گر گئے' لیکن اے نبیؐ! آپ نے عینِ ذات کا دیدار کیا اور تبسم کی کیفیت میں کیا۔ اس میں دو اعتبارات سے مغالطہ پایا جاتا ہے۔ اوّل تو وہ تجلی' تجلیٔ صفات نہیں تجلیٔ ذات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر ڈالی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾ گویا یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ وہ خود متجلّی ہوا۔ دوسرے یہ کہ یہ خیال بھی مختلف فیہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا۔ اگرچہ ہمارے اسلاف میں یہ رائے بھی ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے' لیکن اکثر و بیشتر کی رائے اس کے برعکس ہے' اس لیے کہ وہاں بھی ''آیات'' کا ذکر ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیا: ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آیات' جو وہاں حضور نبی اکرم ﷺ نے دیکھیں' اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین آیات میں سے ہیں۔

﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾

''اُس وقت بیری پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی اور نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ اور اُس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

اب اُس سے زیادہ بڑی آیات اور اس سے زیادہ بڑی تجلیٔ الٰہی اور کہاں ہو گی؟ لیکن دونوں اعتبار سے اس شعر میں مبالغہ ہے۔ البتہ اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے علامہ کے اس شعر ؎

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

میں میرے نزدیک قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اور اس آیت مبارکہ کے حوالے سے وہ بات کہی جا سکتی ہے جو علامہ اقبال نے اس شعر میں کہی ہے۔

تورات کی گواہی

اب ذرا قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے حوالے سے ایک اور بات ذہن نشین کر لیجیے۔ تورات میں کتابِ استثناء یا سفر استثناء جو صحف موسیٰ میں سے ایک صحیفہ ہے' کے اٹھارہویں باب میں نبی اکرم ﷺ کے لیے جو پیشین گوئی بیان کی گئی ہے اس میں الفاظ یہی ہیں کہ:

''میں ان کے بھائیوں میں سے ان کے لیے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا اور وہ اُن سے وہی کچھ کہے گا جو میں اس سے کہوں گا۔''

مَیں نے یہاں خاص طور پر ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے کہ ''میں اُس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا''۔ یہاں ایک تو لفظ کلام آیا ہے جیسے کہ قرآن حکیم کی اس آیت میں آیا: ﴿حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ﴾ پھر ''کلام مُنہ میں ڈالنا'' کے حوالے سے قرآن مجید میں ایک لفظ دو مرتبہ آیا ہے' وہ لفظ ''قول'' ہے' یعنی قرآن کو قول قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ الحاقہ میں ہے:

﴿اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ کَاھِنٍ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾

اور سورۃ التکویر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِیْ قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾﴾

اور اسی سورۃ میں آگے چل کر آیا:

﴿وَمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ ﴿۲۵﴾﴾

قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان دو مقامات میں سے مؤخر الذکر کے متعلق تقریباً اجماع ہے کہ یہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں۔ گویا قرآن کو اُن کا قول قرار دیا گیا۔ اور سورۃ الحاقہ میں اسے نبی اکرم ﷺ کا قول قرار دیا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے یہاں جن چیزوں کی نفی کی جا رہی ہے کہ ''یہ کسی شاعر کا قول نہیں'' اور ''یہ کسی کاہن کا قول نہیں'' ان سے یقیناً رسول کریم ﷺ مراد ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اللہ کا کلام پہلے حضرت جبرائیل علیہ السلام پر نازل ہوا۔ اگر میں کتاب استثناء کے الفاظ استعمال کروں تو یہاں ''اللہ نے اپنا کلام ان کے مُنہ میں ڈالا''۔ تاہم ''اُن کے مُنہ'' کا ہم کوئی تصور نہیں کر سکتے' وہ نہایت جلیل القدر فرشتے ہیں۔ بہرحال قول کا لفظ قرآن مجید کے لیے استعمال ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ابتداءً کلامِ الٰہی حضرت جبرائیلؑ کے قول کی شکل میں اترا اور پھر حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے مُنہ میں ڈالا گیا' اور وہاں سے یہ قولِ محمد ﷺ کی صورت میں لوگوں کے سامنے آیا' اس لیے کہ یہ آپؐ ہی کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا' لوگوں نے اُسے صرف آپ ہی کی زبانِ مبارک سے سنا۔ گویا یہ قول' قولِ شاعر نہیں' یہ قولِ کاہن نہیں' یہ قولِ شیطان رجیم نہیں' بلکہ یہ قولِ رسولِ کریم ہے اور رسولِ کریم اوّلاً محمد رسول اللہ ﷺ ہیں' یہ لوگوں کے سامنے ان کے قول کی حیثیت سے آیا۔ پھر ثانیاً یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا قول ہے' اس لیے کہ انہوں نے یہ قول حضورؐ کو پہنچایا۔ اور اس کو آخری درجے تک پہنچانے پر یہ اللہ کا کلام ہے جس کے متعلق تورات میں الفاظ آئے کہ ''میں اس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔''

لوحِ محفوظ اور مصحف میں مطابقت

کلام ہونے کے حوالے سے تیسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ کلام اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات قدیم ہیں۔ اللہ کی ذات کی طرح اس کی صفات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ مادیت اور جسمانیت سے ماوراء ہے۔ یہی معاملہ اللہ کی صفات کا بھی ہے۔ چنانچہ کلام اللہ' جسے حرف وصوت کی محدودیت سے اعلیٰ وارفع خیال کیا جاتا ہے' اسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے حروف واصوات کا جامہ پہنایا اور سید المرسلین ﷺ کے قلبِ مبارک پر بطریقِ تنزیل نازل فرمایا۔ یہی کلام لوحِ محفوظ میں اللہ کے پاس مندرج ہے جسے اُمّ الکتاب یا کتابِ مکنون بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے پاس موجود قرآن مجید یا مصحف کی عبارت بعینہٖ وہی ہے جو لوحِ محفوظ یا اُم الکتاب میں ہے' بالکل اسی طرح جیسے کسی دستاویز کی مصدقہ نقل ہو' جو بغیر کسی شوشے کے فرق کے اصل کے مطابق ہو۔ چنانچہ سورۃ البروج میں فرمایا:

﴿بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ ﴿۲۱﴾ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾﴾

''یہ قرآن نہایت بزرگ و برتر ہے اور یہ لوحِ محفوظ میں ہے۔''

اسی کے متعلق سورۃ الواقعہ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ﴿۷۷﴾ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾

''یہ تو ایک کتاب ہے بڑی کریم' بہت باعزت' اور ایک ایسی کتاب ہے جو چھپی ہوئی ہے۔ جسے چھو ہی نہیں سکتے مگر وہی جو بہت ہی پاک کر دیے گئے ہیں۔''

یعنی ملائکہ مقربین' جن کے بارے میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

﴿فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ ﴿۱۴﴾ بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ﴿۱۵﴾ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ ﴿۱۶﴾﴾ (عبس)

''یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرّم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزّز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔''

درحقیقت یہ کتاب مکنون ان فرشتوں کے پاس ہے' وہ تمہاری رسائی سے بعید و ماوراء ہے۔

یہی بات سورۃ الزخرف میں کہی گئی ہے:

﴿وَاِنَّہٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ ﴿۴﴾﴾

''یہ تو درحقیقت اصل کتاب میں ہمارے پاس محفوظ ہے' بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز۔''

اُمّ کا لفظ جڑ اور بنیاد کے لیے آتا ہے۔ اسی لیے ماں کے لیے بھی عربی میں لفظ ''اُمّ'' استعمال ہوتا ہے' کیونکہ اسی کے بطن سے اولاد کی ولادت ہوتی ہے' وہ گویا کہ بمنزلہ اساس ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی اصل اساس لوحِ محفوظ میں ہے' کتابِ مکنون میں ہے۔ مزید وضاحت کر دی گئی کہ ''لَدَیْنَا'' یعنی وہ اُمّ الکتاب جو ہمارے پاس ہے' اس میں یہ قرآن درج ہے۔ ''لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ'' اس قرآن کی صفات یہ ہیں کہ وہ بہت بلند و بالا اور حکمت والا ہے' مستحکم ہے۔ وہ اللہ کا کلام اور نہایت محفوظ کتاب ہے۔ اسے لوحِ محفوظ کہیں' کتابِ مکنون کہیں' یا اُمّ الکتاب کہیں' اصل کلام وہاں ہے ـــــ اُسی عالمِ غیب میں' اُسی عالمِ امر میں ـــــ جسے سوائے اُن پاکباز فرشتوں کے جن کی رسائی لوحِ محفوظ تک ہو' کوئی مَس نہیں کر سکتا' یعنی اس لوحِ محفوظ کے مضامین پر مطلع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ پر اپنے اس کلام کی تنزیل فرمائی اور اس کی عبارت کو تا قیامِ قیامت مصاحف میں محفوظ فرما دیا اور ناپاک ہاتھوں سے چھونے سے منع فرما دیا۔

کلامِ الٰہی کی تین صورتیں

جب میں نے عرض کیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے کس طرح ہم کلام ہوتا ہے! قرآن مجید میں اس کی تین شکلیں بیان ہوئی ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴿۵۱﴾﴾ (الشوریٰ)

''کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رُوبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے' یا پردے کے پیچھے سے' یا پھر وہ کوئی پیغامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ برتر اور صاحبِ حکمت ہے۔''

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے' اللہ تو ہر شے پر قادر ہے' وہ جو چاہے کر سکتا ہے' اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے' بلکہ کہا کہ انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہ راست کلام کرے' کسی بشر کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے' سوائے تین صورتوں کے' یا تو وحی یعنی مخفی اشارے کے ذریعے سے' یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کسی رسول (رسولِ مَلَک) کو بھیجتا ہے جو وحی کرتا ہے اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہتا ہے۔

اب کلامِ الٰہی کی مذکورہ تین شکلیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے دو کے لیے لفظ وحی آیا ہے۔ درمیان میں ایک شکل ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' بیان ہوئی ہے۔ اس کا تذکرہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ اور یہ تو امرِ واقعہ ہے ہی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر اس صورت میں کلام فرمایا۔

پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے تو وہاں مخاطبہ ہوا۔ یہ مخاطبہ اور مکالمۂ الٰہی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' ہوا تھا' اسی لیے تو وہ آتش شوق بھڑکی تھی کہ ؎

کیا قیامت ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں!

ظاہر ہے کہ جب ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے تو ایک قدم اور باقی ہے کہ مجھے دیدار بھی عطا ہو جائے' لیکن یہ مخاطبہ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مخاطبہ شب معراج میں پردے کے پیچھے سے ہوا۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ (یعنی ذاتِ الٰہی) کا دیدار حاصل ہوا' لیکن میری رائے سلف میں سے ان حضرات کے ساتھ ہے جو اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑی اہمیت کی حامل ہیں' انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لازماً ان چیزوں کے بارے میں استفسار کیا ہوگا' چنانچہ ان کی بات کے متعلق تو ہم یقین کے درجے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ''نُوْرٌ اَنّٰی یُرٰی ؟'' یعنی اللہ تو نور ہے' اسے کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟ (مسلم' کتاب الایمان' عن ابی ذر رضی اللہ عنہ) نور تو دوسری چیزوں کو دیکھنے کا ذریعہ بنتا ہے' نور خود کیسے دیکھا جا سکتا ہے! بہرحال میری رائے ہے کہ یہ گفتگو بھی

مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ تھی۔ وہ وراءِ حجاب گفتگو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر مکالمہ ومخاطبہ میں نصیب ہوئی' اسی وراءِ حجاب ملاقات اور گفتگو سے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں ''عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى'' مشرف فرمایا۔

البتہ وحی براہِ راست بھی ہے' یعنی بغیر فرشتے کے واسطے کے۔ دوسری قسم کی وحی فرشتے کے ذریعے سے ہے اور قرآن مجید سے جس بات کی طرف زیادہ راہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن وحی ہے بواسطہ ''مَلَک''۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ......﴾ (الشعراء:۱۹۴) ''اسے لے کر آپ کے دل پر روحِ امین اترا ہے......'' اور: ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ (البقرۃ:۹۷) ''پس اسے جبریل نے ہی آپ کے قلب پر نازل کیا ہے''۔ البتہ فرشتے کے بغیر وحی' یعنی دل میں کسی بات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست ڈال دیا جانا' یعنی ''الہام'' کا ذکر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور اس کے لیے حدیث میں ''نَفَثَ فِی الرَّوْع'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی کسی نے دل میں کوئی بات ڈال دی' کسی نے پھونک ماردی بغیر اِس کے کہ کوئی آواز سننے میں آئی ہو۔ ایک کیفیت صلصلۃ الجرس کی بھی تھی۔ حضورؐ کو گھنٹیوں کی سی آواز آتی تھی اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر وحی نازل ہو جاتی تھی۔

بہرحال تیقّن کے ساتھ تو مَیں نہیں کہہ سکتا' لیکن میرا گمانِ غالب ہے کہ دوسری قسم کی وحی (بذریعۂ فرشتہ) پر پورے کا پورا قرآن مشتمل ہے۔ اور وحی براہِ راست یعنی ''القاء'' تو درحقیقت وحی خفی ہے' جس کی وضاحت انگریزی کے دو الفاظ کے درمیان فرق سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ ایک لفظ ہے inspiration اور دوسرا revelation' جس کے ساتھ ایک اور لفظ verbal revelation بھی اہم ہے۔ inspiration میں ایک مفہوم' ایک خیال یا تصور انسان کے ذہن وقلب میں آ جاتا ہے' جب کہ revelation باقاعدہ کسی چیز کے کسی پر reveal کیے جانے کو کہتے ہیں۔ اور اس میں بھی عیسائیوں کے ہاں ایک بڑی بحث چل رہی ہے۔ وہ revelation کو مانتے ہیں لیکن verbal revelation کو نہیں مانتے' بلکہ ان کے نزدیک صرف مفہوم ہی انبیاء کے قلوب پر نازل کیا جاتا تھا' جسے وہ اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ جبکہ ہمارے ہاں اس بارے میں مستقل اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ لفظاً بھی وحی ہے اور معناً بھی' لفظاً بھی اللہ کا کلام ہے اور معناً بھی' یعنی یہ verbal revelation ہے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ لاہور ہی میں غالباً ایف سی کالج کے پرنسپل اور علامہ اقبال کے درمیان پیش آیا تھا۔ وہ دونوں کسی دعوت میں اکٹھے تھے کہ ان صاحب نے حضرتِ علامہ سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بھی verbal revelation کے قائل ہیں! اس پر علامہ نے اُس وقت جو جواب دیا وہ اُن کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جی ہاں' میں verbal revelation کو نہ صرف مانتا ہوں' بلکہ مجھے تو اس کا ذاتی تجربہ حاصل ہے۔ چنانچہ خود مجھ پر جب شعر نازل ہوتے ہیں تو وہ الفاظ کے جامے میں ڈھلے ہوئے آتے ہیں' میں کوئی لفظ بدلنا چاہوں تو بھی نہیں بدل سکتا' معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری اپنی تخلیق نہیں ہیں بلکہ مجھ پر نازل کیے جاتے ہیں۔ تو یہ درحقیقت کسی کو جواب دینے کا وہ انداز ہے جس کو عربی میں ''الاجوبة المُسكتة'' یعنی چپ کرا دینے والا جواب کہا جاتا ہے۔ یہ وہ جواب ہے جس کے بعد فریق ثانی کے لیے کسی قیل و

قال کا موقع ہی نہیں رہتا۔

بہر حال کلام الٰہی واقعتاً verbal revelation ہے جس نے اوّلاً قولِ جبرائیل کی شکل اختیار کی۔ حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے قول کی شکل میں نازل ہوا۔ اور پھر زبانِ محمدیؐ سے قولِ محمدیؐ کی شکل میں ادا ہوا۔ تو یہ درحقیقت revelation ہے' inspiration نہیں' اور محض revelation بھی نہیں بلکہ verbal revelation ہے' یعنی معانی' مفہوم اور الفاظ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ بحیثیت مجموعی اللہ کا کلام ہے۔

(۲) قرآن کا رسول اللہ ﷺ پر نزول

قرآن مجید کے محمد رسول اللہ ﷺ پر نزول کے ضمن میں بھی چند باتیں نوٹ کر لیں۔ پہلی بحث تو ''نزول'' کی لغوی بحث سے متعلق ہے۔ یہ لفظ نَزَلَ' یَنْزِلُ ثلاثی مجرد میں بھی آتا ہے۔ تب یہ فعل لازم ہوتا ہے' یعنی ''خود اُترنا''۔ قرآن مجید کے لیے ان معنوں میں یہ لفظ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ (بنی اسرائیل:۱۰۵) ''ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے''۔ یہاں یہ فعل لازم آ رہا ہے' یعنی نازل ہوا۔ عام طور پر فعل لازم کو متعدی بنانے کے لیے اس فعل کے ساتھ کسی صلہ (preposition) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ فعل نَزَلَ ''بِ'' کے ساتھ متعدی ہو کر بھی قرآن مجید میں آیا ہے' بمعنی اُس نے اتارا' جیسے جَاءَ ''وہ آیا'' سے جَاءَ بِهٖ ''وہ لایا''۔ مثلاً: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ......﴾ (الشعراء) یعنی رُوح الامین (جبرائیل) نے اس قرآن کو اُتارا ہے محمد ﷺ کے قلبِ مبارک پر۔

نزولِ قرآن کی دو کیفیتیں: اِنزال اور تنزیل

ثلاثی مزید فیہ کے دو ابواب یعنی بابِ افعال اور باب تفعیل سے یہ لفظ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ دونوں ابواب سے یہ فعل متعدی کے طور پر بمعنی ''اتارنا'' استعمال ہوتا ہے' یعنی اَنْزَلَ' یُنْزِلُ' اِنْزَالاً اور نَزَّلَ' یُنَزِّلُ' تَنْزِيْلًا۔ ان دونوں کے مابین فرق یہ ہے کہ بابِ افعال میں کوئی فعل دفعۃً اور یک دم کر دینے کے معنی ہوتے ہیں جبکہ باب تفعیل میں وہی فعل تدریجاً' اہتمام' توجہ اور محنت کے ساتھ کرنے کے معنی ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے مابین فرق کو ''اِعلام'' اور ''تعلیم'' کے معنی کے فرق کے حوالے سے بہت ہی نمایاں طور پر اور جامعیت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ ''اِعلام'' کے معنی ہیں بتا دینا۔ یعنی آپ نے کوئی چیز پوچھی تو جواب دے دیا گیا۔ چنانچہ ''Information Office'' کو عربی میں ''مکتب الاعلام'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ ''تعلیم'' کے معنی ذہن نشین کرانا اور تھوڑا تھوڑا کر کے بتانا ہے۔ یعنی پہلے ایک بات سمجھا دینا' پھر دوسری بات اس کے بعد بتانا اور اس طرح درجہ بدرجہ مخاطب کے فہم کی سطح بلند سے بلند تر کرنا۔

اگرچہ قرآن مجید کے لیے لفظ ''اِنْزَال'' اور اس سے مشتق مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں' لیکن بکثرت لفظ ''تنزیل'' استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کی اصل شان تنزیلی شان ہے' یعنی یہ کہ اس کو تدریجاً' رفتہ رفتہ' تھوڑا تھوڑا اور نجماً نجماً نازل کیا گیا۔ چنانچہ قرآن مجید کے حضور ﷺ پر نزول کے لیے صحیح تر اور زیادہ مستعمل لفظ قرآن حکیم میں تنزیل ہے' تاہم دو مقامات پر لَيْلَةُ الْقَدْرِ اور لَيْلَةٌ مُّبٰرَكَةٌ کے ساتھ انزال کا لفظ آیا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴿۱﴾﴾ (القدر) اور: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (الدخان:۳) اسی طرح ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) میں بھی لفظ ''انزال'' استعمال ہوا ہے۔ پھر حضور ﷺ پر نزول کے لیے بھی کہیں کہیں لفظ ''انزال'' آیا ہے' اگرچہ اکثر و بیشتر لفظ ''تنزیل'' ہی آیا ہے۔ اس کی تقریباً مجمع علیہ تاویل یہ ہے کہ پورا قرآن دفعۃً لوحِ محفوظ سے سمائے دنیا تک لیلۃ القدر میں نازل کر دیا گیا' جسے ''لیلۂ مبارکہ'' بھی کہا گیا ہے جو کہ رمضان المبارک کی ایک رات ہے۔ لہٰذا جب رمضان مبارک کی لیلۃ القدر یا لیلۂ مبارکہ میں قرآن کے نزول کا ذکر ہوا تو لفظ انزال استعمال ہوا۔ قرآن مجید سمائے دنیا پر ایک ہی بار مکمل طور پر نازل ہونے کے بعد وہاں سے تدریجاً اور تھوڑا تھوڑا کر کے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ لہٰذا حضور ﷺ پر نزول کے لیے اکثر و بیشتر لفظ تنزیل استعمال ہوا ہے۔

لفظ تنزیل کے ضمن میں سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ انتہائی اہم ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے پہلے نازل کی۔''

تورات تختیوں پر لکھی ہوئی' مکتوب شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ وہ چونکہ دفعۃً اور جُملۃً واحدۃً دے دی گئی' اس لیے اِس کے لیے لفظ اِنزال آیا ہے' جبکہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے بائیس تیئیس برس میں نازل ہوا۔ لہٰذا اسی کے ضمن میں لفظ ''نَزَّلَ'' استعمال ہوا۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیت میں ''تنزیل'' اور ''انزال'' ایک دوسرے کے بالکل مقابلے میں آئے ہیں۔ گویا یہاں ''تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا'' (چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں) کا اصول درست بیٹھتا ہے۔

حکمتِ تنزیل

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تنزیل کی حکمت کیا ہے؟ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا اور ایک ہی بار کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ قرآن مجید میں اس کی دو حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔

ایک تو یہ کہ لوگ شاید اس کا تحمل نہ کر سکتے۔ چنانچہ لوگوں کے تحمل کی خاطر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا تا کہ وہ اس کو اچھی طرح سمجھیں' اس پر غور کریں اور اسے حرزِ جان بنائیں اور اسی کے مطابق ان کے ذہن و فکر کی سطح بلند ہو۔ یہ حکمت سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۶ میں بیان کی گئی ہے:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾﴾

''اور ہم نے قرآن کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں منقسم کر دیا تا کہ آپ تھوڑا تھوڑا کر کے اور وقفہ وقفہ سے لوگوں کو سناتے رہیں اور

ہم نے اسے بتدریج اتارا۔‘‘

اس حکمت کو سمجھنے کے لیے بارش کی مثال ملاحظہ کیجیے۔ بارش اگر ایک دم بہت موسلا دھار ہو تو اس میں وہ برکات نہیں ہوتیں جو تھوڑی تھوڑی اور تدریجاً ہونے والی بارش میں ہوتی ہیں۔ بارش اگر تدریجاً ہو تو زمین کے اندر جذب ہوتی چلی جائے گی‘ لیکن اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو اس کا اکثر و بیشتر حصہ بہتا چلا جائے گا۔ یہی معاملہ قرآن مجید کے انزال و تنزیل کا ہے۔ اس میں لوگوں کی مصلحت ہے کہ قرآن ان کے فہم میں‘ ان کے باطن میں‘ ان کی شخصیتوں میں تدریجاً سرایت کرتا چلا جائے۔ سرایت کے حوالے سے مجھے پھر علامہ اقبال کا شعر یاد آیا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

’’(یہ قرآن) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے‘ اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!‘‘

تو جب یہ قرآن کسی کے اندر اس طرح اتر جاتا ہے جیسے بارش کا پانی زمین میں جذب ہوتا ہے تو اس کی شخصیت میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے سرایت کرنے کے لیے اس کا تدریجاً تھوڑا تھوڑا نازل کیا جانا ہی حکمت پر مبنی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات سورۃ الفرقان میں کہی گئی ہے‘ اس لیے کہ وہاں کفارِ مکہ ّ بالخصوص سردارانِ قریش کا باقاعدہ ایک اعتراض نقل ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿٣٣﴾﴾

’’منکرین کہتے ہیں: اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟ ____ ہاں‘ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو ہم اچھی طرح آپ (ﷺ) کے ذہن نشین کرتے رہیں اور اس کو ہم نے بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ) جب کبھی وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے‘ اُس کا ٹھیک جواب بر وقت ہم نے آپ کو دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔‘‘

اعتراض یہ تھا کہ یہ پورا قرآن یک دم‘ یک بارگی کیوں نہیں نازل کر دیا گیا؟ اس اعتراض میں جو وزن تھا‘ پہلے اس کو سمجھ لیجیے۔ انہوں نے جو بات کی درحقیقت اس سے مراد یہ تھی کہ جیسے ہمارا ایک شاعر دفعۃً پورا دیوان لوگوں کو فراہم نہیں کر دیتا‘ بلکہ وہ ایک غزل کہتا ہے‘ قصیدہ کہتا ہے‘ پھر مزید محنت کرتا ہے‘ پھر کچھ اور طبع آزمائی کرتا ہے‘ پھر کچھ اور کہتا ہے‘ اس طرح تدریجاً دیوان بن جاتا ہے‘ اسی طریقے سے محمد (ﷺ) کر رہے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو پورے کا پورا یک دم نازل ہو سکتا تھا۔ یہ تو درحقیقت انسان کی کیفیت ہے کہ پوری کتاب دفعۃً produce نہیں کر دیتا۔ پورا دیوان تو کسی شاعر نے ایک دن کے اندر نہیں کہا بلکہ اسے وقت لگتا ہے‘ وہ مسلسل محنت کرتا ہے‘ کچھ تکلف بھی کرتا ہے‘ کبھی آمد بھی ہو جاتی ہے‘ لیکن وہ کلام دیوان کی شکل میں تدریجاً مدوّن ہوتا ہے۔ تو یہ تو اسی طرح کی چیز ہے۔ ﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ﴾ ’’کیوں نہیں یہ قرآن اس پر یک دم نازل ہو گیا؟‘‘

اب اس کا جواب دیا گیا: ﴿كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ ’’یہ اس لیے کیا ہے تاکہ اے نبی ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو تثبیت (جماؤ) عطا کریں‘‘۔ یعنی وہ بات جو عام انسانوں کی مصلحت میں ہے وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی مصلحت پر مبنی ہے کہ آپ کے لیے بھی شاید قرآن مجید کا یک بارگی تحمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ﴾ ’’اگر ہم پورے کے پورے قرآن کو دفعۃً کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا‘‘۔ (نوٹ کیجیے کہ یہاں لفظ ’’انزال‘‘ آیا ہے)۔ معلوم ہوا کہ قلبِ محمدیؐ کو جماؤ اور ٹھہراؤ عطا کرنے کے لیے اسے بتدریج نازل کیا گیا ہے: ﴿وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ ’’اور ہم نے اس کو بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ہے‘‘۔ ’’رتل‘‘ چھوٹے پیمانے کو‘ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں۔

اگلی آیت میں جو ارشاد ہوا اس کے دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اے نبی! جو اعتراض بھی یہ ہم پر کریں گے ہم اس کا بہترین جواب آپ کو عطا کر دیں گے۔ لیکن دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ ایک مسلسل کشاکش ہے جو آپ کے اور مشرکین عرب کے درمیان چل رہی ہے۔ آج وہ ایک بات کہتے ہیں‘ اگر اسی وقت اس کا جواب دیا جائے تو وہ درحقیقت آپ کی دعوت کے لیے موزوں ہے۔ اگر یہ سارے کا سارا کلامِ الٰہی ایک ہی مرتبہ نازل ہو جاتا تو حالات کے ساتھ اس کی مطابقت اور ان کی طرف سے پیش ہونے والے اعتراضات کا بروقت جواب نہ ہوتا اور اس کے اندر جو اثر انداز ہونے کی کیفیت ہے وہ حاصل نہ ہوتی۔ اس تدریج میں اپنی جگہ موزونیت ہے اور اس کی اپنی تاثیر ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کو تدریجاً نازل کیا گیا۔

قرآن کریم کا زمانۂ نزول اور ارضِ نزول

رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے نزول کے ضمن میں اب دو چھوٹی چھوٹی چیزیں اور نوٹ کر لیجیے۔ یہ صرف معلومات کے ضمن میں ہیں۔ اس کا زمانۂ نزول کیا ہے؟ ہم جس حساب (سن عیسوی) سے بات کرنے کے عادی ہیں‘ اسی حساب سے ہمارے ذہن کا صغریٰ کبریٰ بنا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے نوٹ کر لیجیے کہ قرآن حکیم کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک ۲۲ برس پر مشتمل ہے۔ قمری حساب سے یہ ۲۳ برس بنیں گے۔ ۴۰ عام الفیل سے شروع کریں تو ۱۲ سال قبل ہجرت اور ۱۱ ہجری سال مل کر ۲۳ سال قمری بنیں گے‘ جن کے دوران یہ قرآن بطرزِ تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ صحیح احادیث میں یہ شہادت موجود ہے کہ پہلے سورۃ العلق کی پانچ آیات نازل ہوئیں‘ پھر تین سال کا وقفہ آیا۔ سورۃ العلق کی یہ پانچ آیات بھی چونکہ قرآن مجید کا حصہ ہیں‘ لہٰذا صحیح قول یہی ہے کہ قرآن حکیم کا زمانۂ نزول ۲۳ قمری یا ۲۲ شمسی سال ہے۔

اب یہ کہ نزول کی جگہ کون سی ہے؟ اس ضمن میں صرف ایک لفظ نوٹ کر لیجیے کہ تقریباً پورے کا پورا قرآن ’’حجاز‘‘ میں نازل ہوا۔ اس لیے کہ آغازِ وحی کے بعد حضور اکرم ﷺ کا کوئی سفر حجاز سے باہر ثابت نہیں ہے۔ آغازِ وحی سے قبل آپؐ نے متعدد سفر کیے ہیں۔ آپؐ شام کا سفر کرتے تھے‘ یقیناً یمن بھی آپؐ جاتے ہوں گے۔ اس لیے کہ الفاظِ قرآنی ’’رِحْلَةَ الشِّتَآءِ

وَالصَّيْفِ '' کی رو سے قریش کے سالانہ دو سفر ہوتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں شمال کی طرف جاتے تھے' اس لیے کہ فلسطین کا علاقہ نسبتاً ٹھنڈا ہے' اور سردیوں کے موسم میں وہ جنوب کی طرف (یمن) جاتے تھے' اس لیے کہ وہ گرم علاقہ ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے بھی تجارتی سفر کیے ہیں۔ بعض محققین نے تو یہ امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ آپؐ نے اُس زمانے میں کوئی بحری سفر بھی کیا اور گلف کو عبور کر کے مکران کے ساحل پر کسی جگہ آپؐ تشریف لائے۔ (واللہ اعلم!) یہ بات میں نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ایک لیکچر میں سنی تھی جو انہوں نے حیدر آباد (سندھ) میں دیا تھا' لیکن بعد میں اس پر جرح ہوئی کہ یہ بہت ہی کمزور قول ہے اور اس کے لیے کوئی سند موجود نہیں ہے۔ البتہ ''الخبر'' جہاں آج آباد ہے وہاں پر تو ہر سال ایک بہت بڑا تجارتی میلہ لگتا تھا اور حضور ﷺ کا وہاں تک آنا ثابت ہے۔ بہر حال آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ آغازِ وحی کے بعد دس سال تک تو مکہ مکرمہ میں رہے' اس کے بعد طائف کا سفر کیا ہے۔ پھر آس پاس ''عکاظ'' کا میلہ لگتا تھا اور منڈیاں لگتی تھیں' ان میں آپ نے سفر کیے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی ہے۔ اس کے بعد سب جنگیں حجاز کے علاقے ہی میں ہوئیں' سوائے غزوۂ تبوک کے۔ لیکن تبوک بھی اصل میں حجاز ہی کا شمالی سرا ہے۔ اس اعتبار سے حجاز ہی کا علاقہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ تاہم دو آیتیں اس اعتبار سے مستثنیٰ قرار دی جاسکتی ہیں کہ وہ زمین پر نہیں بلکہ آسمان پر نازل ہوئیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو تین تحفے عطا کیے' ان میں نماز کی فرضیت اور دو آیاتِ قرآنی شامل ہیں۔ یہ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات ہیں جو عرش کے دو خزانے ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں عطا ہوئے۔ تو یہ دو آیتیں مستثنیٰ ہیں کہ یہ زمین پر نازل نہیں ہوئیں بلکہ آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ پر دی گئیں اور خود آپؐ ساتویں آسمان پر تھے' جبکہ باقی پورا قرآن آسمان سے زمین پر نازل ہوا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے حجاز کا علاقہ مہبط وحی ہے۔

(۳) قرآن حکیم کی محفوظیت

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے بارے میں تین بنیادی اور اعتقادی چیزیں ہیں: اوّل' یہ اللہ کا کلام ہے۔ دوم' یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ سوم' یہ من و عن کل کا کل محفوظ ہے۔ اس میں نہ کوئی کمی ہوئی ہے نہ کوئی بیشی ہوئی ہے۔ نہ کمی ہو سکتی ہے نہ بیشی ہو سکتی ہے۔ نہ کوئی تحریف ہوئی ہے نہ کوئی تبدیلی۔ یہ گویا ہمارے عقیدے کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس میں کچھ اشتباہ اہل تشیع نے پیدا کیا ہے' لیکن ان کی بات بھی مَیں کچھ یقین کے ساتھ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ قول بھی سامنے آتا ہے کہ ''ہم اس قرآن کو محفوظ مانتے ہیں''۔ البتہ عوام میں جو چیزیں مشہور ہیں کہ قرآن سے فلاں آیات نکال دی گئیں' فلاں سورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح اور شان میں تھی' وہ اس میں سے نکال دی گئی وغیرہ' ان کے بارے میں مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ان میں سے عوام کالانعام کی باتیں ہیں یا ان کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن یہ کہ بہر حال اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ قرآن حکیم محفوظ ہے اور کل کا کل من و عن ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کے لیے خود قرآن مجید سے جو گواہی ملتی ہے وہ سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سورۃ القیامہ میں آئی ہے۔ فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ⑯ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ⑰﴾ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ازراہِ شفقت فرمایا: ''آپ اس قرآن کو یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔ آپؐ مشقت نہ جھیلیں' یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اسے آپؐ کے سینہ مبارک کے اندر جمع کر دیں گے اور اس کی ترتیب قائم کر دیں گے' اس کو پڑھوا دیں گے۔ جس ترتیب سے یہ نازل ہو رہا ہے اس کی زیادہ فکر نہ کیجیے۔ اصل ترتیب جس میں اس کا مرتّب کیا جانا ہمارے پیش نظر ہے' جو ترتیب لوحِ محفوظ کی ہے اسی ترتیب سے ہم پڑھوا دیں گے۔ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ⑲﴾ پھر اگر آپ کو کسی چیز میں ابہام محسوس ہو اور وضاحت کی ضرورت ہو تو اس کی توضیح اور تدوین بھی ہمارے ذمہّ ہے۔

یہ ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ اگر ان آیات کو کوئی شخص قرآن مجید کی آیات مانتا ہے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید پورے کا پورا جمع ہے' اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہوا۔ صراحت کے ساتھ یہ بات سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں مذکور ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨﴾ ''ہم نے ہی اس ''الذکر'' کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ یہ گویا ہمیشہ ہمیش کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے خوبصورت شعر میں بیان کیا ہے: ؎

حرفِ اُو را ریب نے ' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

''اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ ردو بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔''

اس شعر میں تین اعتبارات سے نفی کی گئی ہے: (۱) قرآن کے حروف میں یعنی اس کے متن میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ مِن و عَن محفوظ ہے۔ (۲) اس میں کہیں کوئی تحریف ہوئی ہو' کہیں تبدیلی کی گئی ہو' قطعاً ایسا نہیں۔ (۳) کیا اس کی آیات کی الٹ سلٹ تاویل بھی کی جاسکتی ہے؟ نہیں! یہ آخری بات بظاہر بہت بڑا دعویٰ معلوم ہوتا ہے' اس لیے کہ تاویل کے اعتبار سے قرآن مجید کے معنی میں لوگوں نے تحریف کی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر کہیں معنوی تحریف کی کوشش بھی ہوئی ہے تو وہ قطعاً درجہ استناد کو نہیں پہنچ سکی' اسے کبھی بھی استقلال اور دوام حاصل نہیں ہوسکا' قرآن نے خود اس کو ردّ کر دیا۔ جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے' ایسی تاویلات بھی اُمت کی تاریخ کے دوران کہیں بھی جڑ نہیں پکڑ سکی ہیں اور اسی طرح نکال دی گئی ہیں۔ اس بات کی سند بھی قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ حٰم السجدۃ کی آیت ۴۲ میں ہے: ﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ㊷﴾ ''باطل اس (قرآن) پر حملہ آور نہیں ہوسکتا' نہ سامنے سے نہ پیچھے سے' یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔''

یہ بات سرے سے خارج از امکان ہے کہ اس قرآن میں کوئی تحریف ہو جائے' اس کا کوئی حصہ نکال دیا جائے' اس میں کوئی غیر قرآن شامل کر دیا جائے —— سورۃ الحاقہّ کی یہ آیات ملاحظہ کیجیے جہاں گویا اس امکان کی نفی میں مبالغے کا انداز ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾﴾

’’(کوئی اور تو اس میں اضافہ کیا کرے گا) اگر یہ (ہمارے نبی محمدﷺ) خود بھی (بفرضِ محال) اپنی طرف سے کچھ گھڑ کر اس میں شامل کر دیں تو ہم انہیں داہنے ہاتھ سے پکڑیں گے اور ان کی شہ رگ کاٹ دیں گے۔ پھر تم میں سے کوئی (بڑے سے بڑا محافظ ان کا حامی و مددگار) نہیں ہوگا کہ جو انہیں ہماری پکڑ سے بچا سکے۔‘‘

یہاں تو محمد رسول اللہﷺ کے لیے بھی اس شدت کے ساتھ نفی کر دی گئی۔ کفار و مشرکین کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ آپ اس قرآن میں کچھ نرمی اور لچک دکھائیں‘ یہ تو بہت rigid ہے‘ بہت ہی uncompromising ہے‘ بہر حال دنیا میں معاملات ’’کچھ لو کچھ دو‘‘ (give and take) سے طے ہوتے ہیں‘ لہٰذا کچھ آپ نرم پڑیں کچھ ہم نرم پڑتے ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿۹﴾﴾ (القلم) ’’وہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے‘‘۔ اور سورۂ یونس میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾﴾

’’جب انہیں ہماری آیات بینات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے‘ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کیجیے۔ (اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے خیال اور ارادے سے اس کے اندر کچھ تبدیلی کر سکوں۔ میں تو خود پابند ہوں اس کا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔‘‘

یہ ہے قرآن مجید کی شان کہ یہ لفظاً‘ معناً‘ متناً کلی طور پر محفوظ ہے۔

باب دوم

چند متفرق مباحث

قرآن مجید کی زبان

اب آیئے اگلی بحث کی طرف کہ قرآن مجید کی زبان کیا ہے اور اس زبان کی شان کیا ہے۔ یہ بات بھی قرآن مجید نے بہت تکرار و اعادہ کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ قرآن عربی مبین میں ہے‘ یعنی شستہ‘ صاف‘ سلیس‘ کھلی اور واضح عربی میں ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اس نے جن حروف و اصوات کا جامہ پہنا‘ وہ حروف و اصوات لوحِ محفوظ میں ہیں۔ اس کے بعد وہ کلامِ الٰہی‘ قولِ جبرائیلؑ اور قولِ محمدﷺ بن کر نازل ہوا اور لوگوں کے سامنے آیا۔ چنانچہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں ارشاد ہوا:

﴿حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾﴾

’’ح‘ م۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی! ہم نے اسے قرآنِ عربی بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔‘‘

قرآن کی مخاطب اوّل قوم حجاز میں آباد تھی۔ اس سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں بنایا۔ اس نے اوّلاً حروف و اصوات کا جامہ پہنا ہے‘ پھر تمہاری زبان عربی کا جامہ پہن کر تمہارے سامنے نازل کیا گیا ہے تاکہ تم اس کو سمجھ سکو۔

یہی بات سورۂ یوسف کے شروع میں کہی گئی ہے:

﴿الٓرٰ ۣ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾﴾

’’ا‘ ل‘ ر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم سمجھ سکو۔‘‘

سورۃ الشعراء میں فرمایا:

﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾﴾

’’صاف صاف عربی زبان میں (نازل کیا گیا)۔‘‘

سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۲۸﴾﴾

''ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے' جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے' تاکہ وہ بچ کر چلیں۔''

اس میں کہیں کجی نہیں' کہیں کوئی اینچ پینچ نہیں' اس کی زبان بہت سلیس' شستہ اور بالکل واضح زبان ہے۔ اس میں کہیں پہیلیاں بجھوانے کا انداز نہیں ہے۔

اب نوٹ کیجیے کہ قرآن کی عربی کون سی عربی ہے؟ اس لیے کہ عربی زبان ایک ہے مگر اس کے dialects اور اس کی بولیاں بے شمار ہیں۔ خود جزیرہ نمائے عرب میں متعدد بولیاں تھیں' تلفظ اور لہجے مختلف تھے۔ بعض الفاظ کسی خاص علاقے میں مستعمل تھے اور دوسرے علاقے کے لوگ ان الفاظ کو جانتے ہی نہیں تھے۔ آج بھی کہنے کو تو مصر' لیبیا' الجزائر' موریطانیہ اور حجاز کی زبان عربی ہے' لیکن اُن کے ہاں جو فصیح عربی کہلاتی ہے وہ تو ایک ہی ہے۔ وہ درحقیقت ایک اس لیے ہے کہ قرآن مجید نے اسے دوام عطا کیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا عربی زبان پر عظیم احسان ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں دوسری کوئی زبان بھی ایسی نہیں ہے جو چودہ سو برس سے ایک ہی شان اور ایک ہی کیفیت کے ساتھ باقی ہو۔ اردو زبان ہی کو دیکھئے۔ ۱۰۰-۲۰۰ برس پرانی اردو آج ہمارے لیے ناقابل فہم ہے۔ دکن کی اردو ہمیں سمجھ میں نہیں آسکتی' اس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح فارسی زبان کا معاملہ ہے۔ ایک وہ فارسی تھی جو عربوں کی آمد اور اسلام کے ظہور کے وقت تھی۔ عربوں کے ہاتھوں ایران فتح ہوا تو رفتہ رفتہ اس فارسی کا رنگ بدلتا گیا۔ اب اس کو پھر بدلا گیا ہے اور اس میں سے عربی الفاظ نکال کر اس کے لہجے بھی بدل دیے گئے ہیں۔ ایک فارسی وہ ہے جو افغانستان میں بولی جاتی ہے' وہ ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ اس لیے کہ جو فارسی یہاں پڑھائی جاتی تھی وہ یہی فارسی تھی۔ آج جو فارسی ایران میں پڑھائی جارہی ہے وہ بہت مختلف ہے' اپنے لہجے میں بھی اور اپنے الفاظ کے اعتبار سے بھی۔ لیکن عربی ''فصیح زبان'' ایک ہے۔ یہ اصل میں حجاز کے بدوؤں کی زبان تھی۔ پورا قرآن حکیم حجاز میں نازل ہوا۔ حجاز میں بادیہ نشین تھے۔ عربوں کا کہنا تھا کہ خالص زبان بادیہ نشینوں کی ہے' شہر والوں کی نہیں۔ جبکہ مکہ شہر تھا اور وہاں باہر سے بھی لوگ آتے رہتے تھے۔ قافلے آرہے ہیں' جارہے ہیں' ٹھہر رہے ہیں۔ جہاں اس طرح کی آمد ورفت ہو وہاں زبان خالص نہیں رہتی اور اس میں غیر زبانوں کے الفاظ شامل ہو کر مستعمل ہو جاتے ہیں اور بول چال میں آجاتے ہیں۔ خاص اسی وجہ سے مکہ کے شرفا اپنے بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد بادیہ نشینوں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ایک تو دودھ پلانے کا معاملہ تھا۔ دوسرا یہ کہ ان کی زبان صاف رہے' خالص عربی زبان رہے اور وہ ہر ملاوٹ سے پاک رہے۔ تو قرآن مجید حجاز کے بادیہ نشینوں کی زبان میں نازل ہوا۔

البتہ یہ ثابت ہے کہ قرآن مجید میں کچھ الفاظ دوسرے قبائل اور دوسرے علاقوں کی زبانوں کے بھی آئے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ غیر عربی الفاظ بھی قرآن مجید میں آئے ہیں جو معرب ہو گئے ہیں۔ ابراہیم' اسمٰعیل' اسرائیل' اسحاق' یہ تمام نام درحقیقت عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔ لفظ ''اِیل'' عبرانی زبان میں اللہ کے لیے آتا ہے اور یہ لفظ ہمارے ہاں قرآن مجید کے ذریعے آیا ہے۔ اسی طریقے سے ''سِجّیل'' کا لفظ فارسی سے آیا ہے۔ صحرا میں کہیں بارش کے نتیجے میں ہلکی سی پھوار پڑی ہو تو بارش کے قطروں کے ساتھ ریت کے چھوٹے چھوٹے دانے بن جاتے ہیں اور پھر تیز دھوپ پڑنے پر وہ ایسے پک جاتے ہیں جیسے بھٹے میں اینٹوں کو پکا دیا گیا ہو۔ یہ کنکر ''سجّیل'' کہلاتے ہیں جو ''سنگ گل'' کا معرب ہے۔ باقی اکثر و بیشتر قرآن مجید کی زبان جس میں یہ نازل ہوا' وہ حجاز کے علاقے کے بادیہ نشینوں کی عربی ہے' جس میں فصاحت و بلاغت نقطۂ عروج پر ہے اور اس کا لوہا مانا گیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک صوتی آہنگ ہے۔ اس کا ایک ''ملکوتی غنا'' (Divine Music) ہے' اس کی ایک عذوبت اور مٹھاس ہے۔ یہ دونوں چیزیں عرب میں پورے طور پر تسلیم کی گئی ہیں اور لوگوں پر سب سے زیادہ مرعوبیت قرآن حکیم کی فصاحت' بلاغت اور عذوبت ہی سے طاری ہوئی۔ ان کی اپنی زبان میں ہونے کے اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ قرآن کے بہترین ناقد بھی وہی ہو سکتے تھے۔ واضح رہے کہ ادب میں ''تنقید'' دونوں پہلوؤں کو محیط ہوتی ہے۔ کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا' اسے جانچنا' پرکھنا۔ اس میں کوئی خامی ہو تو اس کو نمایاں کرنا' اور اگر کوئی محاسن ہوں تو ان کو سمجھنا اور بیان کرنا۔ اس اعتبار سے اس کی فصاحت و بلاغت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان آج بھی مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں اور بولیوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایک علاقے کی عامی (colloquial) زبان دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ خود نزولِ قرآن کے زمانے میں نجد کے لوگوں کی زبان حجاز کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے کہ نجد سے کچھ لوگ آئے اور وہ حضور ﷺ سے گفتگو کر رہے تھے جو بڑی مشکل سے سمجھ میں آرہی تھی اور لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ آج بھی نجد کے لوگ جو گفتگو کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ عربی سے واقفیت ہونے کے باوجود ان کی عربی ہماری سمجھ میں نہیں آتی' ان کا لب و لہجہ بالکل مختلف ہے۔ قرآن حکیم کی زبان حجاز کے بادیہ نشینوں کی ہے۔ لہٰذا اگر تحقیق و تدبر قرآن کا حق ادا کرنا ہو تو جاہلیت کی شاعری پڑھنا ضروری ہے۔ ائمہ لغت نے ایک ایک لفظ کی تحقیق کر کے اور بڑی گہرائیوں میں اتر کر جاہلی شاعری کے حوالے سے جتنے بھی استشہاد ہو سکتے تھے ان کو کھنگال کر قرآن میں مستعمل الفاظ کے مادوں کے مفہوم معیّن کر دیے ہیں۔ ایک عام قاری کو' جو قرآن سے تذکر کرنا چاہے' صرف ہدایت حاصل کرنا چاہے' اس کھکھیڑ میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تدبر قرآن کے لیے جب تحقیق کی جاتی ہے تو جب تک کسی ایک لفظ کی اصل پوری طرح معلوم نہ کی جائے اور اس کے بال کی کھال نہ اتار لی جائے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے شعر جاہلی کی زبان کو سمجھنا تدبر قرآن کے لیے یقیناً ضروری ہے۔

قرآن کے اَسماء وصفات

اگلی بحث قرآن حکیم کے اسماء وصفات کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں قرآن حکیم کے اسماء وصفات قرآن حکیم ہی سے لے کر پچپن (۵۵) ناموں کی فہرست مرتب کی ہے۔ میں نے جب اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کامل نہیں ہے' مثلاً لفظ ''برہان'' ان کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ درحقیقت قرآن

مجید کی صفات‘ اس کی شانوں اور اس کی تاثیر کے لیے مختلف الفاظ کو جمع کیا جائے تو ۵۵ ہی نہیں اس سے زیادہ الفاظ بن جائیں گے‘ لیکن میں نے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ ہیں جو مفرد کی حیثیت سے اور معرفہ کی شکل میں قرآن مجید میں قرآن کے لیے وارد ہوئے ہیں‘ جبکہ کچھ صفات ہیں جو موصوف کے ساتھ آ رہی ہیں۔ مثلاً ’’قرآن مجید‘‘ میں ’’مجید‘‘ قرآن کا نام نہیں ہے‘ درحقیقت صفت ہے۔ اسی طرح ’’القرآن المجید‘‘ میں اگرچہ ’’الف لام‘‘ کے ساتھ ’’المجید‘‘ آتا ہے‘ لیکن یہ چونکہ موصوف کے ساتھ مل کر آیا ہے لہٰذا یہ بھی صفت ہے۔

قرآن مجید کے لیے جو الفاظ بطور اسم آئے ہیں‘ ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جن کے ساتھ لام تعریف لگا ہوا ہے۔ قرآن کے لیے اہم ترین نام جو اس کا امتیازی اور اختصاصی (The exclusive) نام ہے ’’القرآن‘‘ ہے۔ (میں بعد میں اس کی وضاحت کروں گا) اس کے بعد کثرت سے استعمال ہونے والا نام ’’الکتاب‘‘ ہے۔ قرآن کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والا اہم ترین نام ’’الذکر‘‘ ہے۔ قرآن مجید کی افادیت کے لیے سب سے زیادہ جامع نام ’’الھدیٰ‘‘ ہے۔ قرآن مجید کی نوعیت اور حیثیت کے اعتبار سے اہم ترین نام ’’النور‘‘ ہے۔ قرآن مجید کی ایک انتہائی اہم شان جو ایک لفظ کے طور پر آئی ہے ’’الفرقان‘‘ ہے یعنی (حق و باطل میں) فرق کر دینے والی شے‘ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دینے والی شے۔ قرآن کا ایک نام ’’الوحی‘‘ بھی آیا ہے: ﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اُنۡذِرُكُمۡ بِالۡوَحۡیِ﴾ (الانبیاء:۴۵)۔ اسی طرح ’’کلام اللہ‘‘ کا لفظ بھی خود قرآن میں آیا ہے: ﴿حَتّٰی یَسۡمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبہ:۶) چونکہ یہاں کلام مضاف واقع ہوا ہے‘ لہٰذا یہ بھی معرفہ بن گیا۔ میرے نزدیک جنہیں ہم قرآن کے نام قرار دیں‘ وہ تو یہی بنتے ہیں۔ اگرچہ‘ جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ جو لفظ بھی قرآن کے لیے صفت کے طور پر یا اس کی شان کو بیان کرنے کے لیے قرآن میں آ گیا ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کو فہرست میں شامل کر کے ۵۵ نام گنوائے ہیں‘ لیکن یہ فہرست بھی مکمل نہیں۔

قرآن کریم کی مختلف شانوں اور صفات کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں: (۱) كَرِیۡمٌ: ﴿اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِیۡمٌ ﴿۷۷﴾﴾ (الواقعہ) (۲) اَلۡحَكِیۡمُ: ﴿یٰسٓ ﴿۱﴾ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَكِیۡمِ ﴿۲﴾﴾ (یٰسٓ) (۳) الۡعَظِیۡم: ﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ﴿۸۷﴾﴾ (الحجر) (۴) مَجِیۡدٌ اور الۡمَجِیۡدُ: ﴿بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۲۱﴾﴾ (البروج) اور ﴿قٓ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ ﴿۱﴾﴾ (قٓ) (۵) اَلۡمُبِیۡنُ: ﴿حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالۡكِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾﴾ (الزخرف) (۶) رَحۡمَةٌ: ﴿هُدًی وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾﴾ (یونس) (۷) عَلِیٌّ: ﴿وَاِنَّهٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡكِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَكِیۡمٌ ﴿۴﴾﴾ (الزخرف) (۸) بَصَآئِرُ: ﴿قَدۡ جَآءَكُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ﴾ (الانعام:۱۰۴) (۹‘۱۰) بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا: (حٰمٓ السجدۃ:۴) [اگرچہ یہ الفاظ انبیاء کے لیے آتے ہیں لیکن یہاں خود قرآن کے لیے بھی آئے ہیں۔ قرآن اپنی ذات میں فی نفسہٖ بشیر بھی ہے‘ نذیر بھی ہے] (۱۱) بُشۡرٰی: ﴿وَبُشۡرٰی لِلۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ (النحل:۸۹‘۱۰۲) (۱۲) عَزِیۡزٌ: ﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیۡزٌ ﴿۴۱﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ) (۱۳) بَلٰغٌ: ﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابراہیم:۵۲) (۱۴) بَیَانٌ: ﴿هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۳۸) (۱۵) مَوۡعِظَةٌ (۱۶) شِفَآءٌ: ﴿قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ﴾ (یونس:۵۷) (۱۷) اَحۡسَنُ الۡقَصَصِ: ﴿نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ﴾ (یوسف:۳) (۱۸) اَحۡسَنُ الۡحَدِیۡثِ (۱۹) مُتَشَابِه (۲۰) مَثَانِیَ: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ﴾ (الزمر:۲۳) (۲۱) مُبٰرَكٌ: ﴿كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡكَ مُبٰرَكٌ﴾ (صٓ:۲۹) (۲۲) مُصَدِّقٌ (۲۳) مُهَیۡمِنٌ: ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ﴾ (المائدۃ:۴۸) (۲۴) قَیِّم: ﴿قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡهُ﴾ (الکہف:۲)۔ یہ مختلف الفاظ ہیں جو قرآن حکیم کی مختلف شانوں کے لیے آئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں‘ جو اس کی مختلف شانوں کو ظاہر کرتے ہیں‘ اسی طرح حضور ﷺ کے ناموں کی فہرست بھی آپ نے پڑھی ہو گی۔ آپ ﷺ کی مختلف شانیں ہیں‘ اس کے اعتبار سے آپ بشیر بھی ہیں‘ نذیر بھی ہیں‘ ہادی بھی ہیں‘ معلم بھی ہیں۔ قرآن مجید کے بھی مختلف اسماء وصفات ہیں۔

لفظ ’’قرآن‘‘ کی لغوی بحث:

قرآن مجید کے ناموں میں سب سے اہم نام ’’القرآن‘‘ ہے‘ جس کے لیے میں نے لفظ exclusive استعمال کیا تھا کہ یہ کسی اور کتاب کے لیے استعمال نہیں ہوا‘ ورنہ تورات کتاب بھی ہے‘ ہدایت بھی تھی‘ اور اس کے لیے لفظ نور بھی آیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِیۡهَا هُدًی وَّنُوۡرٌ﴾ (المائدۃ:۴۴) ’’ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت بھی ہے اور نور بھی‘‘۔ خود قرآن مجید ہدایت بھی ہے‘ نور بھی ہے‘ رحمت بھی ہے۔ تو بقیہ تمام اوصاف تو مشترک ہیں‘ لیکن القرآن کے لفظ کا اطلاق کتب ساویہ میں سے کسی اور کتاب پر نہیں ہوتا۔ یہ امتیازی‘ اختصاصی اور استثنائی نام صرف قرآن مجید کے لیے ہے۔ اسی لیے ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم علَم ہے‘ اور اسم جامد ہے‘ اسم مشتق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام ’’اللہ‘‘ کے بارے میں بھی ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم ذات ہے‘ اسم علَم ہے‘ اسم جامد ہے‘ مشتق نہیں ہے‘ یہ کسی اور مادے سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ جبکہ ایک رائے یہ ہے کہ یہ بھی صفت ہے‘ جیسے اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفاتی نام ہیں۔ جیسے ’’علیم‘‘ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور ’’العلیم‘‘ نام ہے‘ رحیم صفت ہے اور ’’الرحیم‘‘ نام ہے‘ اسی طرح الٰہ پر ’’ال‘‘ داخل ہوا تو ’’الالٰہ‘‘ بن گیا اور دو لام مدغم ہونے سے یہ ’’اللہ‘‘ بن گیا۔ یہ دوسری رائے ہے۔ جو معاملہ لفظ اللہ کے بارے میں اختلافی ہے بعینہٖ وہی اختلاف لفظ قرآن کے بارے میں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم جامد اور اسم علم ہے‘ اس کا کوئی اور مادہ نہیں ہے‘ جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ اسم مشتق ہے۔ لیکن پھر اس کے مادے کی تعیین میں اختلاف ہے۔

ایک رائے کے مطابق اس کا مادہ ’’قرن‘‘ ہے‘ یعنی قرآن میں جو ’’ن‘‘ ہے وہ بھی حرفِ اصلی ہے۔ دوسری رائے کے مطابق اس کا مادہ ’’ق ر ء‘‘ ہے۔ یہ گویا مہموز ہے۔ میں یہ باتیں اہل علم کی دلچسپی کے لیے عرض کر رہا ہوں۔ جن لوگوں نے اس کا مادہ ’’قرن‘‘ مانا ہے‘ اُن کی بھی دو آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ جیسے عرب کہتے ہیں ’’قَرَنَ الشَّیۡءَ بِالشَّیۡءِ‘‘ (کوئی شے کسی دوسرے کے ساتھ شامل کر دی گئی) تو اس سے قرآن بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات‘ اللہ تعالیٰ کا کلام جو وقتاً فوقتاً نازل ہوا‘ اس کو جب جمع کر دیا گیا تو وہ ’’قرآن‘‘ بن گیا۔ امام اشعری بھی اس رائے کے قائل ہیں۔ جبکہ ایک رائے امام فراء کی ہے‘ جو لغت کے بہت بڑے امام ہیں‘ کہ یہ قرینہ اور قرائن سے بنا ہے۔ قرائن کچھ چیزوں کے آثار ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات

چونکہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں' جیسا کہ سورۃ الزمر میں قرآن مجید کی یہ صفت وارد ہوئی ہے ''کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ''۔اس اعتبار سے آپس میں یہ آیات قرناء ہیں۔ چنانچہ قرینہ سے قرآن بن گیا ہے۔

جولوگ کہتے ہیں کہ اس کا مادہ ق ر ء ہے وہ قرآن کو مصدر مانتے ہیں۔قَرَأَ' یَقْرَأُ' قَرْأً' وَقِرَاءَۃً وَقُرْآنًا۔ یہ اگرچہ مصدر کا معروف وزن نہیں ہے لیکن اس کی مثالیں عربی میں موجود ہیں۔جیسے رَجَحَ سے رُجحان اور غَفَرَ سے غُفران۔ان کے مادہ میں ''ن'' شامل نہیں ہے۔تو جیسے غفران اور رجحان مصدر ہیں' ایسے ہی قرأ سے مصدر قرآن ہے' یعنی پڑھنا۔اور مصدر بسا اوقات مفعول کا مفہوم دیتا ہے۔تو قرآن کا مفہوم ہوگا پڑھی جانے والی شے' پڑھی گئی شے۔''قَرَأَ'' میں جمع کرنے کا مفہوم بھی ہے۔عرب کہتے ہیں: قرأتُ المَاءَ فِی الْحَوْضِ ''میں نے حوض کے اندر پانی جمع کرلیا''۔اسی سے قریہ بنا ہے' یعنی ایسی جگہ جہاں لوگ جمع ہو جائیں۔گویا قرآن کا مطلب ہے اللہ کا کلام جہاں جمع کر دیا گیا۔تمام آیات جب جمع کر لی گئیں تو یہ قرآن بن گیا۔جیسے قریہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ آباد ہو جائیں' مل جل کر رہ رہے ہوں۔تو جمع کرنے کا مفہوم قَرءَ میں بھی ہے اور قرن میں بھی ہے۔ یہ دونوں مادے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ بہرحال یہ اس لفظ کی لغوی بحث ہے۔

قرآن کا اسلوبِ کلام

اب میں اگلی بحث پر آرہا ہوں کہ اس کا اسلوب کلام کیا ہے! قرآن مجید نے شد و مد کے ساتھ جس بات کی نفی کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعر نہیں ہے:﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ ؕ﴾ (یٰسٓ:٦٩) ''ہم نے اپنے اس رسول کو شعر سکھایا ہی نہیں' نہ ان کے یہ شایانِ شان ہے''۔شعراء کے بارے میں سورۃ الشعراء میں آیا ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ﴿٢٢٥﴾ وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾﴾

''اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہوں۔کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں گھومتے رہتے ہیں (ہر میدان میں سرگرداں رہتے ہیں) اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔''

اگلی آیت میں ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ......﴾ کے الفاظ کے ساتھ استثناء بھی آیا ہے' اور استثناء قاعدہ کلیہ کی توثیق کرتا ہے (Exception proves the rule)—— چنانچہ قرآن مجید کے اعتبار سے شعر گوئی کوئی اچھی شے نہیں' کوئی ایسی محمود صفت نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو عطا فرماتا۔ بلکہ حضور اکرم ﷺ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپ ؐ کبھی کوئی شعر پڑھتے بھی تھے تو غلطی ہو جاتی تھی۔اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ پر سے اللہ تعالیٰ شاعری کی تہمت ہٹانا چاہتا تھا' لہٰذا آپ کے اندر شاعری کا وصف ہی پیدا نہیں کیا گیا۔سیرت کا ایک دلچسپ واقعہ آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شعر پڑھا اور اس میں غلطی ہوئی۔اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور عرض کی: اَشْهَدُ اَنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں''۔اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے:﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ ؕ﴾. تو واقعتاً آپ کو شعر سے یعنی شعر کے وزن اور اس کی بحر وغیرہ سے مناسبت نہیں تھی۔ باقی جہاں تک شعر کے مفہوم کا اور اعلیٰ مضامین کا تعلق ہے تو خود حضور ﷺ کا فرمان ہے:((اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً)) یعنی بہت سے بیان' بہت سے خطبے اور تقریریں جادو اثر ہوتے ہیں اور بہت سے اشعار کے اندر حکمت کے خزانے ہوتے ہیں۔بعض شعراء کے اشعار حضور ﷺ نے خود پڑھے بھی ہیں اور ان کی تحسین فرمائی ہے' لیکن قرآن بہرحال شعر نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ قدیم زمانے کی شاعری جس میں بحر' وزن اور ردیف و قافیہ کی پابندیاں سختی کے ساتھ ہوتی تھیں' اس کے اعتبار سے یقیناً قرآن شعر نہیں ہے' لیکن ایک شاعری جس کا رواج عصر حاضر میں ہوا ہے اور اس کے لیے غالباً قرآن ہی کے اسلوب کو چرایا گیا ہے' جسے آپ ''آزاد نظم'' (Blank Verse) کہتے ہیں' اس کے اندر جو صفات اور خصوصیات آج کل ہوتی ہیں اُن کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک ردھم (Rythm) بھی ہوتا ہے' اس میں فواصل بھی ہیں' قوافی کی طرز پر صوتی آہنگ بھی ہے' لیکن وہ جو معروف شاعری تھی اس کے اعتبار سے قرآن بڑی تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ قرآن شعر نہیں ہے۔

قرآن کے اسلوب کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ عام معانی میں قرآن کتاب بھی نہیں ہے۔ میں یہاں اقبال کا مصرعہ quote کر رہا ہوں' اگرچہ اس کے وہ معانی نہیں ع ''ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!''

آج ہمارا کتاب کا تصور یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہوتے ہیں۔آپ کسی کتاب یا تصنیف میں ایک موضوع کو ایک باب (Chapter) کی شکل دیتے ہیں۔ایک باب میں ایک بات مکمل ہو جانی چاہئے۔اگلے باب میں بات آگے چلے گی' کوئی پچھلی بات نہیں دہرائی جائے گی۔تیسرے باب میں بات اور آگے چلے گی۔ پھر ایک کتاب مضمون کے اعتبار سے ایک وحدت بنے گی اور اس کے اندر موضوعات اور عنوانات کے حوالے سے ابواب (Chapters) تقسیم ہو جائیں گے۔گویا ہمارے ہاں معروف معنی میں کتاب کا اطلاق جس چیز پر کیا جاتا ہے' اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔البتہ یہ ''الکتاب'' ہے بمعنی لکھی ہوئی شے۔اللہ تعالیٰ نے اسے کتاب قرار دیا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ کثرت سے یہی لفظ ''کتاب'' ہی قرآن میں آیا ہے۔ یہ لفظ ساڑھے تین سو (٣٥٠) جگہ آیا ہے۔ قرآن اور قرآنًا تقریباً ٧٠ مقامات پر آیا ہے۔لیکن ''قرآن'' exclusive آیا ہے' جبکہ کتاب کا لفظ توراۃ' انجیل' علم خداوندی اور تقدیر کے لیے بھی آیا ہے اور قرآن مجید کے حصوں اور احکام کے لیے بھی آیا ہے۔ بہرحال کتاب اس معنی میں تو ہے۔معاذ اللہ' کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کتاب نہیں ہے' لیکن جس معنی میں ہم لفظ کتاب بولتے ہیں اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہ یہ مجموعۂ مقالات (collection of essays) بھی نہیں ہے۔اس لیے کہ ہر مقالہ اپنی جگہ پر خود مکتفی اور ایک مکمل شے ہوتا ہے۔لیکن قرآن مجید کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔تو پھر یہ ہے کیا؟ پہلی بات تو یہ نوٹ کیجیے کہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔عرب میں دو ہی چیزیں زیادہ معروف تھیں' خطابت یا شاعری۔شعراء ان کے ہاں بڑے محبوب تھے۔شاعری کا ان کو بڑا ذوق تھا اور وہ شعراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ان کے ہاں قصیدہ گوئی کے مقابلے ہوتے تھے۔ پھر ہر سال جو سب سے بڑا شاعر شمار ہوتا تھا اس کی عظمت کو تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر سب شاعر اس کے سامنے

باقاعدہ سجدہ کرتے تھے۔ پھر اس کا قصیدہ بیت اللہ پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہی قصائد ''سبعة معلّقة'' کے نام سے معروف ہیں۔ چنانچہ عرب یا تو شعروں سے واقف تھے یا خطبوں سے۔ تو قرآن مجید اُس دور کی دو سب سے زیادہ معروف اصناف (شاعری اور خطبہ) میں خطبے کے اسلوب پر ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ (A Collection of divine orations) ہے' جس میں ہر سورت ایک خطبے کی مانند ہے۔

خطبے کے اعتبار سے چند باتیں نوٹ کر لیں۔ خطبے میں مخاطب اور خطیب کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہوتا ہے۔ مخاطب کو معلوم ہوتا ہے کہ میرے سامنے کون لوگ بیٹھے ہیں' ان کی فکر کیا ہے' ان کی سوچ کیا ہے' ان کے عقائد کیا ہیں' ان کے نظریات کیا ہیں۔ وہ ان کا حوالہ دیے بغیر اپنی گفتگو کے اندر اُن پر تنقید بھی کرے گا' ان کی تصحیح بھی کرے گا' لیکن کوئی تمہیدی کلمات نہیں ہوں گے کہ اب میں تمہاری فلاں غلطی کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں' میں اب تمہارے اس خیال کی نفی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ انداز نہیں ہوگا بلکہ وہ روانی کے ساتھ آگے چلے گا۔ مخاطِب اور مخاطَب کے مابین ایک ذہنی ہم آہنگی ہوتی ہے' وہ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں' اور خاص طور پر مخاطبین کے فہم' اُن کی سمجھ' اُن کے عقائد' اُن کے نظریات سے خطیب واقف ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خطبے کی شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تحویل خطاب ہوتی ہے اور بغیر وارننگ کے ہوتی ہے۔ بسا اوقات غائب کو حاضر فرض کر کے اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خطیب مسجد میں خطبہ دے رہا ہے اور وہ مخاطب کر رہا ہے صدرِ مملکت کو' حالانکہ وہ وہاں موجود نہیں ہوتے۔ اسی طرح جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں بسا اوقات ان سے صیغہ غائب میں گفتگو شروع ہو جائے گی' اور یہ بھی بلاغت کا انداز ہے۔ کبھی وہ ایک طرف بات کر رہا ہے' کبھی دوسری طرف کر رہا ہے' کبھی کسی غائب سے بات کر رہا ہے اور خطابت کا وہی انداز ہوگا اگرچہ وہ غائب وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کو تحویل خطاب کہتے ہیں۔ قرآن مجید پر غور کرنے کے ضمن میں اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر خطاب کا رُخ معیّن ہو کہ یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے' مخاطب کون ہے' تو اس بات کا اصل مفہوم اُجاگر ہو کر سامنے آتا ہے' ورنہ اگر مخاطب کا تعین نہ ہو تو بہت سے بڑے بڑے مغالطے جنم لے سکتے ہیں۔

خطبے اور مقالے میں ایک واضح فرق یہ ہوتا ہے کہ مقالے میں عام طور پر صرف عقل سے اپیل کی جاتی ہے۔ اس میں منطق اور عقلی دلائل ہوتے ہیں' جبکہ خطبے میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی اپیل ہوتی ہے۔ گویا کہ انسان کے اندر جھانک کر بات کی جاتی ہے۔ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے اندر جھانکو۔ اور: ﴿وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اور خود تمہارے اندر بھی (نشانیاں ہیں) تو کیا تم کو سوجھتا نہیں ہے؟'' اور: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ (ابراہیم:۱۰) ''(ذرا غور کرو) کیا اللہ کے بارے میں شک کرتے ہو جو زمین و آسمان کا بنانے والا ہے؟'' یہ انداز بہرحال کسی تحریر یا مقالے میں نہیں ہوگا' یہ خطبے کا انداز ہے۔

ایک اور بات جو خطبے کے اعتبار سے اس کے خصائص میں سے ہے وہ یہ کہ ایک مؤثر خطبے کے شروع میں بہت جامع گفتگو ہوتی ہے۔ کامیاب خطبہ وہی ہوگا جس کا آغاز ایسا ہو کہ مقرر اور خطیب اپنے مخاطبین اور سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے۔ اور پھر اگرچہ خطبے کے دوران مضمون دائیں بائیں پھیلے گا' اِدھر جائے گا' اُدھر جائے گا' لیکن آخر میں آ کر وہ پھر کسی مضمون کے اوپر مرتکز ہو جائے گا۔ یہ اگر نہیں ہے تو گویا کہ وقت ضائع ہو گیا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے ہیں۔ خاص طور پر مجلس احرار نے بڑے عوامی خطیب پیدا کیے' جن میں سے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی تقریر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گفتگو چار چار گھنٹے' پانچ پانچ گھنٹے چل رہی ہے۔ اس میں کبھی مشرق کی' کبھی مغرب کی' کبھی شمال کی اور کبھی جنوب کی بات آ جاتی۔ کبھی ہنسانے کا اور کبھی رلانے کا انداز ہوتا' کہیں لطیفہ گوئی بھی ہو جاتی۔ لیکن اوّل و آخر بات بالکل واضح ہوتی۔ خوب گھما پھرا کر بھی مخاطب کو کسی ایک بات پر لے آنا کہ اٹھے تو کوئی ایک بات' کوئی ایک پیغام لے کر اٹھے' کوئی ایک جذبہ اس کے اندر جاگ چکا ہو' ایک پیغام اس تک پہنچ چکا ہو' یہ خطبے کے اوصاف ہیں۔

آپ کو معلوم ہے خواہ غزل ہو یا قصیدہ' شاعری میں مطلع اور مقطع دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مطلع جاندار ہے تو آپ پوری غزل پڑھیں گے اور اگر مطلع ہی پھسپھسا ہے تو آگے آپ کیا پڑھیں گے! اسی طرح مقطع بھی جاندار ہونا چاہیے۔ اسی لیے مقطع اور مطلع کے الفاظ علیحدہ سے وضع کیے گئے ہیں۔ خطبات کے اندر بھی ابتدا اور اختتام پر نہایت جامع اور اہم مضمون ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدا اور اختتام بھی نہایت جامع مضامین پر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات کی فضیلت پر بہت سی احادیث ملتی ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات' اسی طرح سورۃ آل عمران کی شروع کی آیات اور پھر اختتامی آیات نہایت جامع ہیں۔ یہ انداز اکثر و بیشتر سورتوں میں ملے گا۔ یہ ہے اصل میں بالعموم قرآن مجید کا اسلوب' جو ظاہر بات ہے شاعری کا نہیں ہے۔ عام معانی میں وہ کتاب نہیں' مجموعۂ مقالات نہیں۔ اس کا اسلوب اگر ہے تو وہ خطبے سے ملتا ہے۔ یہ گویا خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کا مجموعہ ہے قرآن!

۞۞۞

باب سوم

قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم

آیات اور سورتوں کی تقسیم

بہت سی چیزوں سے مل کر کوئی شے مرکب بنتی ہے۔ قرآن کلام مرکب ہے۔ اس کی تقسیم سورتوں اور آیات میں ہے۔ پھر اس میں احزاب اور گروپ ہیں۔ عام تصورِ کتاب تو یہ ہے کہ اس کے ابواب ہوتے ہیں' لیکن قرآن حکیم پر ان اصطلاحات کا اطلاق نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم نے اپنی اصطلاحات خود وضع کی ہیں۔ ان اصطلاحات کی دنیا میں موجود کسی بھی کتاب کی اصطلاحات سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ جاحظ نے ایک بڑا خوبصورت عنوان قائم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرب اس سے تو واقف تھے کہ ان کے بڑے بڑے شعراء کے دیوان ہوتے تھے۔ سارا کلام کتابی شکل میں جمع ہو گیا تو وہ دیوان کہلایا۔ لہٰذا کسی بھی درجے میں اگر مثال اور تشبیہہ سے سمجھنا چاہیں تو دیوان کے مقابلے میں لفظ قرآن ہے۔ پھر دیوان بہت سے قصائد کا مجموعہ ہوتا تھا۔ ہمارے ہاں بھی کسی شاعر کا دیوان ہوگا تو اس میں قصائد ہوں گے' غزلیں ہوں گی' نظمیں ہوں گی۔ قرآن حکیم میں اس سطح پر جو لفظ ہے وہ سورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام سورتوں پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی نثر کی کتاب ہے تو وہ جملوں پر مشتمل ہوگی اور اگر نظم کی ہے تو وہ اشعار پر مشتمل ہوگی۔ اس کی جگہ قرآن مجید کی اصطلاح آیت ہے۔ شاعری میں اشعار کے خاتمے پر ردیف کے ساتھ ساتھ ایک لفظ قافیہ کہلاتا ہے اور غزل کے تمام اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید پر بھی ہم عام طور پر اس لفظ کا اطلاق کر دیتے ہیں' اس لیے کہ قرآن مجید کی آیات میں بھی آخری الفاظ کے اندر صوتی آہنگ ہے۔ یہاں انہیں فواصل کہا جاتا ہے' قافیہ کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا کہ کسی بھی درجے میں شعر کے ساتھ کوئی مشابہت نہ پیدا ہو جائے۔

قرآن مجید کا سب سے چھوٹا یونٹ آیت ہے۔ یعنی قرآن مجید کی ابتدائی اکائی کے لیے لفظ آیت اخذ کیا گیا ہے۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ قرآنی آیت گویا اللہ کے علم و حکمت کی نشانی ہے۔ آیت کا لفظ قرآن مجید میں بہت سے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی۔ اس کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی قدرت' اس کے علم اور اس کی حکمت کی گواہی دے رہی ہے۔ گویا ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔ پھر کچھ نشانیاں ہمارے اندر ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ⑳ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ㉑﴾ (الذّٰریٰت) ''اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے۔ اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟'' مزید فرمایا: ﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ﴾ (حٰم السجدة:٥٣) ''عنقریب ہم

اُن کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ اُن پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے''۔ انگریزی میں آیت کے لیے ہم لفظ verse بول دیتے ہیں' مگر verse تو شعر کو کہتے ہیں جبکہ قرآن کی آیات نہ تو شعر ہیں' نہ مصرعے ہیں' نہ جملے ہیں۔ پس بعینہٖ لفظ آیت ہی کو عام کرنا چاہیے۔ بہرحال کچھ آیاتِ آفاقی ہیں' یعنی اللہ کی نشانیاں' کچھ آیاتِ انفسی ہیں' وہ بھی اللہ کی نشانیاں ہیں اور آیاتِ قرآنیہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور علمِ کامل کی نشانیاں ہیں۔ یہ لفظ قرآن کی اکائی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

جان لینا چاہیے کہ آیات کا تعین کسی گرامر' بیان یا نحو کے اصول پر نہیں ہے' اس میں کوئی اجتہاد داخل نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے ایک اصطلاح ''توقیفی'' استعمال ہوتی ہے' یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آیات بہت طویل بھی ہیں۔ ایک آیت آیۃ الکرسی ہے جس میں مکمل دس جملے ہیں' لیکن بعض آیات حروفِ مقطعات پر بھی مشتمل ہیں۔ ﴿حٰمٓ ①﴾ ایک آیت ہے' حالانکہ اس کا کوئی مفہوم معلوم نہیں ہے' عام زبان کے اعتبار سے اس کے معانی معین نہیں کیے جا سکتے۔ یہ تو حروفِ تہجی ہیں۔ اس کو مرکب کلام بھی نہیں کہہ سکتے' کیونکہ اس کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں۔ ﴿حٰمٓ ① عٓسٓقٓ ②﴾ ان کو جمع نہیں کر سکتے' یہ توڑ توڑ کر علیحدہ علیحدہ پڑھے جائیں گے۔ اسی طرح ''الٓمّٓ'' کو ''اَلَمْ'' نہیں پڑھا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی آیت ہے۔ اس ضمن میں ایک بات یاد رکھئے کہ جہاں حروفِ مقطعات میں سے ایک ایک حرف آیا ہے جیسے ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ①﴾ ' ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ①﴾ ' ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ①﴾ یہاں ایک حرف پر آیت نہیں بنی' لیکن دو دو حروف پر آیتیں بنی ہیں۔ ''حٰمٓ'' قرآن میں سات جگہ آیا ہے اور یہ مکمل آیت ہے۔ الٓمّٓ آیت ہے۔ البتہ ''الٓرٰ'' تین حروف ہیں اور وہ آیت نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد کسی اصول' قاعدے یا اجتہاد پر نہیں ہے' بلکہ یہ امور کلیتہً توقیفی ہیں کہ حضور ﷺ کے بتانے سے معلوم ہوئے ہیں۔ البتہ پھر حضور ﷺ سے چونکہ مختلف روایات ہیں' اس لیے اس پہلو سے کہیں کہیں فرق واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ آیات کی تعداد چھ ہزار سے زائد ہے' لیکن بعض کے نزدیک کم و بیش ٦٢١٦' بعض کے نزدیک ٦٢٣٦ اور بعض کے نزدیک ٦٦٦٦ ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ بعض سورتوں کے اندر آیات کے تعین میں بھی فرق ہے۔ لیکن یہ سب کسی کا اپنا اجتہاد نہیں ہے' بلکہ سب کے سب اعداد و شمار حضور ﷺ سے نقل ہونے کی بنیاد پر ہیں۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ آیت بسم اللہ قرآن حکیم میں ١١٣ مرتبہ سورتوں کے شروع میں آتی ہے (کیونکہ سورتوں کی کل تعداد ١١٤ ہے اور ان میں سے صرف ایک سورت سورۃ التوبہ کے شروع میں بسم اللہ نہیں آتی۔) اگر اس کو ہر مرتبہ شمار کیا جائے تو ١١٣ تعداد بڑھ جائے گی' ہر مرتبہ شمار نہ کیا جائے تو ١١٣ تعداد کم ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے' بلکہ اس میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ حروفِ مقطعات پر بھی آیت ہے' مرکباتِ ناقصہ پر بھی آیت ہے' جیسے ﴿وَالْعَصْرِ ①﴾ کہیں آیت مکمل جملہ بھی ہے' اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں دس دس جملے ہیں۔

قرآن حکیم کی آیتیں جمع ہوتی ہیں تو سورتیں وجود میں آتی ہیں۔ سورت کا لفظ ''سُوَر'' سے ماخوذ ہے اور یہ لفظ سورۃ الحدید

میں فصیل کے معنی میں آیا ہے۔ پچھلے زمانے میں ہر شہر کے باہر‘ گرداگرد ایک فصیل ہوتی تھی جو شہر کا احاطہ کر لیتی تھی‘ شہر کی حفاظت کا کام بھی دیتی تھی اور حد بندی بھی کرتی تھی۔ آیات کو جب جمع کیا گیا تو اس سے جو فصیلیں وجود میں آئیں وہ سورتیں ہیں۔ فصل علیحدہ کرنے والی شے کو کہتے ہیں۔ تو گویا ایک سورۃ دوسری سورۃ سے علیحدہ ہو رہی ہے۔ فصیل علیحدگی کی بنیاد ہے۔ فصیل کے لیے ''سُور'' کا لفظ مستعمل ہے‘ پھر اس سے سورت بنا ہے۔ البتہ یہ سورتیں ''ابواب'' نہیں ہیں‘ بلکہ جس طرح آیت کے لیے لفظ verse مناسب نہیں اسی طرح سورت کے لیے لفظ ''باب'' یا chapter درست نہیں۔

اب جان لیجیے کہ جیسے آیات کا معاملہ ہے ایسے ہی سورتوں کا بھی ہے۔ چنانچہ سورتیں بہت چھوٹی بھی ہیں۔ قرآن مجید کی تین سورتیں صرف تین تین آیات پر مشتمل ہیں: سورۃ العصر‘ سورۃ النصر اور سورۃ الکوثر۔ جبکہ تین سورتیں ۲۰۰ سے زائد آیات پر مشتمل ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں۔ (سورۃ البقرۃ کی آیات کی تعداد کے اعتبار سے رائے میں فرق ہے۔) سب سے زیادہ آیات سورۃ البقرۃ میں ہیں۔ پھر سورۃ الشعراء میں ۲۲۷ اور سورۃ الاعراف میں ۲۰۶ آیات ہیں۔ محققین و علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آیات کی طرح سورتوں کا تعین بھی حضورﷺ نے خود فرمایا۔ اگرچہ ایک ضعیف سا قول ملتا ہے کہ شاید یہ کام صحابہ کرام ؓ نے کسی اجتہاد سے کیا ہو‘ مگر یہ مختار قول نہیں ہے‘ ضعیف ہے۔ اجماع اسی پر ہے کہ آیتوں کی تعیین بھی توقیفی اور سورتوں کی تعیین بھی توقیفی ہے۔

قرآن حکیم کی سات منازل

دورِ صحابہؓ میں ہمیں ایک تقسیم اور ملتی ہے اور وہ ہے سات منزلوں کی شکل میں سورتوں کی گروپنگ۔ انہیں احزاب بھی کہتے ہیں۔ ''حزب'' کا لفظ احادیث میں ملتا ہے‘ لیکن وہ ایک ہی معنی میں نہیں ہوتا۔ یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا کہ ہر شخص اپنے لیے تلاوت کی ایک مقدار معین کر لیتا تھا کہ میں اتنی مقدار روزانہ پڑھوں گا۔ یہ گویا کہ اس کا اپنا حزب ہے۔ چنانچہ حضرت عمر بن خطاب ؓ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهٖ مِنَ اللَّيْلِ' اَوْ عَنْ شَیْءٍ مِنْهُ' فَقَرَأَهُ مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الظُّهْرِ' كُتِبَ لَهٗ كَاَنَّمَا قَرَاَهُ مِنَ اللَّيْلِ)) (اخرجه الجماعة الا البخاری)

''جو شخص نیند (یا بیماری) کی وجہ سے رات کو (تہجد میں) اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے‘ پھر وہ فجر اور ظہر کے درمیان اس کی تلاوت کر لے تو اس کے لیے اتنا ہی ثواب لکھا جائے گا گویا اس نے اسے رات کے دوران پڑھا ہے''۔ (یہ حدیث بخاری کے سوا دیگر ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔)

یعنی جو شخص کسی وجہ سے کسی رات اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے‘ جتنا بھی نصاب اس نے معین کیا ہو‘ کسی بیماری کی وجہ سے‘ یا نیند کا غلبہ ہو جائے‘ تو اسے چاہیے کہ اپنی اس قراءت یا تلاوت کو وہ دن کے وقت ضرور پورا کر لے۔ صحابہ کرام ؓ میں سے اکثر کا معمول تھا کہ ہر ہفتے قرآن مجید کی تلاوت ختم کر لیتے تھے۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کے سات حصے ایسے ہو جائیں کہ ایک حصہ روزانہ تلاوت کریں تو ہر ہفتے قرآن مجید کا دَور مکمل ہو جائے۔ اس لیے سورتوں کے سات مجموعے یا گروپ بنا دیے گئے۔ ان گروپوں کے لیے آج کل ہمارے ہاں جو لفظ مستعمل ہے وہ ''منزل'' ہے‘ لیکن احادیث و روایات میں حزب کا لفظ آتا ہے۔

احزاب یا منازل کی اس تقسیم میں بڑی خوبصورتی ہے۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ یہ ساتوں حصے بالکل مساوی کیے جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ظاہر بات ہے کہ سورتیں ٹوٹ جاتیں‘ ان کی فصیلیں ختم ہو جاتیں۔ چنانچہ ہر حزب میں پوری پوری سورتیں جمع کی گئیں۔ اس طرح احزاب یا منزلوں کی مقداریں مختلف ہو گئیں۔ چنانچہ کچھ حزب چھوٹے ہیں کچھ بڑے ہیں‘ لیکن ان کے اندر سورتوں کی فصیلیں نہیں ٹوٹیں‘ یہ ان کا حسن ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شے بھی شاید اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ منزلوں کی تعیین بھی توقیفی ہے‘ لیکن منزلوں کی اس تقسیم میں گنتی کے اعتبار سے جو حسن پیدا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی کا ایک مظہر ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو الگ رکھ دیا جائے کہ یہ تو قرآن حکیم کا مقدمہ یا دیباچہ ہے تو اس کے بعد پہلا حزب یا منزل تین سورتوں (البقرۃ‘ آل عمران‘ النساء) پر مشتمل ہے۔ دوسری منزل پانچ سورتوں پر‘ تیسری منزل سات سورتوں پر‘ چوتھی منزل نو سورتوں پر‘ پانچویں منزل گیارہ سورتوں پر اور چھٹی منزل تیرہ سورتوں پر مشتمل ہے‘ جبکہ ساتویں منزل (حزبِ مفصل) جو کہ آخری منزل ہے‘ اس میں ۶۵ سورتیں ہیں۔ آخر میں سورتیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ یاد رہے کہ ۶۵ بھی ۱۳ کا multiple بنتا ہے (۶۵ = ۵×۱۳)۔ سورتوں کی تعداد جیسا کہ ذکر ہو چکا ۱۱۴ ہے۔ یہ تعداد متفق علیہ ہے‘ جس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

آج کل جو قرآن مجید حکومت سعودی عرب کے زیر اہتمام بہت بڑی تعداد میں بڑی خوبصورتی اور نفاست سے شائع ہوتا ہے‘ اس میں حزب کا لفظ بالکل ایک نئے معنی میں آیا ہے۔ انہوں نے ہر پارے کو دو حزب میں تقسیم کر لیا ہے‘ گویا نصف پارے کی بجائے لفظ حزب ہے۔ پھر وہ حزب بھی چار حصوں میں منقسم ہے: رُبع الحزب‘ نصفُ الحزب اور پھر ثلاثةُ ارباعِ الحزب۔ اس طرح انہوں نے ہر پارے کے آٹھ حصے بنا لیے ہیں۔ یہ لفظ حزب کا بالکل نیا استعمال ہے۔ اس کی کیا سند اور دلیل ہے اور یہ کہاں سے ماخوذ ہے‘ یہ میرے علم میں نہیں ہے۔

انسانی کلام حروف و اصوات سے مرتب ہوتا ہے اور ہر زبان میں حروفِ ہجائیہ ہوتے ہیں۔ پھر حروف مل کر کلمات بناتے ہیں۔ کلمات سے کلام وجود میں آتا ہے‘ خواہ وہ کلام منظوم ہو یا نثر ہو۔ اسی طرح قرآن مجید کی ترکیب ہے۔ حروف سے مل کر کلمات بنے‘ کلمات نے آیات کی شکل اختیار کی‘ آیات جمع ہوئیں سورتوں کی شکل میں اور سورتیں جمع ہو گئیں منزلوں کی شکل میں۔

رکوعوں اور پاروں کی تقسیم

سورتوں کی پہلی تقسیم رکوعوں میں ہے۔ یہ تقسیم دورِ صحابہؓ اور دورِ نبویؐ میں موجود نہیں تھی۔ یہ تقسیمیں زمانۂ مابعد کی پیداوار ہیں۔ رکوعوں کی تقسیم بڑی سورتوں میں کی گئی۔ ۳۵ سورتیں ایسی ہیں جو ایک ہی رکوع پر مشتمل ہیں‘ یعنی وہ اتنی چھوٹی ہیں کہ انہیں ایک رکعت میں آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے‘ لیکن بقیہ سورتیں طویل ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں اور اس کے

۴۰ رکوع ہیں۔ حضور ﷺ سے منقول ہے کہ آپؐ نے ایک رات ان تین سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النساء) کی منزل ایک رکعت میں مکمل کی ہے۔لیکن یہ تو استثناءات کی بات ہے۔ عام طور پر تلاوت کی وہ مقدار جو ایک رکعت میں بآسانی پڑھی جاسکتی ہو' ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہے۔ رکوع رکعت سے ہی بنا ہے۔ یہ تقسیم حجاج بن یوسف کے زمانے میں یعنی تابعین کے دور میں ہوئی ہے۔لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ تقسیم بڑی محنت سے معانی پر غور کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ کسی مقام پر ایک مضمون مکمل ہو گیا اور دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے تو وہاں اگر رکوع کر لیا جائے تو بات ٹوٹے گی نہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر ائمہ مساجد پڑھے لکھے لوگ نہیں ہوتے' عربی زبان سے واقف نہیں ہوتے' لہٰذا اکثر ایسی تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایسی جگہ پر رکوع کر دیتے ہیں جہاں کلام کا ربط منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر اگلی رکعت میں وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے بات معنوی اعتبار سے بہت ہی گراں گزرتی ہے۔ رکوعوں کی تقسیم بالعموم بہت عمدہ ہے' لیکن چند ایک مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت یہاں سے ہٹا کر رکوع ماقبل میں شامل کی گئی ہوتی یا رکوع کا نشان اس آیت سے پہلے ہوتا تو معانی اور مفہوم کے اعتبار سے بہتر ہوتا۔ بہرحال اکثر و بیشتر رکوعوں کی تقسیم معنوی اعتبار سے صحیح ہے جو بڑی محنت سے گہرائی میں غور کر کے کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک تقسیم پاروں کی شکل میں ہے۔ یہ تقسیم تو اور بھی بعد کے زمانے کی ہے اور بڑی بھونڈی تقسیم ہے' اس لیے کہ اس میں سورتوں کی فصیلیں توڑ دی گئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا جوشِ ایمان کم ہوا اور لوگوں نے معمول بنانا چاہا کہ ہر مہینے میں ایک مرتبہ قرآن ختم کر لیں تب اُن کو ضرورت پیش آئی کہ اس کو تیس حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے کسی نے غالباً یہ حرکت کی کہ اُس کے پاس جو مصحف موجود تھا اُس نے اس کے صفحے گن کر تیس پر تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح جہاں بھی صفحہ کٹ گیا وہیں نشان لگا دیا اور اگلا پارہ شروع ہو گیا۔ اس بھونڈی تقسیم کی مثال دیکھئے کہ سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں ہے جبکہ باقی پوری سورت چودھویں پارے میں ہے۔ ہمارے ہاں جو مصحف ہیں ان میں آپ کو یہی شکل نظر آئے گی۔ سعودی عرب سے جو قرآن مجید بڑی تعداد میں شائع ہو کر پوری دنیا میں پھیلا ہے' یہ اب پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسی انداز سے شائع کیا جاتا ہے جس سے کہ ہم مانوس ہیں۔ البتہ اہل عرب کے لیے جو قرآن مجید شائع کیا جاتا ہے اس میں رموزِ اوقاف اور علاماتِ ضبط بھی مختلف ہیں اور اس میں چودھواں جزء سورۃ الحجر سے شروع کیا جاتا ہے۔ گویا وہ تقسیم جو ہمارے ہاں ہے اس میں انہوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے' اگرچہ پاروں کی تقسیم باقی رکھی ہے۔ بعض دوسرے عرب ممالک سے جو قرآن مجید شائع ہوتے ہیں۔ ان میں پاروں کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی متفق علیہ چیز نہیں ہے اور زمانۂ تابعین میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے' یہ اس سے بہت بعد کی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمران ابن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((خَیْرُ النَّاسِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ)) اس حدیث کی رو سے بہترین ادوار تین ہی ہیں —— دورِ صحابہ' دورِ تابعین' پھر دورِ تبع تابعین۔ ان تین زمانوں کو ہم ''قرونٌ مشهودٌ لها بِالخیر'' کہتے ہیں۔ باقی اس کے بعد کا معاملہ حجت نہیں ہے' اس کی دین کے اندر کوئی مستقل اور دائمی اہمیت نہیں ہے۔

ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف کا اختلاف

قرآن حکیم کی ترتیب کے ضمن میں پہلی بات جو بالکل متفق علیہ اور ہر شک و شبہ سے بالا ہے وہ یہ ہے کہ ترتیبِ نزولی بالکل مختلف ہے اور ترتیبِ مصحف بالکل مختلف ہے۔ اکثر و بیشتر جو سورتیں ابتدا میں نازل ہوئیں وہ آخر میں درج ہیں اور ہجرت کے بعد جو سورتیں نازل ہوئی ہیں (البقرۃ' آل عمران' النساء' المائدۃ) ان کو شروع میں رکھا گیا ہے۔ تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ترتیبِ نزولی اور ترتیب مصحف مختلف ہے۔

جہاں تک ترتیب نزولی کا تعلق ہے' اس سے ہر طالب علم کو دلچسپی ہوتی ہے جو قرآن مجید پر غور کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ ترتیبِ نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کے معانی اور مفاہیم کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ایک خاص پس منظر کے ساتھ سورتیں جڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ ابتدا میں کیا حالات تھے جن میں یہ سورتیں نازل ہوئیں' پھر حالات نے کیا پلٹا کھایا تو اگلی سورتیں نازل ہوئیں۔ چنانچہ ترتیبِ نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کو مرتب کیا جائے تو ایک اعتبار سے وہ سیرت النبیؐ کی کتاب بن جائے گی۔ اس لیے کہ آغازِ وحی کے بعد سے لے کر آپؐ کے انتقال تک وہ زمانہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس پورے زمانے کے ساتھ قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کا جو مجموعی ربط ہے' ترتیبِ نزولی کی مدد سے اسے سمجھنے اور غور و فکر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پس قرآن مجید کے ہر طالب علم کو اس سے دلچسپی ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ انہوں نے ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کو مرتب کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات بہت شد و مدّ کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ انہوں نے بھی اس کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا' اور عوام کی سطح پر یہ مشہور ہے کہ اہل تشیع اسی کو اصل اور مستند قرآن مانتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ مصحف ان کے بارہویں امام کے پاس ہے' جو ایک غار میں روپوش ہیں۔ قیامت کے قریب جب وہ ظاہر ہوں گے تب وہ اپنا یہ مصحف یعنی ''اصل قرآن'' لے کر آئیں گے۔ گویا اہل تشیع یہ قرآن اُس وقت تک کے لیے ہی قبول کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کی طرف یہی بات منسوب ہے' لیکن دورِ حاضر کے بعض شیعہ علماء اس تصور کے قائل نہیں ہیں۔ ایک شیعہ عالم دین سید ہادی علی نقوی نے بہت شد و مد کے ساتھ اس تصور کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ ''ہم اسی قرآن کو مانتے ہیں' یہی اصل قرآن ہے اور اسے من و عن محفوظ مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کوئی آیت اس سے خارج نہیں ہوئی اور کوئی شے باہر سے بعد میں اس میں داخل نہیں ہوئی۔ یہی جو ''دُفَّتین'' یعنی جلد کے دوگتّوں کے مابین ہے' یہی حقیقی اور اصلی قرآن ہے''۔

بہرحال اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایسا کوئی مصحف تھا جسے آپ نے ترتیب نزولی کے مطابق مرتب کیا تھا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ علمی اور تحقیقی اعتبار سے قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے کے لیے قرآن مجید کے بعض انگریزی تراجم میں بھی ترتیب نزولی کے اعتبار سے سورتوں کو مرتب کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (محمد عزۃ دروزۃ نے بھی اپنی تفسیر ''التفسیر الحدیث'' میں سورتوں کو نزولی اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔) علمی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں' لیکن اصل حجیت ترتیب مصحف کی ہے۔ یہ ترتیب توقیفی ہے۔ یہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ترتیب ہے اور یہی ترتیب لوح محفوظ میں ہے۔ اصل قرآن تو وہی ہے۔

ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّــهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ﴿۷۷﴾ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ ﴿۷۸﴾﴾(الواقعة)اور:﴿بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ ﴿۲۱﴾ فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿۲۲﴾﴾ (البروج)۔''الاتقان فی علوم القرآن''میں جلال الدین سیوطیؒ نے بہت ہی زور اور تاکید کے ساتھ کسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر تمام انسان اور جن مل کر کوشش کر لیں تب بھی ترتیب نزولی پر قرآن کو مرتب نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے کہ اس کے بارے میں ہمارے پاس مکمل معلومات نہیں ہیں۔ بہت سی سورتوں کے اندر بعد میں نازل ہونی والی آیات پہلے آ گئی ہیں اور شروع میں نازل ہونی والی بعد میں آئی ہیں۔اس اعتبار سے ایک ایک آیت کے بارے میں معین کرنا اور اس کی ترتیب کے بارے میں اجماع ناممکن ہے۔ چنانچہ اصل مصحف وہی ہے جو ہمارے پاس ہے اور اس کی ترتیب بھی توقیفی ہے جو محمد رسول اللہﷺ نے بتائی ہے۔

اس ترتیب مصحف کے اعتبار سے اِس دور میں سورتوں کی ایک نئی گروپنگ کی طرف راہنمائی ہوئی ہے۔مولانا حمید الدین فراہیؒ نے خاص طور پر اپنی توجہ کو نظم قرآن پر مرکوز کیا' آیات کا باہمی ربط تلاش کیا۔نیز یہ کہ آیتوں کی وہ کون سی قدر مشترک ہے جس کی بنا پر ان کو سورتوں میں جمع کیا گیا —— پھر یہ کہ ہر سورۃ کا ایک عمود اور مرکزی مضمون ہے' بظاہر آیات غیر مربوط نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت اُن کے مابین ایک منطقی ربط موجود ہے اور ہر آیت اس سورۃ کے عمود کے ساتھ مربوط ہے —— مزید یہ کہ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں —— ان چیزوں پر مولانا فراہیؒ نے زیادہ توجہ کی۔مولانا اصلاحی صاحب نے اس بات کو مزید آگے بڑھایا ہے۔

اس ضمن میں ایک اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے' جسے رفع کر دینا ضروری ہے کہ قرآن مجید کا یہ پہلو اس زمانے میں کیوں سامنے آیا اور اس سے پہلے اس پر غور کیوں نہیں ہو سکا؟ کیا ہمارے اسلاف قرآن مجید پر تدبر کا حق ادا نہیں کرتے تھے؟ اس اشتباہ کو اپنے ذہن میں نہ آنے دیں' اس لیے کہ قرآن مجید کی شان یہ ہے کہ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔حضورﷺ کا اپنا قول ہے: ''لَا تَنۡقَضِیۡ عَجَائِبُهٗ ''۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص دور کے محدثین' محققین' مفسرینؒ قرآن مجید کے علم کا بتمام و کمال احاطہ کر چکے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔اگر ایسا ہوتا تو یہ قرآن مجید پر بھی طعن ہوتا اور خود حضورؐ کے اس قول کی بھی نفی ہوتی۔ یہ تو جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا قرآن مجید کے عجائب' اس کی حکمتیں' اس کے علوم و معارف کے نئے نئے خزانے برآمد ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ مطالعہ قرآن کے بعد ہم یہ محسوس کریں کہ ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق اس کو سیکھا ہے اور بعد میں آنے والے اس میں سے کچھ اور بھی حاصل کریں گے' وہ ہمیشہ اس کے لیے کوشاں رہیں گے' اس میں غور و فکر اور تدبر کرتے رہیں گے اور نئے نئے علوم اور نئے نئے نکات اس میں سے برآمد ہوتے رہیں گے۔اللہ تعالیٰ کی حکمت میں یہی زمانہ اس انکشاف کے لیے معین تھا' اور ظاہر بات ہے کہ حکمتِ قرآنی کا جو بھی کوئی نیا پہلو دریافت ہو گا وہ کسی انسان ہی کے ذریعے سے ہو گا۔لہٰذا اس کے لیے طبیعت کے اندر بُعد محسوس نہ کریں۔ بہرحال مولانا فراہیؒ نے نظم قرآن کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔وہ تفسیر قرآن لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہیں سکے' صرف چند سورتوں کی تفاسیر انہوں نے لکھی ہیں۔ان میں سے بھی بعض نامکمل ہیں۔وہ ایک مفکر قسم کے انسان تھے' مصنف قسم کے انسان نہیں تھے۔مفکر انسان مسلسل غور کرتا رہتا ہے اور اس کے سامنے نئے نئے پہلو آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا تصنیف و تالیف کا انداز یہ تھا کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر فائل کھول رکھے تھے۔ جب کوئی نیا خیال آتا تو کاغذ پر لکھ کر متعلقہ فائل میں شامل کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف ان کی وفات کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں' جبکہ ان کے زمانے میں وہ صرف فائلوں کی شکل میں تھیں اور کسی شے کے چھپنے کی نوبت آئی ہی نہیں۔سوچ و بچار کا تسلسل ان کے آخری لمحے تک جاری رہا۔''مقدمہ نظام القرآن'' واقعتاً ان کے فکر اور سوچ کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔اس ضمن میں ان کے شاگرد رشید امین احسن اصلاحی صاحب نے بات کو آگے بڑھایا ہے۔نظم قرآن کے بارے میں ان حضرات کے نتیجۂ فکر کے چند نکات ملاحظہ ہوں:

(i) ہر سورت کا ایک عمود ہے' جیسے ایک ہار کی ڈوری ہے اور اس میں موتی پروئے ہوئے ہیں۔ یہ ڈوری دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی' موتی نظر آتے ہیں' لیکن ان کو باندھنے والی شے تو ڈوری ہے جس میں وہ پروئے گئے ہیں۔اسی طرح ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون یا عمود ہے جس کے ساتھ اس کی تمام آیات مربوط ہیں۔

(ii) قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی مضمون کا ایک رُخ ایک سورت میں آ جاتا ہے اور اسی کا دوسرا رخ اس جوڑے کے دوسرے حصّے میں آ کر مضمون کی تکمیل کر دیتا ہے۔مولانا اصلاحی صاحب نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔ البتہ جہاں تک اس اصول کے انطباق کا تعلق ہے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اور جو حضرات میرے دروس میں تسلسل سے شرکت کرتے رہے ہیں انہیں معلوم ہے کہ مجھے بہت سے مواقع پر اصلاحی صاحب سے اختلاف بھی ہے' لیکن اصولاً یہ بات درست ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ تاہم بعض سورتیں منفرد حیثیت کی مالک ہیں' ان کا جوڑا اس جگہ پر موجود نہیں ہے۔اگرچہ میں نے تحقیق کی ہے کہ اکثر و بیشتر ایسی سورتوں کے جوڑے بھی معناً قرآن میں موجود ہیں۔مثلاً سورۃ النور تنہا اور منفرد ہے' سورۃ الاحزاب بھی منفرد اور تنہا ہے' لیکن یہ دونوں آپس میں جوڑا ہیں اور ان میں جوڑا ہونے کی نسبت بتمام و کمال موجود ہے۔اسی طرح سورۃ الفاتحہ منفرد ہے۔وہ تو اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ واقعتاً اس کا بتمام و کمال جوڑا بننا ممکن نہیں' وہ اپنی جگہ پر قرآن حکیم اور سَبۡعًا مِنَ الۡمَثَانِیۡ ہے' لیکن سورۃ الناس میں غور کریں تو معناً یہ سورت سورۃ الفاتحہ کا جوڑا بنتی ہے۔اس لیے کہ سورۃ الفاتحہ میں استعانت ہے اور سورۃ الناس میں استعاذہ۔ پھر سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی تین شانیں رَبّ' مَلِک' اِلٰہ ہیں اور یہی تین شانیں سورۃ الناس میں بھی ہیں۔

(iii) تلاوت کے لیے سات منزلوں کے علاوہ قرآن حکیم میں سورتوں کی ایک معنوی گروپنگ بھی ہے۔اس اعتبار سے بھی سورتوں کے سات گروپ ہیں اور ہر گروپ میں مکی اور مدنی دونوں طرح کی سورتیں شامل ہیں۔ ہر گروپ میں ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتیں اور اس کے بعد ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتیں ہیں۔ایک گروپ کی مکی اور مدنی سورتوں میں وہی نسبت ہے جو ایک جوڑے کی دو سورتوں میں ہوتی ہے۔ جیسے ایک مضمون کی تکمیل ایک جوڑے کی سورتوں میں ہوتی ہے' یعنی ایک رُخ ایک فرد میں اور دوسرا رُخ دوسرے فرد میں' اسی طرح ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون اور عمود ہے'

جس کا ایک رُخ مکی سورتوں میں اور دوسرا رُخ مدنی سورتوں میں آ جاتا ہے۔ اس طرح غور وفکر اور تدبر کے نئے میدان سامنے آ رہے ہیں۔ جو انسان بھی ان کا عمود معین کرنے میں غور وفکر کرے گا وہ کسی نتیجے پر پہنچے گا' اگرچہ عمود معین کرنے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑا گروپ پہلا ہے جس میں مکی سورت صرف ایک یعنی سورۃ الفاتحہ جبکہ مدنی سورتیں چار ہیں جو سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں' یعنی سورۃ البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ۔ دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو سورتیں مکی اور دو مدنی ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکی ہیں' جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ مدنی ہیں۔ تیسرے گروپ میں سورۂ یونس سے سورۃ المؤمنون تک چودہ مکی سورتیں ہیں۔ یہ تقریباً سات پارے بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مدنی سورت ہے اور وہ سورۃ النور ہے۔ اس کے بعد چوتھے گروپ میں سورۃ الفرقان سے سورۃ السجدۃ تک مکیات ہیں' پھر ایک مدنی سورت سورۃ الاحزاب ہے۔ پانچویں گروپ میں سورۂ سبا سے سورۃ الاحقاف تک مکیات ہیں' پھر تین مدنی سورتیں' سورۂ محمد' سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات ہیں۔ اس کے بعد چھٹے گروپ میں پھر سورۂ ق سے سورۃ الواقعہ تک سات مکیات ہیں جن کے بعد پھر دس مدنیات ہیں سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم۔ اسی طرح ساتویں گروپ میں بھی پہلے مکی سورتیں ہیں اور آخر میں دو مدنی سورتیں۔ اس طرح یہ سات گروپ بنتے ہیں۔ یہ گروپ مولانا اصلاحی صاحب کے مرتب کردہ ہیں۔ ان میں پہلا اور آخری گروپ اس اعتبار سے عکسی نسبت رکھتے ہیں کہ پہلے گروپ میں صرف ایک سورت سورۃ الفاتحہ مکی ہے اور سوا چھ پاروں پر مشتمل چار طویل ترین سورتیں مدنی ہیں' جبکہ آخری گروپ میں سورۃ الملک سے لے کر پورے دو پارے تقریباً مکیات پر مشتمل ہیں' آخر میں صرف دو سورتیں ''معوذتین'' مدنی ہیں۔ یعنی یہاں نسبت بالکل عکسی ہے۔ لیکن دوسرا گروپ بھی متوازن ہے' یعنی دو سورتیں مکی' دو مدنی —— اور چھٹا گروپ بھی متوازن ہے کہ اس میں سات سورتیں مکی ہیں (سورۃ ق سے سورۃ الواقعہ تک) جبکہ دس سورتیں مدنی ہیں (سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک) لیکن حجم کے اعتبار سے تقریباً برابر ہیں۔ یہ بھی غور وفکر اور سوچ بچار کا ایک موضوع ہے اور اس سے بھی قرآن مجید کی حکمت وہدایت اور اس کے علم کے نئے نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتوں کے جوڑے ہونے کا معاملہ قرآن مجید میں بعض جگہوں پر تو بہت ہی نمایاں ہے۔ ''الْمُعَوَّذَتَین'' آخری دو سورتیں ہیں جو تعوّذ پر مشتمل ہیں: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ①﴾ اور: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ①﴾. اسی طرح الزَّھراوَین ''دو نہایت تابناک سورتیں'' سورۃ البقرۃ اور آل عمران ہیں۔ حضورﷺ نے ان دونوں کو بھی ایک نام دیا جیسے آخری دو سورتوں کو ایک نام دیا۔ اسی طرح سورۃ المزمّل اور سورۃ المدثّر میں اور سورۃ الضحٰی اور سورۃ الانشراح میں معنوی ربط ہے۔ سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق میں تو یہ ربط بہت ہی نمایاں ہے۔ دونوں سورتوں کا آغاز بالکل ایک جیسا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اور ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ﴾۔ مضمون کے اندر بھی بڑی گہری مناسبت ہے۔ اس کے بعد سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا جوڑا ہے۔ سورۃ الصّف سَبَّحَ لِلّٰهِ سے اور سورۃ الجمعہ یُسَبِّحُ لِلّٰهِ کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہے۔ سورۃ الصّف کی مرکزی آیت جو رسول اللہﷺ کے مقصدِ بعثت کو معیّن کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ہے' جبکہ سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت جو حضورﷺ کے انقلاب کا اساسی منہاج معین کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ہے۔ بہر حال سورتوں کا جوڑا ہونا' سورتوں کا گروپ کی شکل میں ہونا' ان گروپس کا اپنا ایک عمود اور ایک مرکزی مضمون ہونا' پھر اس کے دو رُخ بن جانا جو اُس کی مکیات اور مدنیات میں آتے ہیں' قرآن مجید کے علم وحکمت کے خزانے کے وہ دروازے ہیں جو اَب کھلے ہیں۔ اس طرح کے دروازے ہر دور میں کھلتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کھلتے رہیں گے۔ چنانچہ قرآن مجید پر تذکر اور تدبر تسلسل کے ساتھ جاری رہنا چاہیے۔

پیچھے سات منزلوں اور سات احزاب کا ذکر ہو چکا۔ اب مکی اور مدنی سورتوں کے سات گروپس کا بیان ہوا۔ یہ دونوں قسم کے گروپ دو جگہ پر آ کر مل جاتے ہیں۔ پہلی منزل تو سورۃ النساء پر ختم ہو جاتی ہے اور پہلا گروپ سورۃ المائدۃ پر ختم ہوتا ہے۔ سورۃ التوبہ پر دوسری منزل بھی ختم ہوتی ہے اور دوسرا گروپ بھی ختم ہوتا ہے۔ سورۂ یونس سے تیسری منزل شروع ہوتی ہے اور تیسرا گروپ بھی شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مقام اور ہے۔ سورۂ ق سے آخری منزل بھی شروع ہو رہی ہے اور اسی سے چھٹا گروپ بھی شروع ہو رہا ہے۔ سورۂ ق چھٹے گروپ کی پہلی مکی سورۃ ہے۔ یہ چھٹا گروپ سورۃ التحریم پر ختم ہو جاتا ہے اور آخری گروپ سورۃ الملک سے شروع ہوتا ہے' لیکن جو منزل سورۂ ق سے شروع ہوتی ہے وہ سورۃ الناس تک ایک ہی ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو معلومات کے درجے میں سامنے رہیں اور ذہن میں موجود رہیں تو انسان جب غور کرتا ہے تو ان کے حوالے سے بعض اوقات حکمت کے بڑے قیمتی موتی ہاتھ لگتے ہیں۔

۞۞۞

باب چہارم

تدوینِ قرآن

قرآن مجید کی تدوین کے ضمن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں مکمل ہوگئی تھی۔ کسی شاعر کا دیوان اس کی غزلوں اور قصائد پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کی بھی تدوین ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک دیوان کی شکل میں ہے' اس کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ جمع و تدوینِ قرآن اپنی جگہ پر بہت اہم موضوع ہے۔ اس کے بارے میں خاص معلومات ہمارے ذہنوں میں ہر وقت مستحضر رہنی چاہئیں' کیونکہ عام طور پر اہل تشیع کے حوالے سے ہمارے ہاں جو چیزیں مشہور ہیں (واللہ اعلم وہ حقیقت پر مبنی ہیں یا محض مخالفین کا پراپیگنڈا ہے) ان کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہوئے ہیں اور وہ کافی بڑے حلقے کے اندر پھیلے ہیں۔

ہمارے ہاں جمعے کے خطبے جو مرتب کیے گئے ہیں اور عام خطیب پڑھتے ہیں' ان میں بھی ایسے الفاظ آ گئے ہیں جو بہت بڑے بڑے مغالطوں کی بنیاد بن گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی دشمن اسلام نے' کسی باطنی نے' کسی غالی قسم کے رافضی نے یہ الفاظ شامل کر دیے ہوں۔ بظاہر تعریف ہو رہی ہے مگر حقیقت میں تنقیص ہو رہی ہے اور دین کی جڑ کاٹی جا رہی ہے۔ اس کی مثال بھی اسی تدوین کے ذیل میں آئے گی۔

قرآن حکیم کی تدوین تین مراحل میں مکمل ہوئی۔ پہلی تدوین رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہوگئی تھی' لیکن وہ تدوین اس شکل میں تھی کہ سورتیں معین ہوگئیں' سورتوں کی ترتیب معین ہوگئی۔ کتابی شکل میں قرآن مجید حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس مختلف حصوں میں لکھا ہوا قرآن تھا۔ لوگ اونٹ کے شانے کی ہڈی (جو کافی چوڑی ہوتی ہے) پر لکھتے تھے یا کولہے کی ہڈی پر لکھا جاتا تھا۔ اونٹ کی پسلیاں (ribs) بھی بڑی چوڑی ہوتی ہیں' یہ بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ کاغذ اس زمانے میں کہاں تھا' کپڑا زیادہ دستیاب تھا' لہٰذا کپڑے پر بھی لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے پتھروں پر بھی آیات لکھ لیتے تھے۔ یاد رہے کہ قرآن مجید کی اصل حیثیت ''قول'' کی ہے: ﴿اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۝۴۰﴾ (الحاقۃ) نہ تو یہ حضور ﷺ کو لکھی ہوئی شکل میں دیا گیا نہ حضور ﷺ نے لکھی ہوئی شکل میں اُمت کو دیا۔ حضور ﷺ کو بھی یہ پڑھایا گیا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤى ۝۶﴾ (الاعلیٰ) ''ہم آپ کو پڑھائیں گے' پھر آپ بھولیں گے نہیں''۔ یہ اوّلاً قولِ جبرائیل' پھر قولِ محمد ﷺ بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ جبرائیل علیہ السلام سے حضور ﷺ نے سنا' حضورؐ سے صحابہؓ نے سنا۔ چنانچہ اصل میں تو قرآن پڑھی جانے والی شے ہے۔ لیکن جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا آپ اسے لکھوا بھی لیتے۔ بعض صحابہ کرام ؓ کتابتِ وحی کی ذمہ داری پر مامور تھے۔ اور حضور ﷺ نے اس بات کا حکم بھی دے دیا تھا کہ ((لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ غَيْرَ الْقُرْآنِ)) ''میری طرف سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو''۔

احادیث کو لکھنے سے حضور ﷺ نے منع فرما دیا تھا تاکہ کہیں اللہ اور رسولؐ کا کلام گڈمڈ نہ ہو جائے' صرف قرآن مجید کو ہی لکھنے کا حکم دیا۔ لیکن اصل قرآن اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے سینے میں جمع کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ ؓ کے سینوں میں جمع کر دیا۔ وہ قول سے قول کی شکل میں گیا ہے' لوگوں نے حضور ﷺ کے دہن مبارک سے سیکھا ہے۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ کے دور میں لکھا ہوا قرآن بھی تھا لیکن کتابی شکل میں جمع شدہ نہیں تھا۔ جمع شدہ شکل میں صرف سینوں میں تھا' حفاظؔ کو یاد تھا۔ انہیں یاد تھا کہ قرآن اس ترتیب کے ساتھ ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صحیح روایات کے مطابق ہر رمضان المبارک میں جتنا قرآن اُس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا' حضور ﷺ اور حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کا دور کرتے تھے' جیسا کہ ہمارے ہاں رمضان کے آنے سے پہلے حفاظؔ دَور کرتے ہیں' ایک حافظ سناتا ہے' دوسرا سنتا ہے تاکہ تراویح میں سنانے کے لیے تازہ ہو جائے۔ تو رمضان المبارک میں حضور ﷺ اور حضرت جبرائیلؑ مذاکرہ کرتے تھے' قرآن مجید کا دَور ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کی زندگی کے آخری رمضان میں آپؐ نے حضرت جبرائیلؑ سے قرآن مجید کا دو مرتبہ مکمل دَور کیا۔ چنانچہ جہاں تک حافظے میں اور سینے میں قرآن کا مدوّن ہو جانا ہے وہ تو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہؔ کے دوران مکمل ہو گیا تھا۔

تدوینِ قرآن کا دوسرا مرحلہ حضرت ابوبکر ؓ کے عہدِ خلافت میں آیا جب مرتدین اور مانعین زکوٰۃ سے جنگیں ہوئیں۔ جنگ یمامہ میں تو بہت بڑی تعداد میں صحابہ ؓ شہید ہوئے۔ یہ بڑی خون ریز جنگ تھی اور اس میں کثیر تعداد میں حفاظِ قرآن شہید ہو گئے تو تشویش پیدا ہوئی اور یہ خیال آیا کہ اس قرآن کو اب کتابی شکل میں جمع کر لینا چاہیے۔ یہ خیال سب سے پہلے حضرت عمر ؓ کے دل میں آیا۔ حضرت عمر ؓ نے یہ بات حضرت ابوبکر ؓ سے کہی تو وہ بڑے متردد ہوئے کہ میں وہ کام کیسے کروں جو حضور ﷺ نے نہیں کیا! لیکن حضرت عمر ؓ اصرار کرتے رہے اور رفتہ رفتہ حضرت ابوبکر ؓ کو بھی اس پر انشراحِ صدر ہو گیا۔ انہوں نے حضرت عمر ؓ سے کہا کہ اب تمہاری اس بات کے لیے اللہ نے میرے سینے کو کشادہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری حضرت زید بن ثابت ؓ پر ڈالی گئی جو حضور ﷺ کے زمانے میں کاتبِ وحی تھے۔ آپ ﷺ کے چند خاص صحابہ جو کتابتِ وحی پر مامور تھے' ان میں حضرت زید بن ثابتؓ بہت معروف تھے۔ ان سے حضرت ابوبکر ؓ نے فرمایا کہ تم یہ کام کرو' اور ان کے ساتھ کچھ اور صحابہ کی ایک کمیٹی تشکیل دے دی۔ وہ بھی پہلے بہت متردد رہے۔ ان کی دلیل بھی یہ تھی کہ جو کام حضور ﷺ نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں! علاوہ ازیں یہ تو پہاڑ جیسی ذمہ داری ہے' یہ میں کیسے اٹھاؤں! لیکن جب حضرات ابوبکر اور عمر ؓ دونوں کا اصرار ہوا تو ان کا بھی سینہ کھل گیا۔ پھر جن صحابہؓ کے پاس قرآن حکیم کا جو حصہ بھی لکھی ہوئی شکل میں تھا' ان سے لیا گیا اور مختلف شہادتوں اور حُفاظؔ کی مدد سے عہدِ صدیقی میں قرآن پاک کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیا گیا۔ یاد رہے کہ ایک کتاب کی شکل میں بھی قرآن مجید کی تدوین رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے دو سال کے اندر اندر مکمل ہوگئی۔ حضرت ابوبکر ؓ کا عہدِ خلافت کل سوا دو برس ہے۔

حضرت ابوبکر ؓ کی مجلس شوریٰ میں یہ مسئلہ بھی زیرِ غور آیا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تو قرآن ایک جلد کے مابین جمع

نہیں کیا گیا' لہٰذا اس کا نام کیا رکھا جائے! ایک تجویز یہ آئی کہ اسے بھی انجیل کا نام دیا جائے۔ ایک رائے یہ دی گئی کہ اس کا نام ''سفر'' ہو' اس لیے کہ سفر کا لفظ تورات کی کتابوں کے لیے معروف چلا آ رہا تھا' جیسے سفر ایوب ایک کتاب تھی۔ تو سفر کتاب کو کہتے ہیں جس کی جمع ''اَسفار'' ہے اور یہ لفظ قرآن میں بھی آیا ہے۔ سفر کا لفظی مطلب ہے روشنی دینے والی۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے تجویز پیش کی کہ اس کا نام ''مصحف'' ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میرا آنا جانا حبشہ ہوتا ہے' وہاں کے لوگوں کے پاس ایک کتاب ہے اور وہ اسے مصحف کہتے ہیں۔ اب ''مصحف'' کے لفظ پر اتفاق واجماع ہو گیا۔ چنانچہ قرآن کے لیے حضرت ابوبکر ؓ کے عہد خلافت میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی تجویز پر مصحف نام رکھا گیا اور اس پر لوگوں کا اجماع ہوا۔ َتدوین قرآن کا یہ دوسرا مرحلہ ہے۔

قرآن حکیم کی تلاوت کے ضمن میں ایک معاملہ چلا آ رہا تھا' جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا تھا۔ عربوں کی زبان تو ایک تھی لیکن بولیاں مختلف تھیں' الفاظ کے لہجے مختلف تھے۔ تو سب لوگوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے لہجے کے اندر قرآن پڑھ لیا کریں تاکہ سہولت رہے' ورنہ بڑی مشقت کی ضرورت تھی کہ سب لوگ اپنے لہجے بدلیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلابیّ جدوجہد کا tempo اتنا تیز تھا کہ ان کاموں کے لیے زیادہ فرصت نہیں تھی کہ اس کے لیے باقاعدہ ادارے قائم ہوں' مختلف جگہوں سے لوگ آئیں اور اپنا لہجہ بدل کر قریش کے لہجے کے مطابق کریں' حجازی لہجہ اختیار کریں۔ چنانچہ اجازت دی گئی تھی کہ اپنے اپنے لہجوں میں پڑھ لیں۔ مختلف لہجوں میں پڑھنے کے ساتھ کچھ لفظی فرق بھی آنے لگے۔ حضرت عثمان ؓ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے نوبت یہ آ گئی کہ مختلف لہجوں میں لفظی فرق کے ساتھ بھی قرآن پڑھا جانے لگا۔ کوئی شخص قرآن پڑھ رہا ہوتا' دوسرا کہتا کہ یہ غلط پڑھ رہا ہے' یہ یوں نہیں ہے' جیسے میں پڑھ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ اس پر اس جذباتی قوم کے اندر تلواریں نکل آتی تھیں۔ اندیشہ ہوا کہ اگر اس طرح سے یہ بات پھیل گئی تو قرآن کا کوئی ایک ٹیکسٹ متفق علیہ نہیں رہے گا۔ اُمت کو جمع کرنے والی شے تو یہ قرآن ہی ہے' اس میں لفظی فرق کے نتیجے میں دائمی افتراق وانتشار پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عثمان ؓ نے صحابہ ؓ کے مشورے سے طے کیا کہ قرآن کا ایک ٹیکسٹ تیار کیا جائے۔ اس ٹیکسٹ کے لیے لفظ ''رسم'' ہے۔ رسم الخط کا لفظ ہم استعمال کرتے ہیں۔ ''اب ت'' حروف ہیں' لیکن عربی میں لکھے جائیں گے تو ان کا رسم الخط کچھ اور ہے' اردو میں لکھے جائیں گے تو ان کی شکل اور ہے۔ حضرت عثمان ؓ نے ایک رسم الخط اور ایک ٹیکسٹ پر قرآن جمع کیا۔ انہوں نے بھی ایک کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی کو یہ حکم دے دیا گیا کہ تمام لہجوں کو رد کر کے قریش کے لہجہ پر قرآن کا ٹیکسٹ تیار کیا جائے جو متفق علیہ ٹیکسٹ ہو گا۔ چنانچہ اس کمیٹی نے بڑی محنت شاقہ سے اس کام کی تکمیل کی۔ اس طرح قرآن کا رسم الخط معین ہو گیا اور ایک متفق علیہ ٹیکسٹ وجود میں آ گیا۔ رسمِ عثمانی کے مطابق سورۃ الفاتحہ میں ''ملک یوم الدین'' لکھا جائے گا' لکھنے کی شکل یہ نہیں ہو گی: ''مالک یوم الدین''. ایک قراءت میں چونکہ مَلِکِ بھی ہے تو ''ملک'' کو ''مٰلِکِ'' بھی پڑھا جا سکتا ہے اور ''مَلِکِ'' بھی۔ تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو حضرت عثمان ؓ نے صحابہ ؓ کے مشورے سے سرانجام دیا کہ قرآن کا ایک رسم الخط معین ہو گیا اور مصاحف عثمان ؓ تیار ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق اس کی چار نقول تیار کی گئیں' بعض روایات کے مطابق پانچ اور بعض میں سات کا عدد بھی ملتا ہے۔ ان میں سے ایک مصحف official version کے طور پر مدینے میں رکھا گیا اور باقی نقلیں مکہ مکرمہ' دمشق' کوفہ' یمن' بحرین اور بصرہ کو بھیج دی گئیں۔ ان میں سے کوئی کوئی نقل اب بھی موجود ہے۔ ترکی اور تاشقند میں وہ ''مصاحفِ عثمانی'' موجود ہیں جو حضرت عثمان ؓ نے تیار کرائے تھے۔

یہاں ایک اہم بات توجہ طلب ہے کہ ہمارے ہاں خطباتِ جمعہ میں بعض خطیب یہ جملہ پڑھ جاتے ہیں: ''جامعُ آیاتِ القرآن عثمان بن عفان ؓ''۔ یہاں ہم قافیہ الفاظ جمع کر کے صوتی آہنگ کے ساتھ ایک خاص انداز پیدا کیا گیا ہے' لیکن یہ الفاظ اس قدر غلط اور اتنے گمراہ کن ہیں کہ اس سے یہ تصوّر پیدا ہوتا ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کو سب سے پہلے حضرت عثمان ؓ نے جمع کیا۔ یہ بات قرآن پر سے اعتماد کو ہٹا دینے والی ہے۔ آیاتِ قرآنیہ تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جمع ہو چکی تھیں' سورتیں حضورؐ کے زمانے میں وجود میں آ چکی تھیں' سورتوں کی تدوین ہی نہیں ترتیب بھی حضور ﷺ کے زمانے میں عمل میں آ چکی تھی۔ کتابی شکل میں قرآن ابوبکر ؓ کے زمانے میں جمع ہوا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں دس پندرہ سال کا فصل ہے۔ اگر ''جامعُ آیاتِ القرآن'' حضرت عثمان ؓ کو قرار دیا جائے تو کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن کی تدوین حضور ﷺ کے پندرہ یا بیس برس بعد ہوئی ہے۔ حضرت عثمانؓ کا عہدِ خلافت بارہ برس ہے اور حضور ﷺ کے انتقال کے ۲۴ برس بعد ان کا انتقال ہوا۔ تو اس طرح قرآن کے متن (text) کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے جا سکتے ہیں' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان ؓ آیاتِ قرآنی کے جمع کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اُمت کو قرآن کے ایک ٹیکسٹ اور رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ اسی لیے آج دنیا میں جو مصحف موجود ہے یہ ''مصحف عثمان'' کہلاتا ہے۔ اس کا نام ''مصحف'' حضرت ابوبکر ؓ نے رکھا تھا اور مصحف عثمان میں رسم الخط اور ٹیکسٹ معین ہو گیا کہ اب قرآن اسی طریقے سے لکھا جائے گا اور یہی پوری دنیا کے اندر official ٹیکسٹ ہے۔

ہمارے ہاں اکثر وبیشتر قرآن پاک کی اشاعت کے ادارے رسم عثمانی کا پورا اہتمام نہیں کرتے اور اس اعتبار سے ان میں رسم کی غلطیاں بھی آ جاتی ہیں' اس لیے کہ ان کے سامنے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں یعنی کم خرچ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش —— لیکن اب سعودی حکومت نے اس کا اہتمام کر کے بڑی نیکی کمائی ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کے حوالے سے ایک نیکی مصر نے کمائی تھی۔ جب اسرائیل نے قراءتِ قرآن مجید کے اندر تحریف کر کے اس کو عام کرنے کی کوشش کی تو حکومت مصر نے اپنے چوٹی کے قرّاء' قاری محمود خلیل حُصری اور عبدالباسط عبدالصمد سے پورا قرآن مجید مختلف قراءتوں میں تلاوت کرایا اور ان کے کیسٹس تیار کر کے دنیا میں پھیلا دیئے کہ اب گویا وہ ریفرنس کا کام دیں گے۔ ان کے ہوتے ہوئے اب کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس طرح قراءت کے حوالے سے قرآن میں کوئی تحریف کر سکے۔ اسی طرح سعودی عرب کی حکومت نے کروڑوں روپے کے خرچ سے بہت بڑی فاؤنڈیشن بنائی ہے' جس کے زیر اہتمام بڑے عمدہ آرٹ پیپر پر عالمی معیار کی بڑی عمدہ جلد کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں یہ قرآن مجید چھاپے جا رہے ہیں' جو حضرت عثمان ؓ کے معیّن کردہ رسم

الخط کے مطابق ہیں۔

بہر حال حضرت عثمانؓ ''جامع آیات القرآن'' کی بجائے ''جامع الاُمّۃِ علٰی رسمٍ واحدٍ'' یعنی اُمت کو قرآن حکیم کے ایک رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ یہ تدوین بھی حضورﷺ کے انتقال کے ۲۴ برس کے اندر مکمل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا مانتی ہے اور تمام مستشرق مانتے ہیں کہ جتنا خالص متن (pure text) قرآن کا دنیا میں موجود ہے' کسی دوسری کتاب کا موجود نہیں ہے۔ یہ بات ''الفضل ما شھدت بہ الاعداء'' کا مصداق ہے' یعنی فضیلت تو وہ ہے جس کو دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے اور یہ کسی شے کی حقانیت کے لیے آخری ثبوت ہوتا ہے۔ پس یہ بات پوری دنیا میں مسلّم ہے کہ قرآن حکیم کا ٹیکسٹ محفوظ ہے یا جتنا محفوظ ٹیکسٹ قرآن کا ہے اتنا اور کسی کتاب کا نہیں ہے۔ یعنی قراءات کے فرق بھی ریکارڈ پر ہیں' سبعہ قراءات اور عشرہ قراءات ریکارڈ پر ہیں' ان میں بھی ایک ایک حرف کا معاملہ مدوّن ہے کہ فلاں قراءت میں یہ لفظ زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے یا زیر کے ساتھ۔ اور یہ تمام official قراءات ہیں۔ باقی جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے اس کا ٹیکسٹ حضرت عثمانؓ نے معین کر دیا۔ اُمتِ مسلمہ پر یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ قرآن حکیم کی compilation اور اس کی تدوین کے متعلق یہ چیزیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔ یہ حقائق سامنے نہ ہوں تو کچھ لوگ ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کر سکتے ہیں۔

❁❁❁

باب پنجم

قرآن مجید کا موضوع

اب ہم اگلی بحث پر آتے ہیں کہ قرآن کا موضوع کیا ہے۔ کیا قرآن فلسفہ کی کتاب ہے؟ کیا یہ سائنس کی کتاب ہے؟ کیا یہ جیالوجی یا فزکس کی کتاب ہے؟ کس قسم کی کتاب ہے؟ تو پہلی بات یہ سمجھئے کہ قرآن کا موضوع ہے انسان — لیکن انسان کی اناٹومی' اس کی فزیالوجی یا anthropology نہیں' بلکہ انسان کی ہدایت۔ یہ ہدایت کا لفظ قرآن مجید کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ البقرۃ کے شروع ہی میں فرمایا: ﴿ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۝۲﴾ پھر اس کے وسط میں ارشاد ہوا: ﴿ھُدًی لِّلنَّاسِ﴾ یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت۔ سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿ھُدًی وَّرَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝۵۷﴾۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿ھُدًی وَّرَحۡمَۃً لِّلۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝۳﴾۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۹۷) اور سورۃ النمل (آیت ۲) میں ﴿ھُدًی وَّبُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝﴾ جبکہ سورۂ آل عمران میں ﴿ھُدًی وَّمَوۡعِظَۃٌ لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۝۱۳۸﴾ اور سورۃ المائدۃ میں ﴿ھُدًی وَّمَوۡعِظَۃً لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۝۴۶﴾ کے الفاظ آئے۔ معلوم ہوا کہ ''ھُدًی'' کا لفظ قرآن حکیم کے لیے کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ پھر یہ صرف نکرہ نہیں' ''ال'' کے ساتھ معرفہ بن کر بھی کئی جگہ آیا ہے۔ تین مرتبہ تو اِس آیت مبارکہ میں آیا جو رسول اللہﷺ کے مقصدِ بعثت کو بیان کرتی ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصّف:۹) ھُدًی نکرہ تھا' اَلۡھُدٰی معرفہ ہو گیا۔ یعنی ہدایتِ کاملہ' ہدایتِ تامہ' ہدایتِ ابدی۔ اسی طرح سورۃ النجم میں فرمایا: ﴿وَلَقَدۡ جَآءَھُمۡ مِّنۡ رَّبِّھِمُ الۡھُدٰی ۝۲۳﴾۔ سورۃ الجن کا آغاز جنات کی ایک جماعت کے اس قول ﴿اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۝۱﴾ سے ہوتا ہے۔ آگے چل کر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعۡنَا الۡھُدٰۤی اٰمَنَّا بِہٖ ؕ﴾ (آیت ۱۳) گویا سورۃ الجن نے معین کیا کہ ''قُرۡاٰنًا عَجَبًا'' اور ''اَلۡھُدٰی'' مترادف الفاظ ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں آیا ہے: ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَھُمُ الۡھُدٰی﴾ (بنی اسرائیل:۹۴' الکہف:۵۵)۔ ''کیا شے ہے جو لوگوں کو ایمان لانے سے روکتی ہے جبکہ اُن کے پاس الہدیٰ آیا ہے؟'' تو گویا قرآن کا

موضوع ہے انسان کی ہدایت۔

اب یہ بات ذہن میں رکھئے کہ انسان کے علم کے دو گوشے ہیں‘ علمِ انسانی دو حصوں ّمیں منقسم ہے۔(مشہور کہاوت ہے: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ : عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْیَانِ)ایک حصہ ہے مادی دنیا (Physical World) کا علم‘ مادی حقائق کا علم‘ جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دیکھنا‘ سننا‘ سونگھنا‘ چکھنا‘ چھونا ہمارے حواسِ خمسہ ہیں۔ یہ تمام صلاحیتیں ہیں جن سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور عقل کا کمپیوٹر اِن کو پراسیس کرتا ہے‘ ان سے نتائج نکالتا ہے اور انہیں سٹور کر لیتا ہے۔ پھر حواس کے ذریعہ سے مزید کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں تو اب ان کو بھی وہ پراسیس کر کے اپنے سابقہ ’’memory store ‘‘ کے ساتھ ہم آہنگ کر کے کوئی اور نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ انسان کا یہ علم بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ابھی اور کہاں تک جائے گا۔ آج سے سو سال پہلے بھی انسان تصور نہیں کر سکتا تھا کہ انسانی علم وہاں پہنچ جائے گا جہاں آج پہنچ چکا ہے۔ یہ علم بالحواس والعقل ہے اور اس علم کا وحی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق اس علمِ اَسماء سے ہے جو بالکل شروع میں حضرت آدم علیہ السلام میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور یہی دنیا میں سربلندی کی بنیاد ہے۔

علمِ انسانی کے دو گوشوں کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کا چوتھا رکوع بہت اہم ہے۔ علم الاسماء کا ذکر اس کے شروع میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں کی طرف سے یہ بات استفہاماً پیش کی گئی: ﴿اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ ج﴾ (آیت ۳۰) ’’کیا آپ اس کو زمین میں خلیفہ بنائیں گے جو اِس میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا؟‘‘ فرشتوں کا یہ اشکال اس طرح دُور کیا گیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا﴾ (آیت ۳۱) ’’اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیے‘‘۔ یہ علمِ اسماء جو آدم کو دیا گیا‘ یہی حکومتِ ارضی کی بنیاد ہے۔ جو قوم اِس علم کے اندر ترقی کرے گی وہی اقتدارِ ارضی کی حق دار ٹھہرے گی۔ البتہ اس رکوع کے آخر میں فرمایا گیا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہو گئی اور شیطان کے اغوا سے متاثرّ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہو گئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کا بایں طور اعلان کر دیا: ﴿فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْہِ ط﴾ (آیت ۳۷) اس کے بعد ذکر ہے کہ جب آدم اور حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا کہ اب زمین میں جا کر رہو اور وہاں کا چارج سنبھالو تو فرمایا: ﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ’’تو جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا‘‘۔ وہ علمِ ہدایت ہے۔

یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ علمِ اَسماء درحقیقت یوں سمجھئے کہ جیسے آم کی گٹھلی میں آم کا پورا درخت ہوتا ہے۔ وہی گٹھلی تو ہے جو آپ زمین میں دباتے ہیں۔ پھر اگر وہاں پانی پڑتا ہے اور زمین میں روئیدگی کی صلاحیت بھی ہے تو وہ گٹھلی پھٹے گی۔ اس میں سے جو دو پتے نکلیں گے وہ پھلیں پھولیں گے‘ پروان چڑھیں گے تو درخت بنے گا۔ وہ پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوۃ (potentially) موجود تھا‘ البتہ اسے بالفعل (actually) پورا درخت بننے میں تین چار سال لگیں گے۔ تو جس طرح پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوہ موجود تھا لیکن وہ آم کا درخت کئی سال کے اندر بالفعل وجود میں آیا‘ بعینہٖ یہ معاملہ کل مُادی حقائق کا ہے کہ اس ضمن میں کل علم حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں بالقوۃ (potentially) ودیعت کر دیا گیا! اب اس کی exfoliation ہو رہی ہے‘ وہ بڑھتا جا رہا ہے‘ برگ و بار لا رہا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ اس علم کا کوئی تعلق آسمانی ہدایت سے نہیں ہے۔ اب یہ خودرَو پودا ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے‘ اور معلوم نہیں کہاں تک پہنچے گا۔ علامہ اقبال نے اس کی صحیح تعبیر کی ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ ِکامل نہ بن جائے!

علامہ کی زندگی میں تو انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا تھا‘ لیکن اب انسان چاند پر قدم رکھ کر آ گیا ہے۔ مزید یہ کہ اب تو جنیٹک انجینئرنگ اپنے کمالات دکھا رہی ہے۔ کلوننگ کے طریقے سے حیوانات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ اس انسانی علم کے ساتھ اگر علمِ وحی یعنی علمِ ہدایت نہ ہو تو یہ علم بجائے خیر کے شر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ آج یہ علم واقعتاً شیطانی قوت بن چکا ہے‘ ہلاکت کا سامان بن چکا ہے‘ تباہی کا ذریعہ بن چکا ہے۔

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی﴾ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ارتقائی مراحل طے کیے۔ جیسے جیسے نوعِ انسانی شعور کی منزلیں طے کرتی گئی‘ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت میں بھی اضافہ ہوتا گیا‘ تا آنکہ یہ علمِ ہدایت قرآن حکیم میں آ کر ’’اَلْھُدٰی‘‘ (Final Guidance) کی صورت میں مکمل ہو گیا۔ اس ہدایت میں جو ارتقا ہوا ہے اسے بھی آپ سمجھ لیجئے۔ پہلی کتابیں جو نازل ہوئیں ان میں بھی ھُدًی تو تھی۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىۃَ فِیْھَا ھُدًی وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۴) ’’ہم نے تورات نازل کی تھی‘ اس میں ہدایت بھی تھی نور بھی تھا‘‘۔ اسی رکوع میں (سورۃ المائدۃ کا ساتواں رکوع) انجیل کے بارے میں فرمایا: ﴿فِیْہِ ھُدًی وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۶) ’’اس میں بھی ہدایت بھی تھی نور بھی تھا‘‘۔ لیکن یہ ہدایت اور نور درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہا ہے‘ یہاں تک کہ قرآن میں آ کر یہ کامل ہوا ہے اور اَلْھُدٰی بن گیا ہے۔ اب یہ ھُدًی نہیں‘ اَلْھُدٰی ہے‘ یعنی ہدایتِ تامہّ۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ دیکھئے ایک بچے کو اگر آپ تعلیم دینا چاہتے ہیں تو اس کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھے بغیر نہیں دے سکتے۔ آپ پرائمری میں زیرِتعلیم کسی بچے کے لیے چاہے پی ایچ ڈی استاد رکھ دیں‘ لیکن وہ استاد بچے کی ذہنی استعداد کی مناسبت سے ہی اسے تعلیم دے سکے گا۔ بچہ رفتہ رفتہ آگے بڑھے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی عقل اور شعور کی پوریّ شدت‘ قوت اور بلوغت کو پہنچ جائے گا تب اسے آخری علم پڑھایا جائے گا۔ پہلے وہ تاریخ پڑھ رہا تھا‘ اب فلسفۂ تاریخ پڑھے گا۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت تدریج کے ساتھ اتاری ہے۔ تورات میں صرف احکام ہیں‘ حکمت ہے ہی نہیں‘ جبکہ انجیل میں حکمت ہے‘ احکام ہیں ہی نہیں۔ دونوں چیزیں مل کر ایک بات کو مکمل کرتی ہیں۔ تورات میں صرف احکام ہیں۔ جیسے آپ بچے کو بتا دیتے ہیں کہ بھئی کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے‘ روزے کا مطلب یہ ہے کہ اب دن بھر کھانا پینا کچھ نہیں ہے۔

چاہے بچہ ابھی چھ سات سال کا ہے‘ وہ یہ بات سمجھ لیتا ہے۔اس طرح اسے احکام تو دے دیے جائیں گے کہ یہ کرو‘ یہ نہ کرو‘ یہ Do's ہیں یہ Donts ہیں۔

چنانچہ تورات میں احکامِ عشرہ (The Ten Commandments) دے دیے گئے‘ لیکن ابھی ان کی حکمت نہیں بتائی گئی۔اس لیے کہ ابھی حکمت کا تحمل انسان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ابھی نوعِ انسانی کا عہدِ طفولیت تھا۔یوں سمجھئے کہ وہ آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل کا انسان تھا۔تورات چودہ سو قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔اس کے چودہ سو سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی گئی‘ جس میں صرف حکمت ہے‘ احکام ہیں ہی نہیں۔لیکن آج سے دو ہزار سال پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کے یہ الفاظ انجیل میں موجود ہیں (اب بھی موجود ہیں) کہ آپؑ نے اپنے حواریین سے فرمایا تھا: ”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی تھیں‘ مگر ابھی تم ان کا تحمل نہیں کر سکو گے‘ جب وہ فارقلیط آئے گا تو تمہیں سب کچھ بتائے گا“۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی تھی۔حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ ابھی تم تحمل نہیں کر سکتے۔گویا تمہاری ذہنی بلوغت کے لیے چھ سو برس مزید درکار ہیں۔ چنانچہ الہدیٰ قرآن حکیم میں آ کر مکمل ہوا ہے۔

قرآن مجید جو ہدایت دیتا ہے اس کے بھی دو حصے ہیں۔ایک فکر و نظر کی ہدایت ہے‘ جس کا عنوان ”ایمان“ ہے۔اس کا موضوع وہی ہے جو فلسفے کا ہے۔یعنی کائنات کی حقیقت کیا ہے‘ زندگی کی حقیقت کیا ہے‘ زندگی کا مآل کیا ہے‘ اس کا آغاز کیا ہے‘ انجام کیا ہے‘ صحیح کیا ہے‘ غلط کیا ہے‘ خیر کیا ہے‘ شر کیا ہے‘ علم کیا ہے؟ قرآن مجید کا دوسرا موضوع ہدایتِ عملی ہے‘ انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔یہ اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے احکام پر مشتمل ہے۔پھر اس میں معاشی و معاشرتی احکام بھی ہیں۔ یہ ہدایتِ فکر و نظر اور ہدایتِ فعل و عمل (انفرادی و اجتماعی) قرآن حکیم کا موضوع ہے۔

اس ضمن میں یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی قرآن حکیم کا موضوع نہیں ہے‘ قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے‘ سائنس کی کتاب نہیں ہے‘ البتہ اس میں سائنسی علوم کی طرف اشارے موجود ہیں اور ان کے حوالے موجود ہیں۔قرآن مجید کائناتی حقائق کو آیاتِ الٰہیہ قرار دیتا ہے۔سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ ملاحظہ کیجیے‘ جسے میں ”آیت الآیات“ قرار دیتا ہوں:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ وَالۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَبَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾﴾

”یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں‘ رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں‘ اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں‘ بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے‘ پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے‘ ہواؤں کی گردش میں‘ اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں‘ ان لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں“۔

یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ان میں اللہ کی قدرت‘ اللہ کی عظمت‘ اللہ کا علمِ کامل‘ اللہ کی حکمتِ بالغہ سب کچھ شامل ہے۔تو یہ جو مظاہرِ طبیعی (Physical phenomena) ہیں‘ قرآن حکیم ان کا جا بجا حوالہ دیتا ہے۔بعض کائناتی حقائق وہ ہیں جن کا تعلق فلکیات (Astronomy) سے ہے۔فرمایا: ﴿وَکُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۴۰﴾﴾ یعنی یہ تمام اجرامِ سماویہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔معلوم ہوا ہر شے حرکت میں ہے۔انسان پر ایک دَور ایسا گزرا ہے جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد حرکت کر رہا ہے۔پھر ایک دَور آیا جس میں کہا گیا کہ نہیں‘ سورج ساکن ہے‘ زمین حرکت کرتی ہے‘ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے‘ اور آج ہمیں معلوم ہوا کہ ہر شے حرکت میں ہے۔سورج کا بھی اپنا ایک مدار ہے‘ اس میں وہ اپنے پورے کنبے سمیت حرکت کر رہا ہے۔یہ نظامِ شمسی اس کا کنبہ ہے‘ اس پورے کنبے کو لے کر وہ بھی ایک مدار میں حرکت کر رہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ الفاظِ قرآنی: ﴿کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۴۰﴾﴾ میں ”کُلٌّ“ کا لفظ جس طرح منقح اور مبرہن ہو کر‘ جس شان کے ساتھ آج ہویدا ہوا ہے‘ آج سے پہلے انسان کو معلوم نہیں تھا۔قرآن مجید میں کائناتی مظاہر کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔یہ وہ حقیقت ہے جو اِس دَور میں آ کر پوری طرح واضح ہوئی ہے۔

ڈاکٹر موریس بوکائی ایک فرانسیسی سرجن تھے۔انہوں نے قرآن اور بائبل دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔واضح رہے کہ بائبل سے مراد عہد نامہ قدیم (Old Testament) اور عہد نامہ جدید (New Testament) دونوں ہیں۔تقابلی مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ پورے قرآن میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے ہمارے سائنسی انکشافات میں سے کسی نے غلط ثابت کیا ہو‘ جب کہ تورات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ سائنس انہیں غلط ثابت کر چکی ہے۔اس پر انہوں نے ۲۵۰ صفحات کی کتاب تحریر کی: ”The Bible, The Quran and Science“۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ تورات بھی تو اللہ کی کتاب ہے‘ پھر اس میں ایسی چیزیں کیوں آ گئیں جو سائنسی حقائق کے خلاف ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی جب بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی ہوئی تھی۔اس کے ڈیڑھ سو برس بعد کچھ لوگوں نے تورات کو یادداشتوں سے مرتّب کیا۔لہٰذا اُس وقت انسانی علم کی جو سطح تھی اس کے اعتبارات سے تاویلات تورات میں شامل ہو گئیں‘ کیونکہ انسان تو اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی سوچ سکتا ہے۔تورات میں تحریف ہونے کی وجہ سے اِس میں ایسی چیزیں در آئیں جو سائنس کی رو سے غلط ثابت ہوئیں۔البتہ قرآن میں ایسی کوئی تاویل نہیں ہوئی اور اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔یہ بات بڑی اہم ہے۔اس کو بڑے خوبصورت انداز میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کہا ہے کہ یہ کائنات اللہ کا فعل ہے۔اس کی تخلیق اور اس کی تدبیر ہے‘ جبکہ قرآن اللہ کا قول ہے‘ اور اللہ تعالیٰ کے قول و عمل میں تضاد ممکن نہیں ہے۔کسی انسان کے قول و عمل میں بھی اگر کوئی تضاد ہو تو وہ انسانیت کی سطح سے نیچے اتر جاتا ہے‘ اللہ تعالیٰ کے قول اور عمل میں تضاد کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دَور میں انسانوں نے بات سمجھی نہ ہو‘ اُن کا ذہن وہاں تک پہنچا نہ ہو‘ ان کی معلومات کا دائرہ ابھی اس حد تک ہو کہ ان حقائق تک نہ پہنچا جا سکے۔لیکن جیسے جیسے وقت آئے گا مزید حقائق منکشف ہوں گے اور یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح سے واضح تر ہوتی چلی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے فرمایا ہے وہی برحق ہے۔ہاں آج سے پہلے انسانی ذہن اِس حد تک رسائی حاصل کرنے کا اہل نہیں تھا۔سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آخری سے پہلی آیت ذہن میں رکھیے:

﴿سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ﴾

''ہم انہیں دکھاتے چلے جائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود اُن کی جانوں میں بھی' یہاں تک کہ یہ بات پوری طرح نکھر کر اُن کے سامنے واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن ہی حق ہے۔''

ڈاکٹر کیتھ ایل مُور کینیڈا کے بہت بڑے ایمبر یالوجسٹ ہیں۔ان کی کتاب علم جنین (Embriology) میں سند مانی جاتی ہے اور یونیورسٹی کی سطح پر بطور ٹیکسٹ بک پڑھائی جاتی ہے۔انہوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آج سے چودہ سو برس قبل جبکہ نہ مائیکروسکوپ موجود تھی اور نہ ہی dissection ہوتا تھا' قرآن نے علم جنین کے متعلق جو معلومات دی ہیں وہ صحیح ترین حقائق پر مشتمل ہیں۔ڈاکٹر موصوف سورۃ المؤمنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ کا مطالعہ کرتے ہوئے انگشت بدنداں ہیں:

﴿وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَکَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ٭ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ﴾

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا' پھر اُس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا' پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔''

ان کا کہنا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ انسانی تخلیق کے مراحل کی اس سے زیادہ صحیح تعبیر ممکن نہیں ہے۔تو یہ حقیقت ذہن میں رکھیے کہ اگرچہ قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے' لیکن جن سائنسی حقائق یا سائنسی مظاہر (phenomena) کا قرآن نے حوالہ دیا ہے وہ یقیناً حق ہیں' چاہے تا حال ہم ان کی حقانیت کو نہ سمجھ پائے ہوں۔مثلاً آج بھی مجھے نہیں معلوم کہ قرآن جو ''سات آسمان'' کہتا ہے تو اِن سے کیا مراد ہے۔لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب انسان سمجھے گا کہ ''سات آسمان'' کے یہ الفاظ ٹھیک ٹھیک اس حقیقت پر منطبق ہوتے ہیں جو آج ہمارے علم میں آئی ہے' پہلے نہیں آئی تھی۔البتہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' عملی اعتبار سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن سائنس یا ٹیکنالوجی کی کتاب نہیں ہے اور اس حوالے سے ایک بڑا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ہمارے اسلاف نے اپنے دَور کی معلومات کی سطح پر قرآن کی ان آیات کا کوئی خاص مفہوم معین کیا تو ہمارے لیے لازم نہیں ہے کہ ہم اس کی پیروی کریں۔ہم قرآن میں بیان کردہ سائنسی مظاہر کو اس سائنسی ترقی کے حوالے سے سمجھیں گے جو روز بروز ہو رہی ہے۔یہاں تک کہ آخری بات عرض کر رہا ہوں کہ اس معاملے میں خود محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی اگر کوئی بات منقول ہو تو وہ بھی قطعی نہیں سمجھی جائے گی' کیونکہ حضور ﷺ یہ چیزیں سکھانے کے لیے نہیں آئے تھے۔یہ بات اگرچہ بہت سے لوگوں پر ثقیل اور گراں گزرے گی لیکن صحیح طرزِ عمل یہی ہو گا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ضمن میں اگر حضور ﷺ کی کوئی حدیث بھی سامنے آ جائے تو اس کو بھی ہم دلیلِ قطعی نہیں سمجھیں گے۔

اس سلسلے میں تأبیرِ نخل کا واقعہ بہت اہم ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی پیدائش مکہ کی ہے' ہجرت تک ساری زندگی آپ نے وہاں گزاری' وہ وادیٔ غیر ذی زرع ہے' جہاں کوئی پیداوار' کوئی زراعت' کوئی کاشت ہوتی ہی نہیں تھی' لہٰذا آپؐ کو اس کا کوئی تجربہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ہاں تجارت کا بھرپور تجربہ تھا اور اس کے تمام اَسرار و رموز سے آپؐ واقف تھے۔آپؐ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ کھجوروں کے سلسلہ میں انصارِ مدینہ ''تأبیرِ نخل'' کا معاملہ کرتے تھے۔کھجور ایک ایسا پودا ہے جس کے نر اور مادہ پھول علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔اگر اس کے نر اور مادہ پھولوں کو قریب لے آئیں تو اس کے بار آور ہونے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔اہل مدینہ کو یہ بات تجربے سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اس پر عمل پیرا تھے۔مدینہ تشریف آوری پر رسول اللہ ﷺ نے جب اہل مدینہ کا یہ معمول دیکھا تو اُن سے فرمایا کہ اگر آپ لوگ ایسا نہ کریں تو کیا ہے؟ ایسا نہ کرنا شاید تمہارے حق میں بہتر ہو۔یہ بات آپ ﷺ نے اپنے اجتہاد اور فہم کے مطابق اس بنیاد پر فرمائی کہ فطرت اپنی دیکھ بھال خود کرتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے فطرت کا نظام انسانوں پر نہیں چھوڑا' بلکہ یہ تو خود کار نظام ہے۔چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ لوگ اس قدرتی نظام میں دخل نہ دیں تو کیا ہے؟ البتہ آپؐ نے روکا نہیں۔لیکن ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے حضور ﷺ کا اتنا کہنا بھی گویا حکم کے درجہ میں تھا۔انہوں نے اس سال وہ کام نہیں کیا' لیکن فصل کم ہو گئی۔اب وہ ڈرتے ڈرتے' جھجکتے جھجکتے حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ حضور! ہم نے اس مرتبہ تأبیرِ نخل نہیں کی تو فصل کم ہوئی ہے۔اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ بِاَمۡرِ دُنۡیَاکُمۡ))[1] اس حدیث کا ایک ایک لفظ یاد کر لیجیے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جو تمہارے اپنے دُنیوی اور مادی معاملات ہیں جن کی بنیاد تجربہ پر ہے' یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔تم زیادہ تجربہ کار ہو' تم ان حقائق سے زیادہ واقف ہو۔ایک دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ ' اِذَا اَمَرۡتُکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنۡ دِیۡنِکُمۡ فَخُذُوۡا بِهٖ ' وَاِذَا اَمَرۡتُکُمۡ بِشَیۡءٍ مِنۡ رَّأۡیِیۡ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ))[2] ''میں تو ایک بشر ہوں۔جب میں تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اس سے سرتابی نہ کرنا' لیکن جب میں تمہیں اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو جان لو کہ میں ایک بشر ہی ہوں''۔گویا آپ ﷺ نے واضح فرما دیا کہ میں یہ چیزیں سکھانے نہیں آیا' میں جو کچھ سکھانے آیا ہوں وہ مجھ سے لو!

اس اعتبار سے یہ حدیث بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ظاہر ہے آپؐ ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔آپؐ طب و جراحت سکھانے نہیں آئے تھے' آپؐ کوئی اور سائنس پڑھانے نہیں آئے تھے۔ورنہ تو ہم شکوہ کرتے کہ آپؐ نے ہمیں ایٹم بم بنانا کیوں نہیں سکھا دیا؟ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ ((اَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ بِاَمۡرِ دُنۡیَاکُمۡ)) تو ہمارے لیے یہ بات آخری درجے میں سند ہے کہ جیسے جیسے سائنسی انکشافات ہو رہے ہیں' جیسے جیسے علم انسانی کی exploration ہو رہی ہے' ویسے ویسے حقائقِ فطرت ہماری نگاہوں کے سامنے منکشف ہو رہے ہیں۔جیسے آم کی گٹھلی سے آم کا پورا درخت وجود میں آتا ہے ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں علم بالحواس اور علم بالعقل کا جو mechanism رکھ دیا گیا تھا' یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ علم پھیل رہا ہے۔

اس سے جو بھی چیزیں ہمارے سامنے آئیں ان میں کہیں رکاوٹ نہیں ہے کہ ہم سلف کی بات کو لے کر بیٹھ جائیں کہ سائنس خواہ کچھ بھی کہے ہم تو اسلاف کی بات مانیں گے۔ یہاں پر اس طرزِ عمل کے لیے کوئی دلیل اور بنیاد نہیں۔

قرآن کا اصل موضوع ایمان ہے۔ ماوراء الطبیعیاتی حقائق عالم غیب سے متعلق ہیں' جو ہمارے عالمِ محسوسات سے ماورا ہیں' جس کی خبریں ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہیں۔ علم حقیقت جسے ہم اجمالی طور پر ایمان کہتے ہیں یہ قرآن کا اصل موضوع ہے' یعنی ہدایتِ فکری وعملی۔ تمدنی میدان میں' معاشی واقتصادی اور معاشرتی میدان میں یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ یہ چیزیں کھانے پینے کی ہیں' یہ چیزیں کھانے پینے کی نہیں ہیں۔ یہ حرام ہیں' یہ نجس ہیں۔ یہ علم حضورﷺ نے دیا ہے اور قرآن کا موضوع اصل میں یہی ہے۔ البتہ قرآن میں جو سائنسی ریفرنسز آئے ہیں' وہ غلط نہیں ہیں' وہ لازماً درست ہیں۔

انسانی علم کے تین دائرے ہیں۔ ایک علم بالحواس ہے' یہ انسانی علم کا پہلا دائرہ ہے۔ حواس کے ذریعے ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں' جنہیں آج کل ہم sense data کہتے ہیں۔ آنکھ نے دیکھا' کان نے سنا' ہاتھ نے اس کی پیمائش کی۔ اس کے بعد دوسرا دائرہ علم بالعقل ہے۔ عقل sense data کو پراسیس کرتی ہے۔ اس ضمن میں استدلال اور استنباط کے اصول معیّن کیے گئے ہیں۔ انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے' پھر عقل ان معلومات کو process کرتی ہے تو انسان کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یوں عقل حواس کی محتاج ہوئی' لیکن عقل وحواس کے ماورا بھی ایک علم ہے جسے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے علم بالقلب کا نام دیا ہے۔ آج اسے extra sensory perceptions کہا جا رہا ہے۔ یہ علم کا تیسرا دائرہ ہے۔ اس سے پہلے ادب میں اس کے لیے وجدان (intuition) کا لفظ تھا۔ یہ علم بالقلب درحقیقت وہ خاص انسانی علم ہے جس سے آج کے مادہ پرست واقف نہیں ہیں۔ وحی کا تعلق اسی تیسرے دائرے سے ہے۔ اس لیے کہ وحی کا نزول قلب پر ہوتا ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلۡبِکَ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۹۴﴾﴾ (الشعراء)

عقل اور حواس سے حاصل ہونے والے علوم میں تمام فزیکل سائنسز' میڈیکل سائنسز اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل ہیں۔ انسان نے مختلف چیزوں کے خواص معلوم کیے' کچھ طبعی اور کیمیائی تبدیلیوں کے اصول دریافت کیے۔ پھر ان اصولوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کو استعمال کیا۔ اس سے انسان کی ٹیکنالوجی ترقی کرتی جا رہی ہے اور ابھی نا معلوم کہاں تک پہنچے گی۔ یہ ایک علم ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا﴾ کے الفاظ میں کر دیا گیا۔ البتہ انسان صرف اس علم پر قانع نہیں رہا' اس لیے کہ اس سے تو صرف جزوی علم حاصل ہوتا ہے' انسان ایک ایک جزو' قدم بقدم سیکھتا ہے۔ انسان کی ایک طلب (urge) ہے کہ وہ ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ میری حقیقت کیا ہے؟ علم کی حقیقت' خیر و شر کی حقیقت کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ آج سے ایک ہزار سال قبل کے انسان کی معلومات (علم بالحواس اور علم بالعقل کے اعتبار سے) بڑی محدود تھیں' لیکن اُس وقت کے انسان کو بھی اس چیز کی ضرورت تھی کہ وہ کوئی رائے قائم کرے کہ یہ کائنات جس کا میں ایک فرد ہوں' اس کی حقیقت کیا ہے' خود میری حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کا آغاز کیا ہے؟ میرا اس کے ساتھ ربط وتعلق کیا ہے؟ اس سفر کی منزل کیا ہے؟ میں اپنی زندگی میں کیا کروں' کیا نہ کروں؟ کیا کرنا صحیح ہے کیا کرنا غلط ہے؟ یہ انسان کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس ضرورت کے تحت جب انسان نے سوچنا شروع کیا تو فلسفہ کا آغاز ہوا جو گتھیوں کو سلجھانا چاہتا ہے۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے پھر انسان نے عقل کے گھوڑے دوڑائے' اپنی منطق کو استعمال کیا۔ فلسفہ' مابعد الطبیعیات' الٰہیات' اخلاقیات اور نفسیات' یہ تمام علوم انسانی علوم میں سے ہیں۔ گویا کہ علم بالحواس اور علم بالعقل کے نتیجے میں یہ دو علم وجود میں آئے۔ ایک فزیکل سائنسز کا علم جس کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہے' دوسرا سوشل سائنسز کا علم جس میں فلاسفی' سوشیالوجی' نفسیات' اخلاقیات' اقتصادیات اور سیاسیات وغیرہ شامل ہیں۔

جان لیجیے کہ ھُدًی جس کی تکمیلی شکل ''الھُدٰی'' قرآن مجید ہے' اس کا موضوع انسانی علم کا دائرۂ اوّل نہیں ہے۔ یہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی سائنس پڑھانے یا ٹیکنالوجی سکھانے آئی ہے۔ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے۔ اگرچہ قرآن حکیم میں سائنسی مظاہر کی طرف حوالے موجود ہیں اور وہ لازماً درست ہیں' لیکن وہ قرآن کا اصل موضوع نہیں ہے۔ جیسے جیسے انسان کے سائنسی علم میں تدریجاً ترقی ہو رہی ہے اسی طرح ان ریفرنسز کو سمجھنا بھی انسان کے لیے ممکن ہو رہا ہے۔ البتہ قرآن کا اصل موضوع مابعد الطبیعیات ہے۔ پھر فکر وعمل دونوں کے لیے راہنمائی درکار ہے' جیسے کہ کسی راستے پر چلنے والے کو ''روڈ سائنز'' کی ضرورت ہوتی ہے کہ اِدھر نہ جانا' اِدھر خطرہ ہے' ہلاکت ہے۔ اسی طرح انسان کو سفرِ حیات میں ان cautions کی ضرورت ہے کہ اِدھر خطرہ ہے' یہ تمہارے لیے ممنوع ہے' یہ حرام ہے' یہ نقصان دہ ہے' اس میں ہلاکت ہے' چاہے تمہیں ہلاکت نظر نہیں آ رہی لیکن تم اِدھر جاؤ گے تو تمہارے لیے ہلاکت ہے۔ درحقیقت یہ قرآن کا اصل موضوع ہے۔

باب ششم

فہم قرآن کے اصول

فہم قرآن کے سلسلہ میں درج ذیل عنوانات کی تفہیم ضروری ہے۔

۱) قرآن کریم کا اسلوبِ استدلال

قرآن کے طالب علم کو جاننا چاہیے کہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں' فطری ہے۔ انسان جس فلسفے سے واقف ہے اس کی بنیاد منطق ہے۔ چنانچہ ہمارے فلاسفہ اور متکلمین استخراجی منطق (Deductive Logic) سے اعتناء کرتے رہے ہیں' جبکہ قرآن مجید نے اسے سرے سے اختیار نہیں کیا۔ وقتی تقاضے کے تحت ہمارے متکلمین نے اسے اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں پہنچ پایا۔ ایمانی حقائق کو جب استخراجی منطق کے ذریعے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تو یقین کم اور شک زیادہ پیدا ہوا۔ اس ضمن میں کانٹ کی بات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے' لہٰذا علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات کا آغاز اسی حوالے سے کیا ہے۔ کانٹ نے حتمی طور پر ثابت کر دیا کہ کسی منطقی دلیل سے خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منطق میں اللہ کی ہستی کے اثبات کے لیے ایک دلیل لائیں گے تو منطق کی دوسری دلیل اسے کاٹ دے گی۔ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق' منطق کو کاٹ دے گی۔ قرآن نے اگرچہ کہیں کہیں منطق کو استعمال تو کیا ہے لیکن وہ بھی منطقی اصطلاحات میں نہیں۔ قرآن مجید کا اسلوبِ استدلال فطری ہے اور اس کا انداز خطابی ہے۔ جیسے ایک خطیب جب خطبہ دیتا ہے تو جہاں وہ عقلی دلائل دیتا ہے وہاں جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے۔ اس سے اس کے خطبے میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ ایک لیکچر میں زیادہ تر دارومدار منطق پر ہوتا ہے۔ یعنی ایسی دلیل جو عقل کو قائل کر سکے۔ لیکن شعلہ بیان خطیب انسان کے جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ اس کو خطابی دلیل کہا جاتا ہے۔ یہی خطابی انداز اور استدلال قرآن نے استعمال کیا ہے۔

انسان کی فطرت میں کچھ حقائق موجود ہیں۔ قرآن کے پیشِ نظر ان حقائق کو ابھارنا مقصود ہے۔ یعنی انسان کو آمادہ کیا جائے کہ ؏

''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!''

عقل اور منطق کا دائرہ تو بڑا محدود ہے۔ انسان اپنے اندر جھانکے تو اس کے اندر صرف عقل ہی نہیں ہے' کچھ اور بھی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے!

یہ جو اس کے اندر ''کوئی اور'' شے بھی ہے' اسے اپیل کرنا ضروری ہے تاکہ انسان فطرت کی بنیاد پر اپنے اندر جھانکے اور محسوس کرے کہ ہاں یہ ہے! تاہم اس کے لیے کوئی منطقی دلیل بھی پیش کر دی جائے۔ تو یہ نورٌ علیٰ نور ہو گا۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کا فطری طرزِ استدلال۔ بعض مقامات پر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن اپنے مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہہ رہا ہے اور اسے توجہ دلا رہا ہے کہ ذرا غور کرو' سوچو' اپنے اندر جھانکو۔ جیسے سورۃ ابراہیم کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''کیا اللہ کی ہستی میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟'' یہاں کوئی منطقی دلیل نہیں ہے' لیکن مخاطب کو دروں بینی پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے اندر جھانکو' تمہیں اپنے اندر ثبوت ملے گا' تمہیں اپنے اندر اللہ کی ہستی کی شہادت ملے گی۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا: ﴿اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی ؕ﴾ ''کیا تم واقعی اس بات کی گواہی دے رہے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟'' یعنی تم یہ بات کہہ تو رہے ہو' لیکن ذرا سوچو تو سہی کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہاری فطرت اسے تسلیم کرتی ہے؟ اپنے باطن میں جھانکو' کیا تمہارا دل اس کی گواہی دیتا ہے؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ تو اس کے مدعی تھے اور اپنے معبودانِ باطل کے لیے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اس خطابی دلیل کے پس منظر میں یہ حقیقت موجود ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ محض ایک عقیدہ (dogma) ہے جو چلا آ رہا ہے' تمہارے باپ دادا کی روایت ہے' اس کی حیثیت تمہارے نسلی اعتقادات (racial creed) کی ہے۔ قرآن مجید درحقیقت انسان کی فطرت کے اندر جو شے مضمر ہے اسی کو ابھار کر باہر لانا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں ہے' بلکہ فطری ہے۔ اس کو خطابی انداز کہا جائے گا۔

۲) قرآن حکیم میں محکم اور متشابہ کی تقسیم

سورۂ آل عمران کی آیت ۷ ملاحظہ کیجیے! ارشاد ہوا: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ ؕ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے (اے محمدﷺ) آپ پر کتاب نازل کی' اس میں سے کچھ آیاتِ محکمات ہیں' وہی کتاب کی جڑ بنیاد ہیں اور دوسری متشابہ ہیں''۔ اس آیت میں لفظ کتاب دو دفعہ آیا ہے' دونوں کے مفہوم میں باریک سا فرق ہے۔ متشابہ ان معانی میں کہ ان کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں اشتباہ ہو جاتا ہے' وہ آیاتِ متشابہات ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ ج﴾ ''تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں (ان ہی پر غور و فکر اور ان ہی میں کھوج کرید میں لگے رہتے ہیں) اُن کی نیت ہی فتنہ اٹھانے کی ہے' اور وہ بھی ہیں جو اُس کا اصل مفہوم جاننا چاہتے ہیں''۔ ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ ؔ﴾ ''حالانکہ اس کے حقیقی معانی و مراد اللہ ہی جانتا ہے''۔ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج﴾ ''البتہ جو لوگ علم میں پختگی کے حامل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اس پوری کتاب پر (محکمات پر بھی اور متشابہات پر بھی)' یہ سب ہمارے ربّ کی طرف سے ہے''۔ ﴿وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷﴾ ''لیکن نصیحت نہیں حاصل کرتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان عقلمندوں اور ہوش مندوں میں شامل کرے' رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ میں ہمارا شمار ہو!

محکم اور متشابہ سے مراد کیا ہے؟ جان لیجیے کہ ''محکم قطعی''، یعنی وہ محکم جن کے قطعی ہونے میں نہ پہلے کوئی شبہ ہوسکتا تھا نہ اَب ہے' نہ آئندہ ہوگا' وہ تو قرآن حکیم کے اوامر ونواہی ہیں۔یعنی یہ کرو' یہ نہ کرو' یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ جائز ہے' یہ ناجائز ہے' یہ پسندیدہ ہے' یہ ناپسندیدہ ہے' یہ اللہ کو پسند ہے اور یہ اللہ کو ناپسند ہے!

قرآن حکیم کا عملی حصہ درحقیقت محکمات ہی پر مشتمل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں کتاب کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔پہلے بحیثیت مجموعی پورے قرآن کے لیے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ﴾ قرآن مجید کا جو حصہ عملی ہدایات پر مشتمل ہے اس کے لیے بھی لفظ ''کتاب'' مخصوص ہے۔چنانچہ دوسری مرتبہ جو لفظ کتاب آیا ہے: ﴿هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ﴾ وہ اسی مفہوم میں ہے۔جہاں کوئی شے واجب کی جاتی ہے وہاں ''کُتِبَ'' کا لفظ آتا ہے۔جیسے ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ...... کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ...... کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ﴾ نماز کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ یہاں کتاب سے مراد وہ حکم ہے جو دیا گیا ہے' تو اِن معانی میں ﴿هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ﴾ سے مراد قانون' شریعت' عملی ہدایات' اوامر ونواہی ہیں اور اصل میں وہی محکمات ہیں۔

دائمی متشابہات عالم غیب اور اس کے ضمن میں عالم برزخ' عالم آخرت' عالم ارواح' ملائکہ کا عالم اور عالم امثال وغیرہ ہیں۔یہ درحقیقت وہ دائرہ ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور اس کی حقیقتوں کو کماحقہٗ اس زندگی میں سمجھنا محال اور ناممکن ہے۔لیکن ان کا ایک علم دیا جانا ضروری تھا۔مابعد الطبیعیات ایمانیات کے لیے ضروری ہے کہ اس سب کا ایک اجمالی خاکہ سامنے ہو۔ہر انسان نے مرنا ہے' مرنے کے فوراً بعد عالم برزخ میں یہ کچھ ہونا ہے' بعث بعد الموت ہے' حشر نشر ہے' حساب کتاب ہے' جنت و دوزخ ہے۔ان حقیقتوں کا اجمالی علم موجود نہ ہو تو بنیادی ضرورت کے طور پر انسان کو جو فلسفہ درکار ہے وہ اس کو فراہم نہیں ہوگا۔لیکن اِن کی حقیقتوں تک رسائی اس زندگی میں رہتے ہوئے ہمارے لیے ممکن نہیں' لہٰذا ان کا جو علم دیا گیا ہے وہ آیاتِ متشابہات ہیں' اور وہ دائماً متشابہات ہی رہیں گی۔ہاں جب اُس عالم میں آنکھ کھلے گی تو اصل حقیقت معلوم ہوگی' یہاں معلوم نہیں ہوسکتی۔

البتہ متشابہات کا ایک دوسرا دائرہ ہے جو تدریجاً متشابہات سے محکمات کی طرف آرہا ہے۔وہ دائرہ مظاہر طبیعی (physical phenomena) سے متعلق ہے۔آج سے ہزار سال پہلے اس کا دائرہ بہت وسیع تھا' آج یہ کچھ محدود ہوا ہے' لیکن اب بھی بہت سے حقائق ہم نہیں جانتے۔سات آسمانوں کی حقیقت آج تک ہمیں معلوم نہیں ہے۔ہوسکتا ہے کچھ آگے چل کر ہمارا میٹیریل سائنسز کا علم اس حد تک پہنچ جائے کہ معلوم ہو کہ یہ ہے وہ بات جو قرآن نے سات آسمانوں سے متعلق کہی تھی' لیکن اِس وقت یہ ہمارے لیے متشابہات میں سے ہے۔اسی طرح ایک آیت ﴿کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ (یٰسٓ) (ہر شے اپنے مدار میں تیر رہی ہے) اس کو پہلے انسان نہیں سمجھ سکتا تھا' لیکن آج یہ حقیقت محکم ہو کر سامنے آگئی ہے کہ ع

''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!''

اگر آپ نظامِ شمسی کو دیکھیں تو ہر چیز حرکت میں ہے۔کہکشاں کو دیکھیں تو ہر شے حرکت میں ہے۔کہکشائیں ایک دوسرے سے دُور بھاگ رہی ہیں' فاصلہ بڑھتا چلا جارہا ہے۔ایک ذرّے (atom) کا مشاہدہ کریں تو اس میں الیکٹرون اور پروٹون حرکت میں ہیں۔گویا ہر شے حرکت میں ہے۔آج سے کچھ عرصہ قبل یہ بات متشابہات میں تھی' آج وہ محکمات کے دائرے میں آگئی ہے۔چنانچہ بہت سے وہ سائنسی حقائق جو ابھی تک انسان کو معلوم نہیں ہیں اور ان کے حوالے قرآن میں ہیں' وہ آج کے اعتبار سے تو متشابہات میں شمار ہوں گے لیکن انسان کا فزیکل سائنسز کا علم آگے بڑھے گا تو وہ تدریجاً متشابہات کے دائرے سے نکل کر محکمات کے دائرے میں آجائیں گے۔

۳) تفسیر اور تاویل کا فرق

تفسیر اور تاویل دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں۔سورۂ آل عمران کی متذکرہ بالا آیت میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ''۔تفسیر کا لفظ قرآن مجید میں سورۃ الفرقان میں آیا ہے: ﴿وَلَا یَاْتُوْنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰکَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا ﴿۳۳﴾﴾ ''اور نہیں لاتے وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات مگر ہم پہنچا دیتے ہیں (اس کے جواب میں) آپ کو ٹھیک بات اور بہترین طریقے سے بات کھول دیتے ہیں''۔یہ لفظ قرآن میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے' جبکہ تاویل کا لفظ سترہ (۱۷) بار آیا ہے۔اس کے کچھ اور مفاہیم بھی ہیں اور قرآن کے علاوہ کچھ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔تفسیر اور تاویل میں فرق کیا ہے؟ تفسیر کا مادہ ''ف' س' ر'' ہے۔یہ گویا ''سفر'' کی منقلب شکل ہے۔سفر بمعنی Journey بھی ہے —— اور اس کا مطلب روشنی بھی ہے' کتاب بھی ہے۔حروف ذرا آگے پیچھے ہوگئے ہیں' لفظ ایک ہی ہے۔تفسیر کا معنی ہے کسی شے کا کھولنا' واضح کردینا' کسی شے کو روشن کردینا' لیکن یہ زیادہ تر مفردات اور الفاظ سے متعلق ہوتی ہے' جبکہ تاویل بحیثیت مجموعی کلام کا اصل مدلول ہوتی ہے کہ اس سے اصل مقصود کیا ہے' اس سے مراد کیا ہے' اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔لہٰذا زیادہ تر یہی لفظ قرآن کے لیے مستعمل ہے۔اگرچہ ہمارے ہاں اردو دان لوگ زیادہ تر لفظ تفسیر استعمال کرتے ہیں کہ فلاں آیت کی تفسیر' فلاں لفظ کی تفسیر' لیکن اس کے لیے قرآن کی اصل اصطلاح تاویل ہی ہے اور حدیث میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے حضور ﷺ کی دعا منقول ہے: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِیْلَ)) یعنی اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور تفقہ عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما! چنانچہ کلام کی اصل حقیقت' اصل مراد' اصل مطلوب' اصل مدلول کو پالینا تاکہ انسان اصل مقصود تک پہنچ جائے' اسے تاویل کہتے ہیں۔ ع

''جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!''

''اَوْل'' کا مادّہ عربی زبان میں کسی شے کی طرف لوٹنے کے مفہوم میں آتا ہے۔اسی لیے لوگ کہتے ہیں ہم فلاں کی آل ہیں' یعنی وہ کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔''آلِ فرعون'' کا مطلب فرعون کی اولاد نہیں ہے' بلکہ ''فرعون والے' فرعونی'' ہے۔وہ فرعون ہی کی اطاعت کرتے تھے اور اسی کو اپنا معبود یعنی حاکم اور پیشوا سمجھتے تھے۔اسی معنی میں کسی عبارت کو اُس کے اصل مفہوم کی طرف لوٹانا تاویل ہے۔تفسیر اور تاویل کے مابین اس فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۴) تاویل عام اور تاویل خاص

قرآن حکیم کی کسی ایک آیت یا چند آیات کے مجموعے یا کسی خاص مضمون جو چند آیات میں مکمل ہو رہا ہے' پر غور کرنے میں دو مرحلے ہمیشہ پیشِ نظر رہنے چاہئیں: ایک تاویل خاص' دوسرے تاویل عام۔ اس سلسلہ میں یاد رہے کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں نازل ہوا ہے۔ اس کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کے عرصے پر محیط ہے اور اس کے نزول کی جگہ سرزمین حجاز ہے۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اُس وقت اور اُس علاقے کے لوگوں کے عقائد و نظریات اور ان کی ذہنی سطح کو ملحوظ نہ رکھا جاتا تو ان تک ابلاغ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ تو اُمی تھے' پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگر انہیں فلسفہ پڑھانا شروع کر دیا جاتا' سائنسی علوم کے بارے میں بتایا جاتا تو یہ باتیں اُن کے سروں کے اوپر سے گزر جاتیں۔ قرآنی آیات تو ان کے دل و دماغ میں پیوست ہوگئیں' کیونکہ براہِ راست ابلاغ تھا' کوئی barrier موجود نہیں تھا۔ تو قرآن حکیم کا یہ شانِ نزول ذہن میں رکھیے۔ ویسے تو ''شانِ نزول'' کی اصطلاح کسی خاص آیت کے لیے استعمال ہوتی ہے' لیکن ایک خاص time and space complex میں قرآن حکیم کا ایک مجموعی شانِ نزول ہے جس میں یہ نازل ہوا۔ وہاں کے حالات' اس عرصے کے واقعات' ان حالات میں تدریجاً جو تبدیلی ہوئی' پھر کون لوگ اس کے مخاطب تھے' اہل مکہ کے عقائد' ان کی رسمیں ریتیں' ان کے نظریات' ان کے مسلّمات' ان کی دلچسپیاں ...... جب قرآن کو اس سیاق و سباق (context) میں رکھ کر غور کریں گے تو یہ تاویل خاص ہوگی۔ اسی میں آپ مزید تفصیل میں جائیں گے کہ فلاں آیت کا واقعاتی پس منظر کیا ہے۔ یعنی قرآن مجید کی کسی آیت یا چند آیات پر غور کرتے ہوئے اوّلاً اس کو اس کے context میں رکھ کر غور کرنا کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت لوگوں نے ان کا مفہوم کیا سمجھا' یہ تاویل خاص ہوگی۔ البتہ قرآن مجید چونکہ نوعِ انسانی کی ابدی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے' صرف خاص علاقے اور خاص زمانے کے لوگوں کے لیے تو نازل نہیں ہوا' لہٰذا اس میں ابدی ہدایت ہے' اس اعتبار سے تاویل عام کرنا ہوگی۔

تاویل عام کے اعتبار سے الفاظ پر غور کریں گے کہ الفاظ کیا استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ جب ترکیبوں کی شکل اختیار کرتے ہیں تو کیا ترکیبیں بنتی ہیں۔ پھر آیات کا باہمی ربط کیا ہے' سیاق و سباق کیا ہے؟ یہ آیات جس سورۃ میں آئیں اس کا عمود کیا ہے' اس سورۃ کا جوڑا کون سا ہے' یہ سورۃ کس سلسلۂ سور کا حصہ ہے۔ پھر وہ سورتیں مکی اور مدنی کون سے گروپ میں شامل ہیں' ان کا مرکزی مضمون کیا ہے؟ اس پس منظر میں ایک سیاق و سباق متن (text) کا ہوگا' جس سے ہمیں تاویلِ عام معلوم ہوگی اور ایک سیاق و سباق واقعات کا ہوگا' جس سے ہمیں ان آیات کی تاویلِ خاص معلوم ہوگی۔

اگر ہم قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے آیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جس ترتیب سے اِس وقت قرآن مجید موجود ہے اصل حجت یہی ہے' یہی اصل ترتیب ہے' یہی لوحِ محفوظ کی ترتیب ہے۔ تاویل عام کے اعتبار سے ایک اصولی بات یاد رکھیں: **الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب**. یعنی اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ خاص شانِ نزول کا۔ دیکھا جائے گا کہ جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا مفہوم و معنی' نیز مدلول کیا ہے۔ کلامِ عرب سے دلائل لائے جائیں گے کہ وہ انہیں کن معانی میں استعمال کرتے تھے۔ اُس لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ اُس کے شانِ نزول کا۔ لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ سب سے مناسب بات یہی ہوگی کہ پہلے اس کی تاویل خاص پر غور کریں اور پھر اس کے ابدی سرچشمۂ ہدایت ہونے کے ناطے اس کے عموم پر غور کریں۔ اس اعتبار سے تاویل خاص اور تاویل عام کے فرق کو ذہن میں رکھیں۔

۵) تذکر و تدبّر

تذکر اور تدبر دونوں الفاظ الگ الگ تو بہت جگہ آئے ہیں' سورۂ صٓ کی آیت ۲۹ میں یکجا آگئے ہیں: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٩﴾﴾ ''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں''۔ ان دونوں کا مطلب کیا ہے؟ ایک ہے قرآن مجید سے ہدایت اخذ کر لینا' نصیحت حاصل کر لینا' اصل راہنمائی حاصل کر لینا' جس کو مولانا روم نے کہا ع ''ما ز قرآں مغز ہا برداشتیم'' یعنی قرآن کا جو اصل مغز ہے وہ تو ہم نے لے لیا۔ اس کا اصل مغز ''ہدایت'' ہے۔ اس مرحلے پر قرآن جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ ''تذکر'' ہے۔ یہ لفظ ذکر سے بنا ہے۔ تذکر یاد دہانی کو کہتے ہیں۔ اب اس کا تعلق اسی بات سے جڑ جائے گا جو قرآن کے اسلوبِ استدلال کے ضمن میں پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی قرآن مجید جن اصل حقائق (مابعد الطبیعیاتی حقیقتوں) کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ فطرتِ انسانی میں مضمر ہیں' ان پر صرف ذہول اور نسیان کے پردے پڑ گئے ہیں۔ مثلاً آپ کو کوئی بات کچھ عرصہ قبل معلوم تھی' لیکن اب اس کی طرف دھیان نہیں رہا اور وہ آپ کی یادداشت کے ذخیرے میں گہری اتر گئی ہے اور اب یاد نہیں آتی' لیکن کسی روز اُس کی طرف کوئی ہلکا سا اشارہ ملتے ہی آپ کو وہ پوری بات یاد آ جاتی ہے۔ جیسے آپ کا کوئی دوست تھا' کسی زمانے میں بے تکلفی تھی' صبح شام ملاقاتیں تھیں' اب طویل عرصہ ہو گیا' کبھی اس کی یاد نہیں آئی۔ ایسا نہیں کہ آپ کو یاد نہیں رہا' بلکہ ذہول ہے' نسیان ہے' توجہ اُدھر نہیں ہے' کبھی ذہن اُدھر منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اچانک کسی روز آپ نے اپنا ٹرنک کھولا اور اس میں سے کوئی قلم یا رومال جو اُس نے کبھی دیا ہو برآمد ہو گیا تو فوراً آپ کو اپنا وہ دوست یاد آ جائے گا۔ یہ phenomenon تذکرّ ہے۔ تذکر کا مطلب تعلّم نہیں ہے۔ تعلّم علم حاصل کرنا یعنی نئی بات جاننا ہے' جبکہ تذکر پہلے سے حاصل شدہ علم جس پر ذہول اور نسیان کے جو پردے پڑ گئے تھے' ان کو ہٹا کر اندر سے اسے برآمد کرنا ہے۔ فطرتِ انسانی کے اندر اللہ کی محبت' اللہ کی معرفت کے حقائق مضمر ہیں۔ یہ فطرت میں موجود ہیں' صرف اُن پر پردے پڑ گئے ہیں' دنیا کی محبت غالب آ گئی ہے ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے! (فیضؔ)

یہاں کی دلچسپیوں' مسائل' مشکلات' مصروفیات' مشاغل کی وجہ سے ذہول ہو گیا ہے' پردہ پڑ گیا ہے۔

تذکر یہ ہے کہ اس پردے کو ہٹا دیا جائے۔ ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں' لوحِ جبیں تازہ کریں! (حفیظؔ)

یادداشت کو recall کرنا اور اپنی فطرت میں مضمر حقائق کو اجاگر کر لینا تذکرّ ہے۔قرآن کا اصل ہدف یہی ہے اور اس اعتبار سے قرآن کا دعویٰ سورۃ القمر میں چار مرتبہ آیا ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ ''ہم نے قرآن کو تذکر کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے' تو کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟'' اس کے لیے بہت گہرائی میں غوطہ زنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بہت مشقت ومحنت مطلوب نہیں ہے۔انسان کے اندر طلبِ حقیقت ہو اور قرآن سے براہِ راست رابطہ (Communication) ہو جائے تو تذکر حاصل ہو جائے گا۔اس کی شرط صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اتنی عربی ضرور آتی ہو کہ وہ قرآن سے ہم کلام ہو جائے۔اگر آپ ترجمہ دیکھیں گے تو کچھ معلومات تو حاصل ہوں گی' تذکر نہیں ہو گا۔ اقبال نے کہا تھا: ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

تذکر کے عمل کا اثر تو یہ ہے کہ آپ کے اندر کے مضمر حقائق ابھر کر آپ کے شعور کی سطح پر دوبارہ آ جائیں۔یہ نہ ہو کہ پہلے آپ نے متن کو پڑھا' پھر ترجمہ دیکھا' حاشیہ دیکھا' اس کے بعد اگلی آیت کی طرف گئے تو تسلسل ٹوٹ گیا اور کلام کی تاثیر ختم ہو گئی۔ ترجمہ سے کلام کی اصل تاثیر باقی نہیں رہتی۔شیکسپیئر کی کوئی عبارت آپ انگریزی میں پڑھیں گے تو جھوم جائیں گے' اگر اس کا ترجمہ کریں گے تو اس کا وہ اثر نہیں ہو گا۔اسی طرح غالبؔ کا شعر ہو یا میرؔ کا' اس کا انگریزی میں ترجمہ کریں گے تو وہ اثر باقی نہیں رہے گا اور آپ وجد میں نہیں آئیں گے' جھوم جھوم نہیں جائیں گے۔عربی زبان کا اتنا علم کہ آپ عربی متن کو براہِ راست سمجھ سکیں' تذکر کی بنیادی شرط ہے۔چنانچہ اوّلاً حسنِ نیت ہو' طلبِ ہدایت ہو' تعصبّ کی پٹی نہ بندھی ہو' اور ثانیاً عربی زبان کا اتنا علم ہو کہ آپ براہِ راست اس سے ہم کلام ہو رہے ہوں' یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو تذکر ہو جائے گا۔

دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ آیت کا مطلب نشانی ہے۔نشانی اسے کہتے ہیں جس کو دیکھ کر ذہن کسی اور شے کی طرف منتقل ہو جائے۔آپ نے قلم یا رومال دیکھا تو ذہن دوست کی طرف منتقل ہو گیا جس سے ملے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور اس کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔مولانا روم کہتے ہیں ؎

خشک تار و خشک مغز و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست؟

ہمارا ایک ازلی دوست ہے ''اللہ'' وہی ہمارا خالق ہے' ہمارا باری ہے' ہمارا ربّ ہے۔اس کی دوستی پر کچھ پردے پڑ گئے ہیں' اس پر کچھ ذہول طاری ہو گیا ہے۔قرآن اس دوست کی یاد دلانے کے لیے آیا ہے۔

اس کے برعکس تدبرّ گہرائی میں غوطہ زن ہونے کو کہتے ہیں۔ ع ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!'' تدبر کے اعتبار سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے۔اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ اس کا منبع اور سرچشمہ علمِ الٰہی ہے اور علمِ الٰہی لامتناہی ہے۔یہ حقیقت ہے کہ کلام میں متکلمّ کی ساری صفات موجود ہوتی ہیں' لہٰذا یہ کلام لامتناہی ہے۔اس کو کوئی شخص نہ عبور کر سکتا ہے نہ گہرائی میں اس کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔یہ ناممکن ہے' چاہے پوری پوری زندگیاں کھپا لیں۔وہ چاہے صاحبِ کشافؔ ہوں' صاحبِ تفسیر کبیر ہوں' کسے باشد۔اس کا احاطہ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔بعض لوگ غیر محتاط انداز میں یہ الفاظ استعمال کر دیتے ہیں کہ ''انہیں قرآن پر بڑا عبور حاصل ہے''۔یہ قرآن کے لیے بڑا توہین آمیز کلمہ ہے۔عبور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔قرآن کا تو کنارہ ہی کوئی نہیں ہے۔کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ قرآن پر عبور حاصل کرے۔یہ ناممکنات میں سے ہے۔اسی طرح اس کی گہرائی تک پہنچ جانا بھی ناممکن ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تمثیل سے بات کسی قدر واضح ہو جائے گی۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سمندر میں کوئی ٹینکر تیل لے کر جا رہا ہے اور کسی وجہ سے اچانک تیل لیک کرنے لگ جاتا ہے۔لیکن وہ تیل سطحِ سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے' نیچے نہیں جاتا۔سطحِ سمندر پر اوپر تیل کی تہہ اور نیچے پانی ہوتا ہے اور وہ تیل پانچ دس میل تک پھیل جاتا ہے۔سمندر کی اتھاہ گہرائی کے باوجود تیل سطحِ آب پر ہی رہتا ہے۔اسی طرح سمجھئے کہ قرآن مجید کی اصل ہدایت اور اصل تذکر اس کی سطح پر موجود ہے۔اس تک رسائی کے لیے سائنس دان یا فلسفی ہونا' عربی ادب کا ماہر ہونا' کلامِ جاہلی کا عالم ہونا ضروری نہیں۔صرف دو چیزیں موجود ہوں۔پہلی خلوصِ نیت اور طلبِ ہدایت' دوسری قرآن سے براہِ راست ہم کلامی کا شرف اور اس کی صلاحیت۔یہ دونوں ہیں تو تذکر کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔البتہ تدبر کے لیے گہرائی میں اترنا ہو گا اور اس بحرِ زخّار میں غوطہ زنی کرنا ہو گی۔تدبر کا حق ادا کرنے کے لیے شعرِ جاہلی کو بھی جاننا ضروری ہے۔ہر لفظ کی پہچان ضروری ہے کہ جس دور میں قرآن نازل ہوا اُس زمانے اور اُس علاقے کے لوگوں میں اس لفظ کا مفہوم کیا تھا' یہ کن معانی میں استعمال ہو رہا تھا۔قرآن نے بنیادی اصطلاحات وہیں سے اخذ کی ہیں۔وہی الفاظ جن کو عرب اپنے اشعار اور خطبات کے اندر استعمال کرتے تھے انہی کو قرآن مجید نے لیا ہے۔چنانچہ نزولِ قرآن کے دَور کی زبان کو پہچاننا اور اس کے لیے ضروری مہارت کا ہونا تدبر کے لیے ناگزیر ہے۔پھر یہ کہ احادیث' علمِ بیان' منطق' ان سب کو انسان بطریق تدبر جانے گا تو پھر وہ اس کا حق ادا کر سکے گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر کا نام ہی ''تدبرِ قرآن'' رکھا ہے اور وہ تدبرِ قرآن کے بہت بڑے داعی ہیں۔اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہے۔ان کے بعض شاگرد حضرات نے بھی محنتیں کی ہیں اور وقت لگایا ہے۔اس کے ان تقاضوں کو تو اُن حضرات نے بیان کیا ہے' لیکن تدبرِ قرآن کا ایک اور تقاضا بھی ہے جو بدقسمتی سے ان کے سامنے بھی نہیں آیا۔اگر وہ تقاضا بھی پورا نہیں ہو گا تو عصرِ حاضر کے تدبرّ کا حق ادا نہیں ہو گا۔وہ تقاضا یہ ہے کہ علمِ انسانی آج جس لیول تک پہنچ گیا ہے' میٹیریل سائنسز کے مختلف علوم کے ضمن میں جو کچھ معلومات انسان کو حاصل ہو چکی ہیں اور وہ خیالات ونظریات جن کو آج دنیا میں مانا جا رہا ہے ان سے آگاہی حاصل کی جائے۔اگر ان کا اجمالی علم نہیں ہے تو اِس

دَور کے تدبر قرآن کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔قرآن حکیم وہ کتاب ہے جو ہر دَور کے اُفق پر خورشیدِ تازہ کی مانند طلوع ہو گی۔آج سے سو برس پہلے کے قرآن اور آج کے قرآن میں اس حوالے سے فرق ہو گا۔متن اور الفاظ وہی ہیں' لیکن آج علم انسانی کی جو سطح ہے اس پر اس قرآن کے فہم اور اس کے علم کو جس طریقے سے جلوہ گر ہونا چاہیے اگر آپ اس کا حق ادا نہیں کر رہے تو آپ سو برس پہلے کا قرآن پڑھ رہے ہیں' آج کا قرآن نہیں پڑھ رہے۔جیسے اللہ کی شان ہے:﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔

اسی طرح ہدایتِ عملی کے ضمن میں اقتصادیات' سماجیات اور نفسیاتِ انسانی کے سلسلہ میں راہنمائی اور حقائق قرآن میں موجود ہیں' انہیں کیسے سمجھیں گے؟ قرآن کی اصل تعلیمات کی قدر و قیمت اور اس کی اصل evaluation کیسے ممکن ہے اگر انسان آج کے اقتصادی مسائل کو نہ جانتا ہو؟ اس کے بغیر وہ تدبر قرآن کا حق نہیں ادا کر سکتا۔مثلاً آج کے اقتصادی مسائل کیا ہیں؟ پیپر کرنسی کی حقیقت کیا ہے؟ اقتصادیات کے اصول و مبادی کیا ہیں؟ بینکنگ کی اصل بنیاد کیا ہے؟ کس طرح کچھ لوگوں نے اس پوری نوعِ انسانی کو معاشی اعتبار سے بے بس کیا ہوا ہے۔اس حقیقت کو جب تک نہیں سمجھیں گے تو آج کے دَور میں قرآن حکیم کی اقتصادی تعلیمات واضح کرنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج تدبر قرآن کسی ایک انسان کے بس کا روگ ہی نہیں رہا' اس کے لیے تو ایک جماعت درکار ہے۔ میرے کتابچے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے باب ''تذکرّ و تدبر'' میں یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ ایسی یونیورسٹیز قائم ہوں جن کا اصل مرکزی شعبہ ''تدبر قرآن'' کا ہو۔ جو شخص بھی اس یونیورسٹی کا طالب علم ہو' وہ عربی زبان سیکھے اور قرآن پڑھے۔لیکن اس مرکزی شعبے کے گرد تمام علومِ عقلی' جیسے منطق' مابعد الطبیعیات' اخلاقیات' نفسیات اور الٰہیات' علومِ عمرانی جیسے معاشیات' سیاسیات اور قانون' اور علومِ طبعی' جیسے ریاضی' کیمیا' طبیعیات' ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو' اور ہر ایک طالب علم ''تدبر قرآن'' کی لازماً اور ایک یا اس سے زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو تحقیقی طور پر اخذ کر کے مؤثر انداز میں پیش کر سکے۔طالب علم وہ بھی پڑھے تب معلوم ہو گا کہ اس شعبے میں انسان آج کہاں کھڑا ہے اور قرآن کیا کہہ رہا ہے۔فلاں شعبے میں نوعِ انسانی کے کیا مسائل ہیں اور اس ضمن میں قرآن حکیم کیا کہتا ہے۔مختلف شعبے مل کر تدبر قرآن کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں جو وقت کا اہم تقاضا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' تذکر کے اعتبار سے قرآن آسان ترین کتاب ہے جو ہماری فطرت کی پکار ہے۔ع ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا!'' اگر انسان کی فطرت مسخ شدہ نہیں ہے' بلکہ سلیم ہے' صالح ہے' سلامتی پر قائم ہے تو وہ قرآن کو اپنے دل کی پکار محسوس کرے گا' اس کے اور قرآن کے درمیان کوئی حجاب نہ ہو گا' وہ اسے اپنے دل کی بات سمجھے گا' اس کے لیے عربی زبان کا صرف اتنا علم کافی ہے کہ براہِ راست ہم کلام ہو جائے۔جبکہ تدبر کے تقاضے پورے کرنے کسی ایک انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔جو شخص بھی اس میدان میں قدم رکھنا چاہے اس کے ذہن میں ایک اجمالی خاکہ ضرور ہونا چاہیے کہ آج جدید سائنسز کے اعتبار سے انسان کہاں کھڑا ہے۔جب انسان کو اپنے مقام کی معرفت حاصل ہو جائے تو وہ قرآن مجید سے بہتر طور پر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔اس کی مثال ایسے ہے کہ سمندر میں تو بے تحاشا پانی ہے' آپ اگر پانی لینا چاہتے ہیں تو جتنا بڑا کٹورا' کوئی دیگ' دیگچی یا بالٹی آپ کے پاس ہے اسی کو آپ بھر لیں گے۔یعنی جتنا آپ کا ظرف ہو گا اتنا ہی آپ سمندر سے پانی اخذ کر سکیں گے۔اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہ ہو گا کہ سمندر میں پانی ہی اتنا ہے! انسانی ذہن کا ظرف علوم سے بنتا ہے۔یہ ظرف آج سے پہلے بہت تنگ تھا۔ایک ہزار سال پہلے کا ظرفِ ذہنی بہت محدود تھا۔انسانی علوم کے اعتبار سے آج کا ظرف بہت وسیع ہے۔اگر آج آپ کو قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنی ہے تو آپ کو اپنا ظرف اس کے مطابق وسیع کرنا ہو گا۔اور اگر کچھ لوگ ابھی اُسی سابق دور میں رہ رہے ہیں تو قرآن حکیم کے مخفی حقائق اُن پر منکشف نہیں ہوں گے۔

٦) عملی ہدایات اور مظاہرِ طبیعی کے بارے میں متضاد طرزِ عمل

قرآن حکیم میں سائنسی علوم کے جو حوالہ جات آتے ہیں اور اس میں جو عملی ہدایات ملتی ہیں' ان کے ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک اعتبار سے ہمیں آگے سے آگے بڑھنا ہے اور دوسرے اعتبار سے ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہے۔چنانچہ قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے والے کا انداز (attitude) دو اعتبارات سے بالکل متضاد ہونا چاہیے۔سائنسی حوالہ جات جو قرآن میں آئے ہیں ان کی تعبیر کرنے میں آگے سے آگے جائیے۔آج انسان کو کیا معلومات حاصل ہو چکی ہیں' کون سے حقائق پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں' ان کے حوالے پیش نظر رہیں گے۔اس میں پیچھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔امام رازی اور دیگر قدیم مفسرینؒ کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے بھی کچھ فرمایا ہے تو وہ بھی ہمارے لیے لازم نہیں ہے۔اس لیے کہ حضور ﷺ سائنس اور ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔تأبیر نخل کا واقعہ پیچھے گزر چکا ہے' اس کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاكُمْ)) ''اپنے دنیاوی معاملات کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو''۔تجرباتی علوم کے مطابق جو تمہیں علم حاصل ہے اس پر عمل کرو۔لیکن دین کا جو عملی پہلو ہے اس میں پیچھے سے پیچھے جائیے۔ یہاں یہ دلیل نہیں چلے گی کہ جدید دَور کے تقاضے کچھ اور ہیں' جبکہ یہ دیکھنا ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ نے اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا کیا۔اس حوالے سے قرآن کے طالب علم کا رُخ پیچھے کی طرف ہونا چاہیے کہ اسلاف نے کیا سمجھا۔متأخرین کو چھوڑ کر متقدمین کی طرف جائیے۔متقدمین سے تبع تابعین' پھر تابعین سے ہوتے ہوئے ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ'' یعنی حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل تک پہنچیے۔اس اعتبار سے اقبال کا یہ شعر صحیح منطبق ہوتا ہے ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بأو نرسیدی تمام بولہبی ست!

دین کا عملی پہلو وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے۔اس میں اگرچہ روایات کے اختلاف کی وجہ سے کچھ فرق ہو جائے گا مگر دلیل یہی رہے گی: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) [1] ''نماز اِس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔اب نماز کی جزئیات کے بارے میں روایات میں کچھ فرق ملتا ہے۔کسی کے نزدیک ایک روایت قابل ترجیح ہے'

کسی کے نزدیک دوسری۔ اس اعتبار سے جزئیات میں تھوڑا بہت فرق ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ دلیل یہی رہے گی کہ رسول اللہﷺ اور صحابہ کرامؓ کا عمل یہ تھا۔ حضور اکرمﷺ کا یہ فرمان بھی نوٹ کر لیجیے: ((فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ))[۲] ''تم پر میری سنت اختیار کرنا لازم ہے اور میرے خلفاءِ راشدین کی سنت جو ہدایت یافتہ ہیں''۔ چنانچہ حضورﷺ کا عمل اور خلفاء راشدین کا عمل ہمارے لیے لائق تقلید ہے۔ پھر اسی سے متصل وہ چیزیں ہیں جن پر ہماری چودہ سو برس کی تاریخ میں اُمت کا اجماع رہا ہے۔ اب دنیا اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دے کر ہم پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور ہمیں بنیاد پرست (fundamentalist) کی گالی دے کر چاہتی ہے کہ ہمارے اندر معذرت خواہانہ رویہ پیدا کر دے' مگر ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ان باتوں سے قطعاً متاثر ہوئے بغیر دین کے عملی پہلو کے بارے میں پیچھے سے پیچھے جاتے ہوئے ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ﴾ تک پہنچ جائیں!

بدقسمتی سے ہمارے عام علماء کا حال یہ ہے کہ انہوں نے عربی علوم تو پڑھے ہیں' عربی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں' مگر وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ انہوں نے سائنس نہیں پڑھی' وہ جدید علوم سے واقف نہیں' وہ نہیں جانتے آئن سٹائن کس بلا کا نام ہے اور اس شخص کے ذریعے طبیعیات کے اندر کتنی بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ نیوٹونین ایرا کیا تھا اور آئن سٹائن کا دَور کیا ہے' انہیں کیا پتہ! آج کائنات کا تصور کیا ہے' ایٹم کی ساخت کیا ہے' انہیں کیا معلوم! ایٹم تو پرانی بات ہو گئی' اب تو انسان نیوٹرون پروٹون سے بھی کہیں آگے کی باریکیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ان چیزوں کو نہیں جانیں گے تو ان حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہو گا۔ مظاہرِ طبیعی کا معاملہ تو آگے سے آگے جا رہا ہے۔ اس کی تعبیر جدید سے جدید ہونی چاہیے۔ البتہ اس ضمن میں یہ فرق ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایک تو سائنس کے میدان کے محض نظریات (theories) ہیں جنہیں مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل نہیں ہے' جبکہ ایک وہ چیزیں ہیں جن کی تجرباتی توثیق ہو چکی ہے اور انہیں اب مسلمہ حقائق کا درجہ حاصل ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا ہو گا۔ خواہ مخواہ کوئی بھی نظریہ سامنے آ جائے یا کوئی مفروضہ (hypothesis) منظر عام پر آ جائے اس پر قرآن کو منطبق کرنے کی کوشش کرنا سعی لاحاصل بلکہ مضر شے ہے۔ لیکن اصولی طور پر ہمیں ان چیزوں کی تعبیر میں آگے سے آگے بڑھنا ہے۔ اور جہاں تک دین کے عملی حصے کا تعلق ہے جسے ہم شریعت کہتے ہیں' یعنی اوامر و نواہی' حلال و حرام' حدود و تعزیرات وغیرہ' ان تمام معاملات میں ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہو گا' یہاں تک کہ محمد رسول اللہﷺ کے قدموں میں اپنے آپ کو پہنچا دیجیے۔ اس لیے کہ دین اسی کا نام ہے۔ ؏ بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!

۷) فہم قرآن کے لیے جذبۂ انقلاب کی ضرورت

فہم قرآن کے لیے بنیادی اصول اور بنیادی ہدایات یا اشارات کے ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے یہ بات بڑی خوبصورتی سے تفہیم القرآن کے مقدمے میں کہی ہے کہ قرآن محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ کسی ڈرائنگ روم میں یا کتب خانے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ کوئی محقق' یا ریسرچ سکالر ڈکشنریوں اور تفسیروں کی مدد سے اسے سمجھنا چاہے تو نہیں سمجھ سکے گا۔ اس لیے کہ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

''......اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں! اسے تو پوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں......''

قرآن مجید کی بہت سی بڑی اہم حقیقتیں اس کے بغیر منکشف نہیں ہوں گی' اس لیے کہ قرآن ایک ''کتابِ انقلاب'' (Manual of Revolution) ہے۔ اس قرآن نے انسانی جدوجہد کے ذریعے عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔ محمد رسول اللہﷺ اور آپؐ کے ساتھی رضی اللہ عنہم ایک حزب اللہ تھے' ایک جماعت اور ایک پارٹی تھے' انہوں نے دعوت اور انقلاب کے تمام مراحل کو طے کیا اور ہر مرحلے پر اس کی مناسبت سے ہدایات نازل ہوئیں۔ ایک مرحلہ وہ بھی تھا کہ حکم دیا جا رہا تھا کہ مار کھاؤ لیکن ہاتھ مت اٹھاؤ: ﴿كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ﴾ (النساء:۷۷)۔ پھر ایک مرحلہ وہ بھی آیا کہ حکم دے دیا گیا کہ اب آگے بڑھو اور جواب دو' انہیں قتل کرو۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹) ''اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اور اُن کو قتل کر دو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے''۔

دونوں مراحل میں یقیناً فرق ہے' بلکہ بظاہر تضاد ہے' لیکن جاننا چاہیے کہ یہ ایک ہی جدوجہد کے دو مختلف مراحل ہیں۔ پھر ایک داعی جب دعوت دیتا ہے تو جو مسائل اسے درپیش ہوتے ہیں ان کو ایک ایسا شخص قطعاً نہیں جان سکتا جس نے اُس کوچے میں قدم ہی نہیں رکھا ہے۔ اسے کیا احساس ہو گا کہ محمد رسول اللہﷺ سے یہ کیوں کہا جا رہا ہے: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۞ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۞ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۞﴾ ''قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں! آپ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور آپ کے لیے تو بے انتہا اجر ہے''۔ یعنی اے نبیؐ! آپ محزون اور غمگین نہ ہوں۔ آپ ان کے کہنے سے (معاذ اللہ) مجنون تو نہیں ہو جائیں گے۔ ایسے الفاظ جب کسی کو کہے جاتے ہیں تو اس کا ہی دل جانتا ہے کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔ اندازہ لگایئے کہ قریش مکہ سے اس قسم کے الفاظ سن کر قلبِ محمدیؐ پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہو گی۔ یہ قرآن ہم پر reveal نہیں ہو سکتا جب تک ان احساسات و کیفیات کے ساتھ ہم خود دوچار نہ ہوں۔ جب تک کہ ہماری کیفیات و احساسات اس کے ساتھ مماثلت نہ رکھیں ہم کیسے سمجھیں گے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کس کیفیت کے اندر کہا جا رہا ہے۔

میڈیکل کالج میں داخل ہونے والے طلبہ سب سے پہلے جس کتاب سے متعارف ہوتے ہیں وہ ''Manual of Dissection'' ہے۔ اس میں ہدایات ہوتی ہیں کہ لاش کے بدن پر یہاں شگاف لگاؤ اور کھال ہٹاؤ تو تمہیں یہ چیز نظر آئے گی'

یہاں شگاف لگاؤ تو تمہیں فلاں شے نظر آئے گی' اسے یہاں سے ہٹاؤ گے تو تمہیں اس کے پیچھے فلاں چیز چھپی ہوئی نظر آئے گی۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم ''Manual of Revolution'' ہے۔ جب تک کوئی شخص انقلابی جدوجہد میں شریک نہیں ہوگا قرآن حکیم کے معارف کا بہت بڑا خزانہ اُس کے لیے بند رہے گا۔ ایک شخص فقیہہ ہے' مفتی ہے تو وہ فقہی احکام کو ضرور اس کے اندر سے نکال لے گا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض تفاسیر ''احکام القرآن'' کے نام سے لکھی گئی ہیں جن میں صرف اُن ہی آیات کے بارے میں گفتگو اور بحث ہے جن سے کوئی نہ کوئی فقہی حکم مستنبط ہوتا ہے۔ مثلاً حلت و حرمت کا حکم' کسی شے کے فرض ہونے کا حکم جس سے عمل کا معاملہ متعلق ہے۔ باقی تو گویا قصص ہیں' تاریخی حقائق و واقعات ہیں۔ یہاں تک کہ قصہ آدم و ابلیس جو سات مرتبہ قرآن میں آیا ہے' یا ایمانی حقائق کے لیے جو دلائل و براہین ہیں ان سے کوئی گفتگو نہیں کی گئی' بلکہ صرف احکام القرآن جو قرآن کا ایک حصہ ہے' اسی کو اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن کے تدریجاً نزول کا سبب یہ ہے کہ صاحبِ قرآن ﷺ کی جدوجہد کے مختلف مراحل کو سمجھا جائے' ورنہ فقہی احکام تو مرتب کر کے دیے جا سکتے تھے' جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیے گئے تھے۔ ''احکامِ عشرہ'' تختیوں پر کندہ تھے جو موسیٰ ؑ کے سپرد کر دیے گئے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد جس جس مرحلے سے گزرتی رہی قرآن میں اس مرحلے سے متعلق آیات نازل ہوتی رہیں۔ تنزیل کی ترتیب کے اندر مضمر اصل حکمت یہی تو ہے کہ آنحضور ﷺ کی جدوجہد' حرکت اور دعوت کے مختلف مراحل سامنے آ جاتے ہیں۔ اب بھی قرآن کی بنیاد پر اور منہجِ انقلابِ نبویؐ پر جو جدوجہد ہوگی اسے ان تمام مراحل سے ہو کر گزرنا ہوگا۔ چنانچہ کم سے کم یہ تو ہو کہ اس جدوجہد کو علمی طور پر فہم کے لیے انسان سامنے رکھے۔ اگر علمی اعتبار سے سیرت النبیؐ کا خاکہ ذہن میں موجود نہ ہو تو فہم کسی درجے میں بھی حاصل نہیں ہوگا۔ فہمِ حقیقی تو اُسی وقت حاصل ہوگا جب آپ خود اس جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور وہی مسائل آپ کو پیش آ رہے ہیں تو اب معلوم ہوگا کہ یہ مقام اور مرحلہ یا مسئلہ وہ تھا جس کے لیے یہ ہدایتِ قرآنی آئی تھی۔

۸) قرآن کے منزّل مِن اللہ ہونے کا ثبوت

اس ضمن میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ یاد رکھیے کہ ثبوت دو قسم کے ہوتے ہیں' خارجی اور داخلی۔ خارجی ثبوت خود محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا ہے کہ یہ کلام مجھ پر نازل ہوا۔ پھر آپ ﷺ کی شہادت بھی دو حیثیتوں سے ہے۔ آپ ﷺ کی شخصاً شہادت زیادہ نمایاں اُس وقت تھی جب کہ قرآن نازل ہوا اور حضور ﷺ خود موجود تھے۔ وہ لوگ بھی وہاں موجود تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی چالیس سالہ زندگی کا مشاہدہ کیا تھا' جنہیں کاروباری شخصیت کی حیثیت سے آپؐ کے معاملات کا تجربہ تھا۔ جن کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت' دیانت' امانت اور ایفائے عہد کا پورا نقشہ موجود تھا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جن کے سامنے چہرۂ محمدیؐ موجود تھا۔ سلیم الفطرت انسان آپ ﷺ کا روئے انور دیکھ کر پکار اٹھتا تھا: سُبحَانَ اللّٰہِ مَا ھٰذَا بِوَجْہِ کَذَّابٍ (اللہ پاک ہے' یہ چہرہ کسی جھوٹے کا ہو ہی نہیں سکتا)۔ تو حضور ﷺ کی شخصیت' آپؐ کی ذات اور آپؐ کی شہادت کہ یہ قرآن مجھ پر نازل ہوا' سب سے بڑا ثبوت تھا۔

اس اعتبار سے یاد رکھیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن باہم ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن محمد ﷺ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے: ﴿یٰسٓ ① وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ② اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ③﴾ قرآن گواہی دے رہا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن کے مُنزل من اللہ ہونے کا ثبوت ذاتِ محمدیؐ ہے۔ اس کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت رسول اللہ ﷺ کی ذات' آپؐ کی شخصیت' آپؐ کی سیرت و کردار' آپؐ کا اخلاق' آپؐ کا وجود' آپؐ کی شبیہہ اور چہرہ سامنے تھا۔ دوسرا پہلو جو دائمی ہے اور آج بھی ہے وہ حضور ﷺ کا وہ کارنامہ ہے جو تاریخ کی اَن مٹ شہادت ہے۔ آپ ایچ جی ویلز' ایم این رائے یا ڈاکٹر مائیکل ہارٹ سے پوچھیں کہ وہ کتنا عظیم کارنامہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا۔ اور آپؐ خود کہہ رہے ہیں کہ میرا آلہ انقلاب قرآن ہے' یہی میرا اسلحہ اور اصل طاقت ہے' یہی میری قوت کا سرچشمہ اور میری تأثیر کا منبع ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی؟ یہ تو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی خارجی شہادت ہے۔ یعنی ''حضورؐ کی شخصیت''۔ شہادت کا یہ پہلو حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں اور آپ ﷺ کی حیاتِ دنیاوی کے دوران زیادہ نمایاں تھا۔ اور جہاں تک آپؐ کے کارنامے کا تعلق ہے اس پر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دیکھیے مائیکل ہارٹ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے:

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

یعنی تاریخ انسانی میں صرف وہی واحد شخص ہیں جو سیکولر اور مذہبی دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب رہے ——— اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو خارجی ثبوت گویا بتمام و کمال حاصل ہو گیا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ انسان کا دل گواہی دے۔ داخلی ثبوت انسان کا اپنا باطنی تجربہ ہوتا ہے۔ اگر ہزار آدمی کہیں چینی میٹھی ہے مگر آپ نے نہ چکھی ہو تو آپ کہیں گے کہ جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں میٹھی ہے تو ہوگی میٹھی۔ ظاہر ہے ایک ہزار آدمی مجھے کیوں دھوکہ دینا چاہیں گے' یقیناً میٹھی ہوگی۔ لیکن ''ہوگی'' سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ البتہ جب انسان چینی کو چکھ لے اور اس کی اپنی حسِ ذائقہ بتا رہی ہو کہ یہ میٹھی ہے تو اب ''ہوگی'' نہیں بلکہ ''ہے''۔ ''ہوگی'' اور ''ہے'' میں درحقیقت انسان کے ذاتی تجربے کا فرق ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج کی دنیا صرف خارجی تجربات کو جانتی ہے۔ ایک تجربہ اس سے کہیں زیادہ معتبر ہے اور وہ باطنی تجربہ ہے' یعنی کسی شے پر آپ کا دل گواہی دے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ اِلا
لغتِ غریب' جب تک تیرا دل نہ دے گواہی!

لا الٰہ الاّ اللہ کے لیے اگر دل نے گواہی نہ دی تو انسان خواہ عربیُ النسل ہو' عربی زبان جانتا ہو' لیکن اس کے لیے یہ کلمہ لغتِ غریب ہی ہے' نامانوس سی بات ہے' اس کے اندر پیوست نہیں ہے' اس کو متاثر نہیں کرتی۔ قرآن انسان کی اپنی فطرت کو اپیل کرتا ہے اور انسان کو اپنے من میں جھانکنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے من میں جھانکو' دیکھو تو سہی' غور تو کرو: ﴿اَفِی

اَللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؟﴾(ابراھیم: ۱۰) کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ ﴿اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی؟﴾ (الانعام: ۱۹) کیا تم واقعتاً یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ ‘‘

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں ہے!

علامہ ابن قیمؒ نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ مصحف سے نہیں پڑھ رہے بلکہ قرآن اُن کے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے' وہاں سے پڑھ رہے ہیں۔ گویا فطرتِ انسانی کو قرآن مجید کے ساتھ اتنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔

ہمارے دَور کے ایک صوفی بزرگ کہا کرتے ہیں کہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ جیسے ایک گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور باہم انسیت محسوس کرتے ہیں ایسا ہی معاملہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم کا ہے۔ قرآن کو پڑھ کر اور سن کر روحِ انسانی محسوس کرتی ہے کہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرا ہے۔ جہاں سے میں آئی ہوں یہ کلام بھی وہیں سے آیا ہے۔ یقیناً اس کلام کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرے وجود' میری ہستی اور میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ ہم آہنگی ہے جو اصل باطنی تجربہ بن جائے تب ہی یقین ہوتا ہے کہ یہ کلام واقعتاً اللہ کا ہے۔

۞۞۞

بابِ ہفتم

اعجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ

قرآن اور صاحبِ قرآنؐ کا باہمی تعلق

میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید اور نبی اکرمﷺ دونوں ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن کے مُنَزَّل مِنَ اللّٰہ ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے معتبر خارجی گواہی نبی اکرمﷺ کی اپنی گواہی ہے۔ آپؐ کی شخصیت' آپؐ کا کردار' آپؐ کا چہرۂ انور اپنی اپنی جگہ پر گواہ ہیں۔ ہمارے لیے اگرچہ آپﷺ کی سیرت آج بھی زندہ و پائندہ ہے' کتابوں میں درج ہے' لیکن ایک مجسّم انسانی شخصیت کی صورت میں آپﷺ ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں' ہم آپﷺ کے روئے انور کی زیارت سے محروم ہیں۔ تاہم آپﷺ کا کارنامہ زندہ و تابندہ ہے اور اس کی گواہی ہر شخص دے رہا ہے۔ ہر مؤرخ نے تسلیم کیا ہے' ہر مفکر نے مانا ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ تھا جو حضورﷺ نے برپا کیا۔ آپؐ کی یہ عظمت آج بھی مبرہن ہے' آشکارا ہے' اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ قرآن کے مُنَزَّل مِنَ اللّٰہ اور کلامِ الٰہی ہونے پر سب سے بڑی خارجی گواہی خود نبی اکرمﷺ ہیں' اور نبی اکرمﷺ کے نبی اور رسول ہونے کا سب سے بڑا گواہ' سب سے بڑا شاہد اور سب سے بڑا ثبوت خود قرآن مجید ہے۔

اس اعتبار سے یہ دونوں جس طرح لازم و ملزوم ہیں اس کے لیے میں قرآن حکیم کے دو مقامات سے استشہاد کر رہا ہوں۔ سورۃ البیّنہ میں فرمایا:

﴿لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ ①﴾

’’اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اور مشرک باز آنے والے نہ تھے یہاں تک کہ اُن کے پاس ’بیّنہ‘ آ جاتی۔‘‘

’’بیّنۃ‘‘ کھلی اور روشن دلیل کو کہتے ہیں۔ ایسی روشن حقیقت جس کو کسی خارجی دلیل کی مزید حاجت نہ ہو وہ ’’بیّنہ‘‘ ہے۔ جیسے ہم اپنی گفتگو میں کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل بیّن ہے' بالکل واضح ہے' اس پر کسی قیل وقال کی حاجت ہی نہیں ہے۔ بلکہ اگر بیّنہ پر کوئی دلیل لانے کی کوشش کی جائے تو کسی درجے میں شک و شبہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے' اس پر یقین میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بیّنہ کیا ہے؟ فرمایا:

﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً ② فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ③﴾

’’ایک رسول اللہ کی جانب سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے' جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔‘‘

یہاں قرآن حکیم کی سورتوں کو اللہ کی کتابوں سے تعبیر کیا گیا ہے' جو قائم و دائم ہیں اور ہمیشہ ہمیش رہنے والی ہیں۔ تو گویا رسولؐ کی شخصیت اور اللہ کا یہ کلام جو اُن پر نازل ہوا' دونوں مل کر ''بیّنہ'' بنتے ہیں۔

میں نے قرآن فہمی کا یہ اصول بارہا عرض کیا ہے کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم سے کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ اس کی نظیر سورۃ الطلاق میں موجود ہے۔ اس کی آیت ۱۰ اِن الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝۱۰﴾ ''اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کر دیا ہے''۔ اور یہ ذکر کیا ہے؟ فرمایا: ﴿رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ﴾ ''ایک ایسا رسول جو تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہے اللہ کی آیات جو ہر شے کو روشن کر دینے والی (اور ہر حقیقت کو مبرہن کر دینے والی) ہیں' تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے''۔ یہاں ''اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ'' کے بجائے ''اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ'' آیا ہے۔ ''بیّن'' وہ چیز ہے جو خود روشن ہے اور ''مُبَیِّن'' وہ چیز ہے جو دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہے' حقائق کو اُجاگر کرتی ہے۔ تو یہاں پر ذکر کی جو تاویل کی گئی کہ ﴿رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ﴾ اس سے واضح ہوا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے اور ملے ہوئے ہیں کہ ایک حیاتیاتی وجود (Organic Whole) بن گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لیے شاہد بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے complimentary بھی ہیں۔ اس حوالے سے یہ دونوں حقیقتیں اس طرح جمع ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جا سکتیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ: قرآن حکیم

اگلی بات یہ سمجھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا بالفاظِ دیگر آپؐ کا اصل معجزہ' بلکہ واحد معجزہ قرآن حکیم ہے۔ یہ بات ذرا اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ''معجزہ'' کا لفظ ہمارے ہاں بہت عام ہو گیا ہے اور ہر خرقِ عادت شے کو معجزہ شمار کیا جاتا ہے۔ معجزہ کے لفظی معنی عاجز کر دینے والی شے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ''عجز'' مادہ سے بہت سے الفاظ آتے ہیں' لیکن ہمارے ہاں اصطلاح کے طور پر اس لفظ کا جو اطلاق کیا جاتا ہے وہ قرآن حکیم میں مستعمل نہیں ہے' بلکہ اللہ کے رسولوں کو جو معجزات دیے گئے انہیں بھی آیات کہا گیا ہے۔ انبیاء ورُسل اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی اللہ کی نشانیاں لے کر آئے۔

اس اعتبار سے معجزہ کا لفظ جس معنی میں ہم استعمال کرتے ہیں' اس معنی میں یہ قرآن مجید میں مستعمل نہیں ہے۔ البتہ وہ طبیعی قوانین (Physical Laws) جن کے مطابق یہ دنیا چل رہی ہے' اگر کسی موقع پر وہ ٹوٹ جائیں اور ان کے ٹوٹ جانے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی مشیتِ خصوصی ظاہر ہو تو اسے خرقِ عادت کہتے ہیں۔ مثلاً قانون تو یہ ہے کہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کی ضرب لگائی اور سمندر پھٹ گیا' یہ خرقِ عادت ہے' یعنی جو عادی قانون ہے وہ ٹوٹ گیا۔ ''خرق'' پھٹ جانے کو کہتے ہیں' جیسے سورۃ الکہف میں یہ لفظ آیا ہے ''خَرَقَهَا'' یعنی اس اللہ کے بندے نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے' کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ پس جب بھی کوئی طبیعی قانون ٹوٹے گا تو وہ خرقِ عادت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان خرقِ عادت واقعات کے ذریعے سے بہت سے قوانین قدرت کو توڑ کر اپنی خصوصی مشیت اور خصوصی قدرت کا اظہار فرماتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے ہاں مسلم ہے کہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے بھی جن کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا چاہے کرتا ہے' لیکن اصطلاحاً ہم انہیں کرامات کہتے ہیں۔ خرقِ عادت یا کرامات اپنی جگہ پر ایک مستقل مضمون ہے۔

معجزہ بھی خرقِ عادت ہوتا ہے' لیکن رسول کا معجزہ وہ ہوتا ہے جو دعوے کے ساتھ پیش کیا جائے اور جس میں تحدی (challenge) بھی موجود ہو۔ یعنی جسے رسول خود اپنی رسالت کے ثبوت کے طور پر پیش کرے اور پھر اُس میں مقابلے کا چیلنج دیا جائے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو معجزات عطا کیے ان میں ''یدِ بیضا'' اور ''عصا'' کی حیثیت اصل معجزے کی تھی۔ ویسے آیات اور بھی دی گئی تھیں جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ﴾ ''اور بیشک ہم نے موسیٰ کو نو روشن نشانیاں دیں''۔ مگر یہ اُس وقت کی بات ہے جب آپؑ ابھی مصر کے اندر تھے۔ پھر جب آپؑ مصر سے باہر نکلے تو عصا کی کرامات ظاہر ہوئیں کہ اس کی ضرب سے سمندر پھٹ گیا' اس کی ضرب سے چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ تمام چیزیں خرقِ عادت ہیں' لیکن اصل معجزے دو تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ یہ میری رسالت کا ثبوت ہے۔

جب آپؑ فرعون کے دربار میں پہنچے اور آپ نے اپنی رسالت کی دعوت پیش کی تو دلیل رسالت کے طور پر فرمایا کہ میں اس کے لیے سند (سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ) بھی لے کر آیا ہوں۔ فرعون نے کہا کہ لاؤ پیش کرو تو آپؑ نے یہ دو معجزے پیش کیے۔ یہ دو معجزے جو اللہ کی طرف سے آپؑ کو عطا کیے گئے' آپؑ کی رسالت کی سند تھے۔ اس میں تحدی بھی تھی۔ لہٰذا مقابلہ بھی ہوا اور جادوگروں نے پہچان بھی لیا کہ یہ جادو نہیں ہے' معجزہ ہے۔ معجزہ جس میدان کا ہوتا ہے اسے اُسی میدان کے افراد ہی پہچان سکتے ہیں۔ جب جادوگروں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو عام دیکھنے والوں نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور یہ چھوٹے جادوگر ہیں' اس کا جادو زیادہ طاقتور نکلا' اس کے عصا نے بھی سانپ اور اژدھا کی شکل اختیار کی تھی اور ان جادوگروں کی رسیوں اور چھڑیوں نے بھی سانپوں کی شکل اختیار کر لی تھی' البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کا بڑا سانپ باقی تمام سانپوں کو نگل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجمع ایمان نہیں لایا' لیکن جادوگر تو جانتے تھے کہ اُن کے فن کی رسائی کہاں تک ہے' اس لیے اُن پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ جادو نہیں ہے' کچھ اور ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کا اصل احساس عرب کے شعراء' خطیبوں اور زبان دانوں کو ہوا تھا۔ عام آدمی نے بھی اگرچہ محسوس کیا کہ یہ خاص کلام ہے' بہت پُر تاثیر اور میٹھا کلام ہے' لیکن اس کا معجزہ ہونا یعنی عاجز کر دینے والا معاملہ تو اسی طرح ثابت ہوا کہ قرآن مجید میں بار بار چیلنج دیا گیا کہ اس جیسا کلام پیش کرو۔ اس اعتبار سے جان لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

آپ ﷺ کے خرقِ عادت معجزات تو بے شمار ہیں۔ شقِ قمر قرآن حکیم سے ثابت ہے' لیکن یہ آپ ﷺ نے دعوے کے ساتھ نہیں دکھایا' نہ ہی اس پر کسی کو چیلنج کیا' بلکہ آپؐ سے جو مطالبے کیے گئے تھے کہ آپؐ یہ یہ کر کے دکھائیے' اُن میں سے کوئی بات اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوئی۔ اللہ چاہتا تو اُن کا مطالبہ پورا کرا دیتا' لیکن اُن مطالبوں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ البتہ خرقِ

عادت واقعات بے شمار ہیں۔ جانوروں کا بھی آپؐ کی بات کو سمجھنا اور آپؐ سے عقیدت کا اظہار کرنا بہت مشہور ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ۶۳ اونٹوں کو حضورﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے نحر کیا تھا۔ قطار میں سو اونٹ کھڑے کیے گئے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک اونٹ جب گرتا تھا تو اگلا خود آگے آجاتا تھا۔ اسی طرح ''ستونِ حنانہ'' کا معاملہ ہوا۔ حضورﷺ مسجد نبویؐ میں کھجور کے ایک تنے کا سہارا لے کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے' مگر جب اِس مقصد کے لیے منبر بنا دیا گیا اور آپؐ پہلی مرتبہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے تو اُس سوکھے ہوئے تنے میں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو' اسی لیے تو اسے ''حنانہ'' کہتے ہیں۔ ایسے ہی کئی مواقع پر تھوڑا کھانا بہت سے لوگوں کو کفایت کر گیا۔

اِن خرقِ عادت واقعات کو بعض عقلیت پسند (Rationalists) اور سائنسی مزاج کے حامل لوگ تسلیم نہیں کرتے۔ پچھلے زمانے میں بھی لوگ ان کا انکار کرتے رہے ہیں۔ اس پر مولانا روم نے خوب فرمایا ہے کہ: ؎

فلسفی کو منکر حنانہ است
از حواسِ انبیا بیگانہ است!

بہر حال خرقِ عادت واقعات حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بہت ہیں۔ (تفصیل دیکھنا ہو تو ''سیرت النبیؐ'' از مولانا شبلی کی ایک ضخیم جلد صرف حضورﷺ کے خرقِ عادت واقعات پر مشتمل ہے) لیکن جیسا کہ اوپر گزرا' معجزہ دعوے کے ساتھ اور رسالت کے ثبوت کے طور پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال حضرت عیسٰیؑ کی آئی ہے کہ آپؑ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو میں مُردوں کو زندہ کر کے دکھا رہا ہوں۔ میں گارے سے پرندے کی صورت بناتا ہوں اور اُس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑتا ہوا پرندہ بن جاتا ہے۔ خرقِ عادت کا معاملہ تو غیر نبی کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے لیے بھی اس طرح کے حالات پیدا کر سکتا ہے۔ اُن کا اللہ کے ہاں جو مقام و مرتبہ ہے اس کے اظہار کے لیے کرامات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ یہ چیزیں بعید نہیں ہیں' لیکن انبیاء کی کرامات کو عرفِ عام میں ''معجزات'' کہا جاتا ہے اور غیر انبیاء اور اولیاء کے لیے ''کرامات'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معجزہ وہ ہے جسے اللہ کا رسول دعوے کے ساتھ پیش کرے اور چیلنج کرے۔

یہ بات کہ قرآن مجید ہی حضورﷺ کا اصل معجزہ ہے' دو اعتبارات سے قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ ایک مثبت انداز ہے' جیسے سورۂ یٰسٓ کی ابتدائی آیات میں فرمایا: ﴿یٰسٓ ① وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ② اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ③﴾ ''یٰسٓ۔ قسم ہے قرآن حکیم کی (اور قسم کا اصل فائدہ شہادت ہوتا ہے' یعنی گواہ ہے یہ قرآن حکیم) کہ یقیناً (اے محمدﷺ) آپ اللہ کے رسول ہیں''۔ خطاب بظاہر حضورﷺ سے ہے' حالانکہ حضورؐ کو یہ بتانا مقصود نہیں ہے' بلکہ مخاطبین یعنی اہل عرب اور اہل مکہ کو سنایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن شاہد ہے' یہ ثبوت ہے' یہ دلیلِ قطعی ہے کہ محمدﷺ اللہ کے رسول ہیں' یہ قرآن پکار پکار کر محمد رسول اللہﷺ کی رسالت کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم کے چار مقامات اور ہیں جن میں یہی آیت ﴿اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ مقدر ہے' اگرچہ بیان نہیں ہوئی۔ سورۂ صٓ کا آغاز ہوتا ہے: ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ① بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ ②﴾ ''ص' قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت (یاد دہانی) والا ہے۔ لیکن وہ لوگ کہ جو منکر ہیں' گھمنڈ اور ضد میں پڑے ہوئے ہیں''۔ یہاں ''صٓ'' ایک حرف ہے' لیکن اس سے آیت نہیں بنی' جبکہ ''یٰسٓ'' ایک آیت ہے۔ سورۂ صٓ کی پہلی آیت قسم پر مشتمل ہے۔ ''بَلْ'' سے جو دوسری آیت شروع ہو رہی ہے یہ ثابت کر رہی ہے کہ مقسمٌ علیہ (جس چیز پر قسم کھائی جا رہی ہے) یہاں محذوف ہے اور وہ ﴿اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ ہے۔ گویا کہ معناً اسے یوں پڑھا جائے گا: ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ① (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا......﴾۔ اسی طرح سورۂ قٓ میں ہے: ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ① (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ ......﴾۔

ایسے ہی دو سورتیں الزخرف اور الدخان ''حٰمٓ'' سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کی پہلی دو آیات بالکل ایک جیسی ہیں: ﴿حٰمٓ ① وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ②﴾۔ پہلی آیت حروف مقطعات پر اور دوسری آیت قسم پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مقسمٌ علیہ (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) محذوف ماننا پڑے گا۔ گویا: ﴿حٰمٓ ① وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ② (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ③﴾ اور: ﴿حٰمٓ ① وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ② (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ ③﴾۔ یہ ایک اسلوب ہے کہ محمد رسول اللہﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کی قسم کھائی گئی' یعنی قرآن کی گواہی اور شہادت پیش کی گئی۔ یہ اس بات کو کہنے کا ایک اسلوب ہے کہ حضورﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا آپؐ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

قرآن کا دعویٰ اور چیلنج

پہلے گزر چکا ہے کہ معجزے میں تحدی (چیلنج) بھی ضروری ہے اور دعویٰ بھی۔ لہٰذا وہ مقامات گن لیجیے جن میں چیلنج ہے کہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ محمدﷺ کا کلام ہے' انسانی کلام ہے جسے محمدﷺ نے خود گھڑ لیا ہے' یہ اُن کی اپنی اختراع ہے تو تم مقابلہ کرو اور ایسا ہی کلام پیش کرو۔ قرآن مجید میں ایسے پانچ مقامات ہیں۔ سورۃ الطّور میں فرمایا:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَہٗ ۚ بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِہٖٓ اِنْ کَانُوْا صٰدِقِیْنَ ﴿۳۴﴾﴾

''کیا اُن کا یہ کہنا ہے کہ یہ محمدؐ نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں۔ پھر چاہیے کہ وہ اسی طرح کا کوئی کلام پیش کریں اگر وہ سچے ہیں۔''

قَالَ' یَقُوْلُ کا معنی ہے کہنا۔ جبکہ تَقَوَّلَ' یَتَقَوَّلُ کا مفہوم ہے تکلّف کر کے کہنا' یعنی محنت کر کے کلام موزوں کرنا (جس کے لیے انگریزی میں composition کا لفظ ہے۔) تو کیا اُن کا خیال ہے کہ یہ محمدﷺ نے خود کہہ لیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں' لہٰذا اس طرح کی کٹ حجتیاں کر رہے ہیں۔ اگر یہ سچے ہیں تو ایسا ہی کلام پیش کریں۔ آخر یہ بھی انسان ہیں' ان میں بڑے بڑے شعراء اور بڑے قادر الکلام خطیب موجود ہیں۔ ان میں وہ شعراء بھی ہیں جن کو دوسرے شعراء سجدہ کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب مل کر ایسا کلام پیش کریں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ لَّـئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾﴾

"(اے نبیؐ!ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمام جن و انس جمع ہو جائیں (اور اپنی پوری قوت وصلاحیت اور اپنی تمام ذہانت و فطانت' قادر الکلامی کو جمع کر کے کوشش کریں) کہ اِس قرآن جیسی کتاب پیش کر دیں تو وہ ہرگز ایسی کتاب نہیں لا سکیں گے چاہے وہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں۔"

یہ تو بحیثیت مجموعی پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے سے مخلوق کے عاجز ہونے کا دعویٰ ہے جو قرآن مجید نے دو مقامات پر کیا ہے۔ سورۂ یونس میں اس سے ذرا نیچے اتر کر' جسے برسبیل تنزلّ کہا جاتا ہے' فرمایا کہ پورے قرآن کی نظیر نہیں لا سکتے تو ایسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ! ارشاد ہوا:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۳﴾﴾ (ھود)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود گھڑ کر لے آیا ہے؟ (اے نبیؐ!ان سے) کہیے پس تم بھی دس سورتیں بنا کر لے آؤ ایسی ہی گھڑی ہوئی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔"

اس کے بعد دس سے نیچے اتر کر ایک سورۃ کا چیلنج بھی دیا گیا:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾﴾ (یونس)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود بنا کر لے آیا ہے؟ (اے نبیؐ!ان سے) کہیے پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آؤ ایسی ہی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔"

یہ چاروں مقامات تو مکی سورتوں میں ہیں۔ پہلی مدنی سورۃ "البقرۃ" ہے۔ اس میں بڑے اہتمام کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾﴾

"اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورۃ تم بھی (موزوں کر کے) لے آؤ اور اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (ان سب کو جمع کر لو) اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو' اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے' تو بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے' یہ منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"

یہاں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ حقیقت میں تم سچے نہیں ہو' تمہارا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے' لیکن چونکہ تم زبان سے تنقید کر رہے ہو اور جھٹلا رہے ہو تو اگر واقعتاً تمہیں شک ہے تو اِس شک کو رفع کرنے کے لیے ہمارا یہ چیلنج موجود ہے۔

یہ ہیں قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے دو اسلوب۔ ایک مثبت انداز ہے کہ قرآن گواہ ہے اس پر کہ اے محمد! (ﷺ) آپ اللہ کے رسول ہیں' اور دوسرا انداز چیلنج کا ہے کہ اگر تمہیں اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسا کلام تم بھی بنا کر لے آؤ۔

قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟

اب اس ضمن میں تیسری ذیلی بحث یہ ہو گی کہ قرآن مجید کس کس اعتبار سے معجزہ ہے۔ یہ مضمون اتنا وسیع اور اتنا متنوّع الاطراف ہے کہ "وجوہِ اعجاز القرآن" پر پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر بات ہے اس وقت اِس کا احاطہ مقصود نہیں ہے' صرف موٹی موٹی باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

اصل شے تو اِس کی تاثیر قلب ہے کہ یہ دل کو لگنے والی بات ہے۔ اس کا اصل اعجاز یہی ہے کہ یہ دل کو جا کر لگتی ہے بشرطیکہ پڑھنے والے کے اندر تعصب' ضد اور ہٹ دھرمی نہ ہو اور اسے زبان سے اتنی واقفیت ہو جائے کہ براہِ راست قرآن اس کے دل پر اتر سکے۔ یہ قرآن کے اعجاز کا اصل پہلو ہے۔ لیکن اضافی طور پر جان لیجیے کہ جس وقت قرآن نازل ہوا اُس وقت کے اعتبار سے اس کے معجزہ ہونے کا نمایاں اور اہم تر پہلو اس کی ادبیت' اِس کی فصاحت و بلاغت' اس میں الفاظ کا انتخاب' بندشیں اور ترکیبیں' اس کی مٹھاس اور اس کا صوتی آہنگ ہے۔ یہ درحقیقت نزول کے وقت قرآن کے معجزہ ہونے کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ہر رسول کو اُسی طرز کا معجزہ دیا گیا جن چیزوں کا اُس کے زمانے میں سب سے زیادہ چرچا اور شغف تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو عام تھا لہٰذا مقابلے کے لیے آپؑ کو وہ چیزیں دی گئیں جن سے آپؑ جادوگروں کو شکست دے سکیں۔ حضور ﷺ نے جس قوم میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اُس قوم کا اصل ذوق قدرتِ کلام تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اصل میں بولنے والے تو ہم ہی ہیں' باقی دنیا تو گونگی ہے۔ ان کی زبان دانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی پسند کی اشیاء کے نام رکھنا شروع کرتے تو ہزاروں نام رکھ دیتے۔ چنانچہ عربی میں شیر اور تلوار کے لیے پانچ پانچ ہزار الفاظ ہیں۔ گھوڑے اور اونٹ کے لیے لاتعداد الفاظ ہیں۔ یہ اُن کی قادر الکلامی ہے کہ کسی شے کو اُس کی ہر ادا کے اعتبار سے نیا نام دے دیتے۔ گھوڑا اُن کی بڑی محبوب شے ہے' لہٰذا اُس کے نامعلوم کتنے نام ہیں۔ شعر و شاعری میں ان کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ اُن کے ہاں سالانہ مقابلے ہوتے تھے تاکہ اس سال کے سب سے بڑے شاعر کا تعین کیا جائے۔ شعراء اپنے اپنے قصیدے لکھ کر لاتے تھے' مقابلہ ہوتا تھا۔ پھر جب فیصلہ ہوتا تھا کہ کس کا قصیدہ سب پر بازی لے گیا ہے تو باقی تمام شعراء اس کی عظمت کے اعتراف کے طور پر اُس کو سجدہ کرتے تھے۔ پھر وہ قصیدہ خانۂ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا تھا کہ یہ ہے اس سال کا قصیدہ۔ چنانچہ اس طرح کے سات قصیدے خانہ کعبہ میں آویزاں کیے گئے تھے جنہیں "سَبْعَة مُعَلَّقَة" کہا جاتا تھا۔ سبعۃ معلّقۃ کے آخری شاعر حضرت لبید رضی اللہ عنہ تھے جو ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا

کہ اے لبید! اب آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ تو جواب میں انہوں نے بڑا پیارا جملہ کہا کہ ''اَبَعْدَ الْقُرْاٰن؟'' یعنی کیا قرآن کے نزول کے بعد بھی؟ اب کسی کے لیے کچھ کہنے کا موقع باقی ہے؟ قرآن کے آ جانے کے بعد کوئی اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار کی کوشش کرسکتا ہے؟ گویا زبانیں بند ہوگئیں‘ اُن پر تالے پڑ گئے‘ ملک الشعراء نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔

جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے وہ آج بھی قرآن کے اِس اعجاز کو محسوس کر سکتے ہیں۔ غیر عرب لوگوں کے لیے اس کو محسوس کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی اپنی محنت سے عربی ادب کے اندر مولانا علی میاں (1) کی سی مہارت حاصل کر لے تو وہ واقعتاً اس کو محسوس کر سکے گا اور اس کی تحسین کر سکے گا کہ فصاحت و بلاغت میں قرآن کا کیا مقام ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے‘ البتہ اس کا صوتی آہنگ ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی قراءت کے اندر ایک معجزانہ تاثیر ہے جو قلب کے اندر عجیب کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔ قرآن کا صوتی آہنگ ہماری فطرت کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ قرآن کی یہ معجزانہ تاثیر آج بھی ویسی ہے جیسی نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ اس میں مرورِ ایام سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت‘ اس کی ''ادبیت‘ عذوبت اور اس کے صوتی آہنگ کی معجزانہ تاثیر پر مستزاد عہدِ حاضر میں قرآن کے اعجاز کے ضمن میں جو چیزیں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں اُن میں سے ایک چیز تو وہ ہے جس کا قرآن مجید نے بڑے صریح الفاظ میں ذکر کیا ہے:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾
(حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

''ہم عنقریب انہیں اپنی آیات دکھائیں گے آفاق میں بھی اور اُن کی اپنی جانوں میں بھی یہاں تک کہ یہ بات اُن پر واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے۔''

اِس آیت مبارکہ میں علمِ انسانی کے دائرہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور جدید اکتشافات وانکشافات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیاتِ آفاقی ہیں۔ فرانسیسی سرجن ڈاکٹر مورس بکائی کا پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ میرا دل اس پر مطمئن ہو گیا ہے کہ اس قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے سائنس نے غلط ثابت کیا ہو۔ البتہ اُس دَور میں جبکہ انسان کا اپنا ذہنی ظرف وسیع نہیں ہوا تھا‘ علومِ انسانی اور معلوماتِ انسانی کا دائرہ محدود تھا‘ اس وقت سائنسی اشارات کی حامل آیاتِ قرآنیہ کا کیا مفہوم سمجھا گیا‘ وہ بات اور ہے۔ کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے اصل اہمیت تو قرآن کے الفاظ کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے قرآن کا تورات کے ساتھ تقابل کیا ہے! تورات سے مراد Old Testament ہے۔ اناجیلِ اربعہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں‘ اُن میں تو کئی چیزیں ایسی ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اناجیل میں زیادہ تر اخلاقی مواعظ ہیں یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوانحِ حیات ہیں۔ تورات میں یہ مباحث موجود ہیں کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی‘ اللہ نے کیسے اسے بنایا۔ مختلف سائنسی phenomena اس میں موجود ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ فزکس میں آج سب سے زیادہ اہم موضوع جس پر تحقیق ہو رہی ہے‘ یہی ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی‘ ابتدائی حالات کیا تھے اور بعد ازاں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے اس اعتبار سے محسوس کیا کہ تورات میں تو ایسی چیزیں ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لیے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی۔ بخت نصر کے حملے میں یروشلم کو تہس نہس کر دیا گیا اور ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی‘ اس کی بنیادیں تک کھود ڈالی گئیں اور یروشلم کے بسنے والے چھ لاکھ کی تعداد میں قتل کر دیے گئے جبکہ بخت نصر چھ لاکھ کو قیدی بنا کر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے اپنے ہمراہ بابل لے گیا۔ چنانچہ یروشلم میں ایک متنفس بھی باقی نہیں رہا۔ آپ اندازہ کریں‘ اگر یہ اعداد و شمار صحیح ہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی چھ سو سال قبل یعنی آج سے ۲۶۰۰ برس قبل یروشلم بارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا اور اس شہر پر کیا قیامت گزری ہو گی! اس کے بعد سے وہ اصل تورات دنیا میں نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو جو احکامِ عشرہ (Ten Commandments) دیے گئے تھے وہ پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے تھے۔ یہ تختیاں بھی لاپتہ ہو گئیں اور باقی تورات کا وجود بھی باقی نہ رہا۔ قرآن حکیم میں ''صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى'' کا ذکر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے پانچ ہیں جو عہد نامۂ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابیں ہیں۔ سانحہ یروشلم کے قریباً ڈیڑھ سو برس بعد لوگوں نے تورات کو اپنی یادداشتوں سے مرتب کیا۔ چنانچہ اُس وقت کی نوعِ انسانی کی ذہنی اور علمی سطح جو تھی وہ اس پر لازمی طور پر اثر انداز ہوئی۔

ڈاکٹر مورس بکائی کے علاوہ میں ڈاکٹر کیتھ ایل مور کا حوالہ بھی دے چکا ہوں کہ وہ قرآن حکیم میں علمِ جنین سے متعلق اشارات پا کر کس قدر حیران ہوا کہ یہ معلومات چودہ سو برس پہلے کہاں سے آ گئیں! فزیکل سائنسز کے مختلف فیلڈ ہیں‘ ان میں جیسے جیسے علمِ انسانی ترقی کرتا جائے گا یہ بات مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی کہ یہ کلامِ حق ہے اور یہ کلام مظاہرِ طبیعی کے اعتبار سے بھی حق ثابت ہو رہا ہے۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

عہدِ حاضر کے اعتبار سے قرآن حکیم کے اعجاز کا دوسرا اہم تر پہلو اِس کی ہدایتِ عملی ہے۔ اس میں انفرادی زندگی سے متعلق بھی مکمل ہدایات ہیں اور انسانی اخلاق و کردار اور انسان کے رویہ کے بارے میں بھی پوری تفصیلات موجود ہیں۔ انفرادی زندگی سے متعلق یہ تمام چیزیں سابقہ انبیاء کی تعلیمات میں بھی موجود ہیں۔ یہ اخلاقی اقدار ویسے بھی فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہیں۔ قرآن کا اپنا کہنا ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ (الشمس) یعنی نفسِ انسانی کو الہامی طور پر یہ معلوم ہے کہ فجور کیا ہیں اور تقویٰ کیا ہے۔ پرہیزگاری کسے کہتے ہیں اور بدکاری کسے کہتے ہیں۔ البتہ قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس میں عدل و قسط پر مبنی اجتماعی نظام دیا گیا ہے جس میں انتہائی توازن رکھا گیا ہے۔

انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ نوعِ انسانی کو تین بڑے بڑے عقدہ ہائے لاینحل (dilemmas) درپیش ہیں جو توازن کے متقاضی ہیں اور ان میں عدم توازن سے انسانی تمدن فساد اور بگاڑ کا شکار ہے۔ ان میں پہلا عقدۂ لاینحل یہ ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں کیا توازن ہے؟ دوسرا یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین کیا توازن ہے؟ پھر تیسرا یہ کہ فرد اور ریاست یا فرد اور اجتماعیت کے مابین حقوق و فرائض کے اعتبار سے کیا توازن ہے؟ اِن تینوں معاملات میں توازن قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اگر فرد کو ذرا زیادہ آزادی دے دی جاتی ہے تو انارکی (chaos) پھیلتی ہے۔ آزادی کے نام پر دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے! دوسری طرف اگر فرد کی آزادی پر قدغنیں اور بندشیں لگادی جائیں تو وہ ردِّعمل ہوتا ہے جو کمیونزم کے خلاف ہوا۔ فطرتِ

انسانی اور طبیعتِ انسانی نے یہ قدغنیں قبول نہیں کیں اور اِن کے خلاف بغاوت کی۔

عورت اور مرد کے حقوق کے مابین توازن کا معاملہ بھی انتہائی حساس ہے۔ اس میزان کا پلڑا اگر ذرا سا مرد کی جانب جھکا دیا جائے تو عورت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی' وہ بالکل بھیڑ بکری کی طرح مرد کی ملکیت بن کر رہ جاتی ہے' اس کا کوئی تشخص نہیں رہتا اور وہ مرد کی جوتی کی نوک قرار پاتی ہے۔ لیکن اگر دوسرا پلڑا ذرا جھکا دیا جائے تو عورت کو جو حیثیت مل جاتی ہے وہ قوموں کی قسمتوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اس سے خاندانی ادارہ ختم ہو جاتا ہے اور گھر کے اندر کا چین اور سکون برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال سکینڈے نیوین ممالک ہیں۔ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روئے ارضی پر اگر جنت دیکھنی ہو تو اِن ممالک کو دیکھ لیا جائے۔ وہاں کے شہریوں کی بنیادی ضروریات کس عمدگی کے ساتھ پوری ہو رہی ہیں! وہاں علاج اور تعلیم کی سہولیات سب کے لیے یکساں ہیں اور اس ضمن میں خیرات (charity) پر پلنے والوں اور ٹیکس ادا کرنے والوں کے مابین کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے۔ لیکن ان ممالک میں مرد اور عورت کے حقوق کے مابین توازن برقرار نہیں رکھا گیا جس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ مضمحل ہوا' بلکہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گیا اور گھر کا سکون ناپید ہو گیا۔ چنانچہ آج خودکشی کی سب سے زیادہ شرح سویڈن میں ہے۔ اس لیے کہ گھر کا سکون ختم ہو جانے کے باعث اعصاب پر شدید تناؤ ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ برقرار ہے۔ اگرچہ یہاں بھی نام نہاد طور پر بہت اونچی سطح کے لوگوں کے ہاں تو وہ صورتیں پیدا ہو گئی ہیں' تاہم مجموعی طور پر ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ ابھی کافی حد تک محفوظ ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں لفظ ''سکون'' استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الروم کی آیت ۲۱ ملاحظہ ہو:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ط﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی نوع سے جوڑے بنائے' تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''

اگر انسان کو یہ سکون نہیں ملتا تو اگرچہ اس کی کھانے پینے کی ضروریات' جنسی تسکین اور دوسری ضروریاتِ زندگی خوب پوری ہو رہی ہوں لیکن زندگی انسان کے لیے جہنم بن جائے گی۔

مذکورہ بالا تین عقدہ ہائے لاینحل میں سے معاشیات کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع دیں گے تو صورت حال ایک انتہا کو پہنچ جائے گی اور مزدور کا بدترین استحصال ہوگا' جبکہ مزدور کو زیادہ حقوق دے دیں گے تو سرمائے کو کوئی تحفظ حاصل نہیں رہے گا۔ اگر نیشنلائزیشن ہو جائے تو لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ ہی نہیں رہتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں نیشنلائزیشن کے بعد کیا ہوا! روس کی اقتصادی موت کی اہم وجہ یہی نیشنلائزیشن تھی۔ تو اب سرمائے اور محنت میں توازن کے لیے کیا شکل اختیار کی جائے؟ یہ ہے درحقیقت عہدِ حاضر میں قرآن کی ہدایت کا اہم ترین حصہ! آج اس پر بھرپور توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ فزیکل سائنسز سے قرآن کی حقانیت کے ثبوت خود بخود ملتے چلے جائیں گے۔ جیسے جیسے سائنس ترقی کر رہی ہے نئے نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں اور اِن سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ قرآن حق ہے۔ لیکن آج ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن حکیم نے عمرانیاتِ انسانیہ اور اجتماعیات مثلاً اقتصادیات' سیاسیات اور سماجیات کے ضمن میں جو عدلِ اجتماعی دیا ہے اس کو مبرہن کیا جائے۔ علامہ اقبال کے یہ دو شعر اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است!

یعنی دنیا میں جو سوشل انقلاب آیا ہے اس کی ساری چمک دمک اور روشنی یا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ ہی سے مستعار اور ماخوذ ہے یا پھر انسان چاروناچار حضور ﷺ کے لائے ہوئے نظام ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ دائیں بائیں کی ٹھوکریں اور افراط و تفریط کے دھکے کھا کر لڑکھڑاتا ہوا چاروناچار اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم نے اسے پہنچایا تھا۔

عہدِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا مظہر: علامہ اقبال

وجوہِ اعجازِ قرآن کے ضمن میں ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک عہدِ حاضر میں قرآن کے اعجاز کا سب سے بڑا مظہر علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوا تھا۔ اس کے اوّلین مخاطب عرب کے اجڈ' دیہاتی' بدوّ اور ناخواندہ لوگ تھے جنہیں قرآن نے ''اُمِّیّٖنَ'' اور ''قَوْمًا لُّدًّا'' قرار دیا ہے۔ لیکن اِس قرآن نے ان کے اندر بجلی دوڑا دی۔ اُن کے ذہن' قلب اور روح کو متاثر کیا' پھر اُن میں ولولہ پیدا کیا' ان کے باطن کو منور کیا۔ ان کی شخصیتوں میں انقلاب آیا اور افراد بدل گئے۔ پھر انہوں نے ایسی قوت کی حیثیت اختیار کی کہ جس نے دنیا کو ایک نیا تمدن' نئی تہذیب اور نئے قوانین دے کر ایک نئے دَور کا آغاز کیا۔ لیکن بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسا ایک شخص جس نے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا' جس نے مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھ لیے' جو قدیم اور جدید دونوں کا جامع تھا' جو جرمنی اور انگلستان میں جا کر فلسفہ پڑھتا رہا' اُس کو اِس قرآن نے اس طرح possess کیا اور اس پر اس طرح اپنی چھاپ قائم کی کہ اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے اور اس کی تشنگیٔ علم کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے۔ گویا بقول خود اُن کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اَماں ملی ' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو تیرے عفوِ بندہ نواز میں!

میرا ایک کتابچہ ''علامہ اقبال اور ہم'' ایک عرصے سے شائع ہوتا ہے۔ یہ میری ایک تقریر ہے جو میں نے ایچی سن کالج میں ۱۹۷۳ء میں کی تھی۔ اس میں مَیں نے علامہ اقبال کے لیے چند اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ''اقبال اور قرآن'' کے عنوان سے میں نے علامہ اقبال کو (۱) عظمتِ قرآن کا نشان' (۲) واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن' اور (۳) داعی الی القرآن کے خطابات دیے ہیں۔ میں علامہ اقبال کو اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں۔ قرآن مجید کے علوم و معارف کی جو تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے اس دَور میں کوئی دوسری شخصیت اس کے آس پاس بھی نہیں پہنچی۔ ان سے لوگوں نے چیزیں مستعار

لی ہیں اور پھر اُن کو بڑے پیمانے پر پھیلایا ہے۔ ان حضرات کی یہ خدمت اپنی جگہ قابلِ قدر ہے' لیکن فکری اعتبار سے وہ تمام چیزیں علامہ اقبال کے ذہن کی پیداوار ہیں۔

مذکورہ بالا کتابچے میں مَیں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی گواہی بھی شائع کی ہے۔ کئی سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مولانا آنکھوں کے آپریشن کے لیے خانقاہ ڈوگراں سے لاہور آئے ہوئے تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی۔ گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے اُن کا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ معطل ہو گیا۔ تاہم فرصت کے اُن ایام میں مولانا نے علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام دوبارہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے دو تاثر بیان کیے۔ مولانا کا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ ''قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!'' مولانا اصلاحی صاحب کا دوسرا تاثر یہ تھا کہ ''اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حدی خواں اِس اُمت میں پیدا ہوا' لیکن یہ اُمت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہما شما کے کرنے سے کیا ہو گا!'' جو قوم علامہ اقبال کے کلام سے حرکت میں نہیں آئی اسے کون حرکت میں لا سکے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور سب سے بڑا داعی الی القرآن علامہ اقبال ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی عظمت کا جس گیرائی اور گہرائی کے ساتھ احساس علامہ اقبال کو ہوا ہے میری معلومات کی حد تک (اگرچہ میری معلومات محدود ہیں) اس درجے قرآن کی عظمت کا انکشاف کسی اور انسان پر نہیں ہوا۔ جب وہ قرآن مجید کی عظمت بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُن کی دید اور اُن کا تجربہ ہے' کیونکہ جس انداز سے وہ بات بیان کرتے ہیں وہ تکلّف اور آورد سے ماورا انداز ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہ علامہ اقبال قرآن مجید کے بارے میں کیا کہتے ہیں: ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمت اُو لا یزال است و قدیم
نسخہ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

''وہ زندہ کتاب' قرآن حکیم' جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!
زندگی کے وجود میں آنے کا خزینہ' جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔
اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردّ و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔
(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!
یہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی' اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!
(یہ کتابِ حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اُس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے۔''

قرآن حکیم کے بارے میں مزید لکھتے ہیں: ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست!

''اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں''۔ (گویا ہر زمانے میں یہ قرآن ایک نئی شان اور نئی آن بان کے ساتھ دنیا میں آیا ہے اور آتا رہے گا۔)

اب آپ علامہ اقبال کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے مناجات کرتے ہوئے کہے۔ اِن سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ انہیں کتنا یقین تھا کہ میرے فکر کا منبع قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ ''مثنویٔ اسرار و رموز'' کے آخر میں ''عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃٌ للعالمینؐ '' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ: ؎

گر دِلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن!
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

''اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو' اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور

شے کی ترجمانی ہے' تو (اے نبیﷺ!) آپ میرے ناموسِ فکر کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کر دیں۔ (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کر دیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیں!''

میں نے اپنی امکانی حد تک قرآن حکیم کا پوری باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اس پر غور و فکر اور سوچ بچار کیا ہے۔ میں نے علامہ اقبال کا اردو اور فارسی کلام بھی پڑھا ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ بات ریکارڈ کرانی ضروری سمجھی ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں مَیں نے جو بات ۱۹۷۳ء میں کہی تھی آج بھی میں اسی بات پر قائم ہوں کہ ''اس دَور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ و مقامِ قرآن کا انکشاف جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو''۔ اور یہ کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور داعی الی القرآن اقبال ہے۔ علامہ اقبال مسلمانوں کی قرآن سے دُوری پر مرثیہ کہتے ہیں: ؎

جانتا ہوں مَیں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں!

مسلمانوں کو قرآن کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین او آساں بمیری!

''اس قرآن کے ساتھ تمہارا اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ تم کسی شخص کو عالمِ نزع میں اِس کی سورۂ یٰسٓ سنا دو' تا کہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔''

ہمارے ہاں صوفی اور واعظ حضرات نے قرآن کو چھوڑ کر اپنی مجالس اور اپنے وعظ کے لیے کچھ اور چیزوں کو منتخب کر لیا ہے' تو اس پر اقبال نے کس قدر دردناک مرثیے کہے ہیں اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے: ؎

صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

اور ؎

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو!

''ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پُرشکوہ اور بلند و بالا ہیں' لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے! اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمی سے' اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف' شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!''

علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور اُمتِ مسلمہ کے نکبت و افلاس اور ذلت و خواری کا اصل سبب قرآن سے دُوری اور کتابِ الٰہی سے بُعد ہی ہے۔ چنانچہ ''جوابِ شکوہ'' کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

بعد میں اسی مضمون کا اعادہ علامہ مرحوم نے فارسی میں نہایت پُرشکوہ الفاظ اور حد درجہ درد انگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ!

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے)! اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے)۔''

میں اپنا یہ تأثر ایک بار پھر دہرا رہا ہوں کہ عصر حاضر میں قرآن کی عظمت جس درجہ اُن پر منکشف ہوئی تھی' میں اپنی محدود معلومات کی حد تک کہنے کو تیار ہوں کہ وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک علامہ اقبال دورِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا ایک عظیم مظہر ہیں۔

❁❁❁

باب ہشتم

قرآن مجید سے ہمارا تعلق

قرآن ''حبل ُاللہ'' ہے!

جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن ''حبل ُاللہ'' ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ ''حَبل'' کے ایک معنی رسّی کے ہیں اور یہی اصل معنی ہیں۔ سورۃ اللّہب میں یہ لفظ آیا ہے: ﴿حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿٥﴾﴾ یعنی مونج کی بٹی ہوئی رسّی۔ امام راغبؒ نے اس کی تعبیر کی ہے: ''استعیر للوصل ولکل ما یتوسل به الی شیء'' یعنی کسی شے سے جڑنے کے لیے اور جس شے سے جڑا جائے اس کے لیے استعارۃً یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عہد' قول وقرار اور میثاق دو فریقوں کو باہم جوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ عہد کے معنی میں بھی آتا ہے' اور قرآن حکیم میں یہ ایسے عہد کے لیے آیا ہے جس سے کسی کو امن مل رہا ہو' حفاظت اور امان حاصل ہو رہی ہو۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۱۲) میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا :

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ط﴾

''یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی' سوائے اس کے کہ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں' ان پر محتاجی اور کم ہمتی مسلط کر دی گئی ہے۔''

گویا خود اپنے بل پر' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر' خود مختاری کی اساس پر اُن کے لیے عزت کا معاملہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کی پیشین گوئی ہے اور موجودہ ریاست اسرائیل اس کا واضح ثبوت ہے۔ امریکہ اگر ایک دن کے لیے بھی اپنی حفاظت ہٹا لے تو اسرائیل کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

قرآن مجید میں اہل ایمان سے فرمایا گیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو سب مل کر''۔ البتہ ''حبل ُاللہ'' کیا ہے؟ قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ اور قرآن مجید میں جو بات پوری طرح واضح نہ ہو' مجمل ہو' اس کی تشریح اور تبیین رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) ''اور ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی طرف 'الذکر' نازل کیا' تاکہ جو چیز اُن کے لیے اتاری گئی ہے آپ اسے اُن پر واضح کریں''۔ چنانچہ احادیث نبویؐ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ''حبل ُاللہ'' قرآن مجید ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا وَاِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ ' اَحَدُھُمَا کِتَابُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ......))

''آگاہ رہو! میں تمہارے مابین دو خزانے چھوڑے جا رہا ہوں' اُن میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے' وہی حبل ُاللہ ہے......''

قرآن حکیم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے' جس میں الفاظ آئے ہیں: ((ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔ یہ روایت سنن ترمذی اور سنن دارمی میں موجود ہے۔ مزید برآں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت رزین میں آئی ہے اس میں بھی یہی الفاظ ہیں: ((ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔ سنن دارمی میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ حَبْلُ اللّٰہِ وَالنُّوْرُ الْمُبِیْنُ)) ''یقیناً یہ قرآن حبل ُاللہ اور نورِ مبین ہے''۔

قرآن کو ''رسّی'' کس اعتبار سے کہا گیا ہے' اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو بندہ اس رسّی کے ذریعے اللہ سے جڑتا ہے۔ یہ رسی ہمیں اللہ سے جوڑنے والی ہے۔ ''تعلق مع اللہ'' اور ''تقرب الی اللہ'' دونوں تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ تعلق کے معنی ہیں لٹک جانا۔ ''علق'' لٹکی ہوئی شے کو کہتے ہیں۔ ''تعلق مع اللہ'' کا مفہوم ہوگا اللہ سے لٹک جانا' یعنی اللہ سے چمٹ جانا' اللہ کے ساتھ جڑ جانا۔ اسی طرح ''تقرب الی اللہ'' کا مطلب ہے اللہ سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرنا۔ سلوک اور طریقت کا مقصد یہی ہے۔ تعلق مع اللہ میں اضافے اور تقرب الی اللہ کا مؤثر ترین اور سہل ترین ذریعہ قرآن حکیم ہے۔

اس اعتبار سے دو حدیثیں ملاحظہ کیجیے۔ ایک کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلْقُرْآنُ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ)) ''یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔ یہی الفاظ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی روایت کیے گئے ہیں۔ یعنی اگر اللہ سے جڑنا ہے' اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے تو اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو' اس سے تم اللہ سے جڑ جاؤ گے' اللہ کا قرب حاصل کر لو گے۔

دوسری معجم کبیر طبرانی کی بڑی پیاری روایت ہے۔ اس میں اِن الفاظ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ حضور ﷺ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو آپؐ نے مسجد کے گوشے میں دیکھا کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کا مذاکرہ کر رہے تھے' قرآن کو سمجھ اور سمجھا رہے تھے۔ حضور ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور بڑا پیارا سوال کیا: ((اَلَسْتُمْ تَشْھَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاَنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ؟)) ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا: 'بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!'' یعنی ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ' ہم اس کے گواہ ہیں! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ وَطَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ)) ''پس تم خوشیاں مناؤ' اس لیے کہ یہ قرآن وہ شے ہے جس کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ اِن احادیث مبارکہ سے ''حبل ُاللہ'' کا یہ تصور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی شے ہے۔

ابھی ہم نے جس حدیث کا مطالعہ کیا اس میں قرآن حکیم کے لیے ’’جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں‘ کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ مستدرک حاکم اور مراسیل ابی داوٗد میں حضرت ابوذر غفاری ؓ سے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے: ((اِنَّــکُمْ لَا تَرْجِعُوْنَ اِلَی اللّٰہِ بِشَیْءٍ اَفْضَلَ مِمَّا خَرَجَ مِنْہُ یَعْنِی الْقُرْآنَ)) یعنی تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود اُسی (اللہ تعالیٰ) سے نکلی ہے‘ یعنی قرآن مجید۔ درحقیقت قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے‘ تو اس سے بڑھ کر قریب ہونے کا کوئی اور ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ جب کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے تو گویا وہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تبع تابعین کے دَور کی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ سال میں چھ مہینے سرحدوں پر جہاد میں شریک ہوتے۔ اُس دَور میں دارالاسلام کی سرحدیں بڑھ رہی تھیں اور اس کے لیے جہاد جاری تھا۔ جبکہ چھ مہینے آپؒ گھر پر گزارتے اور اِس عرصے میں لوگوں سے ملنے جلنے سے حتی الامکان گریز کرتے۔ صرف نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آتے‘ باقی وقت گھر پر ہی رہتے۔ کسی نے کہا کہ عبداللہ! آپ تنہائی پسند ہو گئے ہیں‘ تنہائی سے آپ کی طبیعت اکتاتی نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ’’کیا تم اُس شخص کو تنہا سمجھتے ہو جو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے؟‘‘ لوگ حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جب اس کی وضاحت طلب کی گئی تو فرمایا کہ دیکھو جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو قرآن پڑھتا ہوں یا حدیث پڑھتا ہوں۔ جب قرآن پڑھتا ہوں تو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہوں اور جب حدیث پڑھتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہوں۔ تم مجھے تنہا نہ سمجھو۔

دیوانہ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا
عالم ہے اِن گلوں میں‘ پھولوں میں بستیاں ہیں!

مسند احمد‘ ترمذی‘ ابوداوٗد‘ نسائی‘ ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے یہ حدیث نبویؐ منقول ہے:

((یُــقَـالُ لِصَـاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَاْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ کَمَا کُنْتَ تُرَتِّلُ فِی الدُّنْیَا فَاِنَّ مَنْزِلَکَ عِنْدَ آخِرِ آیَۃٍ تَقْرَأُھَا))

’’(قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور (جنت کے درجات پر) چڑھتا جا‘ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا۔ پس تیرا مقام وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے‘‘۔

لیکن واضح رہے کہ صاحب قرآن سے مراد صرف حافظِ قرآن یا ہمارے ہاں پائے جانے والے قاری نہیں ہیں‘ بلکہ وہ حافظ اور قاری مراد ہیں جو قرآن کے علم و حکمت سے بھی واقف ہیں‘ اس کو پڑھتے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔ جنت میں اس قرآن کے ذریعے ان کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی اور ان کا آخری مقام وہاں معین ہو گا جہاں ان کا سرمایۂ قرآن ختم ہو گا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ تقرب الی اللہ اور وصل الی اللہ کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن حکیم ہی ہے۔ میں نے اسی لیے امام راغبؒ کے الفاظ کا حوالہ دیا تھا کہ ’’حبل‘‘ کا لفظ وصل کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے اور یہ ہر اُس شے کے لیے استعمال ہو گا جس کے ذریعے کسی شے کے ساتھ جڑا جائے۔ اس معنی میں حبل اللہ قرآن مجید ہے۔

اگر پیراشوٹ کی مثال سامنے رکھیں تو جملہ ایمانیات اس قرآن کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جس طرح پیراشوٹ کی چھتری کی رسیاں نیچے آ کر ایک جگہ جڑ جاتی ہیں۔ جب پیراشوٹ کھلتا ہے تو اس کی چھتری کس قدر وسیع ہوتی ہے‘ لیکن اس کی ساری رسیاں ایک جگہ آ کر جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایمانیات کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب کے سب قرآن کے ساتھ منسلک ہیں۔ چنانچہ قرآن پر یہ یقین مطلوب ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے‘ بلکہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ کلام بھی ذاتِ باری تعالیٰ ہی سے صادر ہوا ہے اور میری روح بھی اللہ ہی کے اِمر کُن کا ظہور ہے۔ اس انداز سے قرآن پر یقین‘ اللہ تعالیٰ پر یقین اور قرآن لانے والے محمد رسول اللہ ﷺ پر یقین مطلوب ہے۔ (’’حقیقتِ ایمان‘‘ کے موضوع پر میری پانچ تقاریر میں یہ مضمون آ چکا ہے)۔

ایک ایمان تو تقلیدی ہے‘ یعنی غیر شعوری ایمان‘ کہ ایک یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے‘ چاہے وہ علیٰ وجہ البصیرت نہ ہو‘ اور وہ بھی بہت بڑی دولت ہے‘ لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمتی ایمان وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت ہو۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ﴾ (یوسف:۱۰۸) ’’(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ یہ میرا راستہ ہے‘ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر اور جو میرے ساتھ ہیں (وہ بھی)‘‘۔ علیٰ وجہ البصیرت ایمان یعنی شعوری ایمان‘ اکتسابی ایمان اور حقیقی ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ مولانا ظفر علی خان بہت ہی سادہ الفاظ میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کر گئے ہیں: ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

عاقل یعنی غور و فکر کرنے والے اور سوچ بچار کرنے والے کے لیے ایمان کا منبع و سرچشمہ صرف قرآنِ حکیم ہے۔

قرآن حکیم کے ’’حبل اللہ‘‘ ہونے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اہل ایمان کو جوڑنے والی رسّی‘ ان کو باہم ایک دوسرے سے باندھ دینے والی شے‘ ان کو بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز یہ قرآن ہے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں جہاں اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم آیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی باہم متفرق ہونے سے روکا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ’’اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر اور تفرقہ مت ڈالو!‘‘ اہل ایمان کو جوڑنے والی اور بنیانِ مرصوص بنانے والی رسی یہی قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ انسانی اتحاد وہی مستحکم اور پائیدار ہو گا جو فکر و نظر کی ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ بہت سے اتحاد وقتی طور پر وجود میں آ جاتے ہیں۔ جیسے کچھ سیاسی مصلحتیں ہیں تو اتحاد قائم کر لیا‘ کوئی دنیاوی مفادات ہیں تو ان کی بنا پر اتحاد قائم کر لیا۔ یہ اتحاد حقیقی نہیں ہوتے اور نہ ہی پائیدار اور مستحکم ہوتے ہیں۔ انسان حیوانِ عاقل ہے۔ یہ سوچتا ہے‘ غور کرتا ہے‘ اس کے نظریات ہیں‘ اس کے کچھ اہداف و مقاصد ہیں‘ کوئی نصب العین ہے۔ نظریات‘ مقاصد اور نصب العین کا بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ تو جب تک ان میں ہم آہنگی نہ ہو کوئی اتحاد پائیدار اور مستحکم نہیں ہو گا۔ اس اعتبار سے اللہ کی اس رسّی کو مضبوطی سے تھامو گے تو گویا دو رشتے قائم ہو گئے۔ ایک رشتہ اہل ایمان کا اللہ کے ساتھ اور ایک رشتہ

اہل ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ۔ جیسے کل شریعت کو تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی سب سے بڑی عبادت نماز ہے اور بندوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے والی شے زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح حبل اللہ ایک طرف اہل ایمان کو اللہ سے جوڑ رہی ہے اور دوسری طرف اہل ایمان کو آپس میں جوڑ رہی ہے۔ یہ انہیں بنیانِ مرصوص اور ''کَجَسَدٍ وَّاحِدٍ'' بنا دینے والی شے ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورتی سے کہا ہے: ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکر ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتا پا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ لہٰذا اے مسلمان! تو قرآن کو مضبوطی سے تھام لے کہ 'حبل اللہ' یہی ہے۔''

حبل اللہ کے بارے میں مفسرینؒ کے ہاں بہت سے اقوال ملتے ہیں کہ حبل اللہ سے مراد قرآن ہے' کلمہ طیبہ ہے' اسلام ہے۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن احادیث نبویؐ کی روشنی میں اس کا مصداقِ کامل قرآن ہی ہے۔ اور پھر اس کی جس قدر عمدہ تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے' یہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی میرے نزدیک بہت عمدہ مقام ہے: ؎

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا﴾ کے الفاظ کے بعد فرمایا گیا ہے: ﴿وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو کہ جب تم باہم دشمن تھے' پھر اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا تو تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے''۔ یہ قرآن مجید ہی ہے جو اہل ایمان کے دلوں کو جوڑتا اور ان کو باہم پیوست کرتا ہے' اور یہ دلی تعلق اور دلی ہم آہنگی ہی ہے جو مسلمانوں کو بنیانِ مرصوص بنانے والی شے ہے۔

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

تعارفِ قرآن کے ضمن میں جو کچھ میں نے عرض کیا ان سب باتوں کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے وہ کیا ہے؟ یعنی قرآن حکیم کے بارے میں مجھ پر اور آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس کے اعتبار سے میں خاص طور پر اپنی کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری تحریک رجوع الی القرآن کے لیے دو بنیادوں میں سے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری اس تحریک کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا تھا۔ ابتدائی چھ سات سال تو میں تنہا تھا۔ نہ کوئی ادارہ' نہ جماعت۔ پھر انجمن خدام القرآن قائم ہوئی' پھر ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ قرآن اکیڈمی کی تعمیرات مکمل ہونے کے بعد پھر اسی کے بطن سے قرآن کالج کی ولادت ہوئی' جس کے سر پر قرآن آڈیٹوریم کا تاج سجا ہوا ہے۔ اس پوری جدوجہد کی بنیاد اور اساس دو کتابچے ہیں: (۱) ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام''۔ یہ مضمون میں نے ۱۹۶۷ء میں میثاق کے اداریے کے طور پر لکھا تھا۔ (۲) ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق''۔ یہ کتابچہ میری دو تقریروں پر مشتمل ہے جو میں نے ۱۹۶۸ء میں کی تھیں۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں جشن خیبر اور جشن مہران وغیرہ جیسے مختلف عنوانات سے جشن منائے جا رہے تھے' جن میں راگ رنگ کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ صدر ایوب خان کا زمانہ تھا۔ اگرچہ شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے' لیکن ''سب اچھا ہے'' کے اظہار کے لیے یہ شاندار تقریبات منعقد کی جا رہی تھیں۔ یہ گویا اُن کے دورِ حکومت کی آخری بھڑک تھی' جیسے بجھنے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے: ع ''مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے!'' لیکن اُن دنوں ذکر و فکر کی بجائے لوگوں کو راگ رنگ کی محفلوں میں مست رکھنے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں مذہبی لوگوں کو رشوت کے طور پر ''جشن نزولِ قرآن'' عطا کیا گیا کہ تم بھی جشن مناؤ اور اپنا ذوق و شوق پورا کرلو۔ چنانچہ چودہ سو سالہ ''جشن نزولِ قرآن'' کا انعقاد ہوا۔ اس کے ضمن میں قراءت کی بڑی بڑی محفلیں منعقد ہوئیں' جن میں پوری دنیا سے قرّاء حضرات شریک ہوئے۔ اسی سلسلے میں سونے کے تار سے قرآن لکھنے کا پروجیکٹ شروع ہوا۔

اُس وقت میرا ذہن منتقل ہوا کہ کیا قرآن حکیم کا ہم پر یہی حق ہے؟ کیا اپنے ان کاموں سے ہم قرآن مجید کا حق ادا کر رہے ہیں؟ چنانچہ میں نے مسجد خضراء سمن آباد میں اپنے دو خطاباتِ جمعہ میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق بیان کیے کہ ہر مسلمان پر حسبِ استعداد قرآن مجید کے پانچ حق عائد ہوتے ہیں:

۱) اسے مانے جیسا کہ ماننے کا حق ہے۔ (ایمان و تعظیم)
۲) اسے پڑھے جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ (تلاوت و ترتیل)
۳) اسے سمجھے جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے۔ (تذکر و تدبر)
۴) اس پر عمل کرے جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے۔ (حکم و اقامت)

انفرادی زندگی میں حکم بالقرآن یہ ہے کہ ہماری ہر رائے اور ہر فیصلہ قرآن پر مبنی ہو۔ اور اجتماعی زندگی میں قرآن پر عمل کی صورت اقامت ما انزل من اللہ یعنی قرآن کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ حَتّٰی تُقِیۡمُوا التَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ط﴾
(المائدۃ:۶۸)

''اے کتاب والو! تمہارا کوئی مقام نہیں جب تک کہ تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری جانب نازل کیا گیا

ہے تمہارے ربّ کی طرف سے۔''

۵) قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا اور عام کرنا۔ (تبلیغ و تبیین)

ان پانچ عنوانات کے تحت الحمدللہ ثم الحمدللہ یہ بہت جامع کتابچہ مرتب ہوا اور بلا مبالغہ یہ لاکھوں کی تعداد میں چھپا ہے۔ پھر انگریزی' عربی' فارسی' پشتو' تامل' ملیشیا کی زبان اور سندھی میں اس کے تراجم ہوئے۔ جو حضرات بھی ہماری اس تحریک رجوع الی القرآن سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں' میرے دروس میں شریک ہوتے ہیں یا ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں میرا ناصحانہ مشورہ ہے کہ اس کتابچے کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ درحقیقت ''تعارفِ قرآن'' پر میرے خطابات کا لازمی نتیجہ اور ان کا ضروری تکملہ ہے۔

یہ بھی جان لیجیے کہ اگر ہم یہ حقوق ادا نہیں کرتے تو از روئے قرآن ہماری حیثیت کیا ہے۔ قرآن مجید کے حقوق کو ادا نہ کرنا قرآن کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔ سورۃ الفرقان میں محمد رسول اللہ ﷺ کی فریاد نقل ہوئی ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾﴾

''اور پیغمبر کہے گا کہ اے میرے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کے ذیل میں حاشیہ میں لکھا ہے:

''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا' اس میں تدبّر نہ کرنا' اس پر عمل نہ کرنا' اس کی تلاوت نہ کرنا' اس کی تصحیح قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا' اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا' یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں۔''

بحیثیت مسلمان ہم پر قرآن مجید کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں' اگر انہیں ہم ادا نہیں کر رہے تو حضور ﷺ کے اس قول اور فریاد کا اطلاق ہم پر بھی ہوگا۔ گویا کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارے خلاف مدعی کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے۔

علامہ اقبال اسی آیتِ قرآنی کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی!

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!''

قرآن مجید میں دو مقامات پر قرآن کے حقوق ادا نہ کرنے کو قرآن کی تکذیب قرار دیا گیا ہے۔ آپ لاکھ سمجھیں کہ آپ قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں' لیکن اگر آپ اس کے حقوق کی ادائیگی اپنی استعداد کے مطابق' اپنی امکانی حد تک نہیں کر رہے تو درحقیقت قرآن کو جھٹلا رہے ہیں۔ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود کے بارے میں سورۃ الجمعہ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵﴾﴾

''مثال ان لوگوں کی جو حاملِ تورات بنائے گئے' پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا' اُس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ بری مثال ہے اُس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

ہمیں کانپنا چاہیے' لرزنا چاہیے کہ کہیں ہمارا شمار بھی انہی لوگوں میں نہ ہو جائے۔

اس ضمن میں دوسرا مقام سورۃ الواقعہ کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آیات ہیں:

﴿فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ﴿۷۷﴾ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

''پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی' اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے' کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے' ایک محفوظ کتاب میں ثبت' جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو' اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟''

اس قرآن' اس عظمت والی کتاب' جو کتاب کریم ہے' کتاب مکنون ہے' کے بارے میں تمہاری یہ سستی' تمہاری یہ کسل مندی' تمہاری یہ ناقدری اور تمہارا یہ عملی تعطّل کہ تم اسے جھٹلا رہے ہو! تم نے اپنا حصہ اور نصیب یہ بنا لیا ہے کہ تم اس کی تکذیب کر رہے ہو؟ تکذیب اس معنی میں بھی کہ قرآن کا انکار کیا جائے' اسے اللہ کا کلام نہ مانا جائے —— اور تکذیب عملی کے ضمن میں وہ چیز بھی اس کے تابع اور شامل ہوگی جو میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی حاملِ کتابِ الٰہی ہونے کے باوجود اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام سے محفوظ رکھے کہ ہم بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ ہم میں سے ہر شخص کو ان حقوق کے ادا کرنے کی اپنی امکانی حد تک بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

۞۞۞

سُورۃُ الفاتِحۃ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہٖ الکریم
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ○﴾ (آمین)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ

سورۃ الفاتحہ اگرچہ قرآن حکیم کی مختصر سورتوں میں سے ہے‘ اس کی کل سات آیات ہیں‘ لیکن یہ قرآن حکیم کی عظیم ترین سورت ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو اُمّ القرآن بھی کہا گیا ہے اور اساس القرآن بھی۔ یعنی یہ پورے قرآن کے لیے جڑ‘ بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ الفاتحہ کس اعتبار سے ہے؟ فَتَحَ یَفْتَحُ کے معنی ہیں کھولنا۔ چونکہ قرآن حکیم شروع اس سورت سے ہوتا ہے لہٰذا یہ ’’سورۃ الفاتحہ‘‘ (The Opening Surah of the Qur'an) ہے۔ اس کا ایک نام ’’الکافیہ‘‘ یعنی کفایت کرنے والی ہے‘ جبکہ ایک نام ’’الشافیہ‘‘ یعنی شفا دینے والی ہے۔ دوسری بات یہ نوٹ کیجیے کہ یہ سورۂ مبارکہ پہلی مکمل سورت ہے جو رسول اللہﷺ پر نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے متفرق آیات نازل ہوئیں۔ سب سے پہلے سورۃ العلق کی پانچ آیتیں‘ پھر سورۂ نٓ یا سورۃ القلم کی سات آیتیں‘ پھر سورۃ المزمل کی نو آیتیں‘ پھر سورۃ المدثر کی سات آیتیں اور پھر سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں نازل ہوئیں۔ لیکن یہ پہلی مکمل سورت ہے جو نازل ہوئی ہے رسول اللہﷺ پر۔ سورۃ الحجر میں ایک آیت بایں الفاظ آئی ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾﴾

’’ہم نے (اے نبیﷺ!) آپؐ کو سات ایسی آیات عطا کی ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور عظمت والا قرآن۔‘‘

سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں دوہرا دوہرا کر پڑھی جاتی ہیں‘ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں‘ اور یہ سورۂ مبارکہ خود اپنی جگہ پر ایک قرآنِ عظیم ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ھِیَ السَّبْعُ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِیْمُ الَّذِیْ اُوْتِیْتُہٗ)) (۱)

’’سورۃ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہی ’’سبع مثانی‘‘ اور ’’قرآن عظیم‘‘ ہے جو مجھے عطا ہوئی ہے۔‘‘

تعداد کے اعتبار سے اس کی سات آیات متفق علیہ ہیں۔ البتہ اہل علم میں ایک اختلاف ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک‘ جن میں امام شافعیؒ بھی شامل ہیں‘ آیت بسم اللہ بھی سورۃ الفاتحہ کا جزء ہے۔ ان کے نزدیک ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○﴾ سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت اور ﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○﴾ ساتویں آیت ہے۔ لیکن دوسری طرف امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ آیت بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جزء نہیں ہے‘ بلکہ آیت بسم اللہ قرآن مجید کی کسی بھی سورۃ کا جزء نہیں ہے‘ سوائے ایک مقام کے جہاں وہ متن میں آئی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو جو خط لکھا تھا اس کا تذکرہ سورۃ النمل میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۳۰﴾﴾۔ سورتوں کے آغاز میں یہ علامت کے طور پر لکھی گئی ہے کہ یہاں سے نئی سورۃ شروع ہو رہی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○﴾ سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت اور ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○﴾ پانچویں آیت ہے‘ جبکہ ﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵﴾ چھٹی اور ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○﴾ ساتویں آیت ہے۔ جن حضرات کے نزدیک آیت بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جزء ہے وہ نماز میں جہری قراءت کرتے ہوئے ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○﴾ بھی بالجہر پڑھتے ہیں‘ اور جن حضرات کے نزدیک یہ سورۃ الفاتحہ کا جزء نہیں ہے وہ جہری قراءت کرتے ہوئے بھی بسم اللہ خاموشی سے پڑھتے ہیں اور ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○﴾ سے قراءت شروع کرتے ہیں۔

نماز کا جزوِ لازم

اس سورۂ مبارکہ کا اسلوب کیا ہے؟ یہ بہت اہم اور سمجھنے کی بات ہے۔ ویسے تو یہ کلام اللہ ہے‘ لیکن اس کا اسلوب دعائیہ ہے۔ یہ دُعا اللہ نے ہمیں تلقین فرمائی ہے کہ مجھ سے اس طرح مخاطب ہوا کرو‘ جب میرے حضور میں حاضر ہو تو یہ کہا کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی بنا پر قرآن مجید کی اس سورت کو نماز کا جزوِ لازم قرار دیا گیا ہے‘ بلکہ سورۃ الفاتحہ ہی کو حدیث میں ’’الصَّلَاۃ‘‘ کہا گیا ہے‘ یعنی اصل نماز سورۃ الفاتحہ ہے۔ باقی اضافی چیزیں ہیں‘ تسبیحات ہیں‘ رکوع و سجود ہیں‘ قرآن مجید کا کچھ حصہ آپ اور بھی پڑھ لیتے ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَا صَلَاۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَاْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ)) (۲) یعنی جو شخص (نماز میں) سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھتا اس کی کوئی نماز نہیں ہے۔ اس کے

علاوہ اور بھی بہت سی احادیث میں یہ مضمون آیا ہے۔

اس اعتبار سے بھی ہمارے ہاں ایک فقہی اختلاف موجود ہے۔بعض حضرات نے اس حدیث کو اتنا اہم سمجھا ہے کہ آپ باجماعت نماز پڑھ رہے ہیں تب بھی ان کے نزدیک آپ امام کے ساتھ ساتھ ضرور سورۃ الفاتحہ پڑھیں گے۔ چنانچہ امام ہر آیت کے بعد وقفہ دے۔امام جب کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ تو اس کے بعد مقتدی بھی کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ خواہ اپنے دل میں کہے۔پھر امام کہے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ تو مقتدی بھی دل میں کہہ لے: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○. یہ موقف ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا کہ نماز چاہے جہری ہو چاہے سری ہو' اگر آپ امام کے پیچھے پڑھ رہے ہیں تو امام اپنی سورۃ الفاتحہ پڑھے گا اور آپ اپنی پڑھیں گے اور لازماً پڑھیں گے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف اس کے بالکل برعکس ہے کہ امام جب سورۃ الفاتحہ پڑھے گا تو ہم پیچھے بالکل نہیں پڑھیں گے' بلکہ امام کی قراءت ہی مقتدیوں کی قراءت ہے۔ان کا استدلال آیت قرآنی ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾﴾ (الاعراف) اور حدیث نبویؐ ((مَنْ کَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ)) [۳] سے ہے۔نیز اُن کا کہنا ہے کہ نماز باجماعت میں امام کی حیثیت سب کے نمائندے کی ہوتی ہے۔اگر کوئی وفد کہیں جاتا ہے اور اس وفد کا کوئی سربراہ ہوتا ہے تو وہاں جا کر گفتگو وفد کا سربراہ کرتا ہے' باقی سب لوگ خاموش رہتے ہیں۔

اب اس ضمن میں ایک انتہائی معاملہ تو وہ ہو گیا جو امام شافعیؒ کا موقف ہے کہ چاہے جہری نماز ہو چاہے سرّی ہو' اس میں امام کے پیچھے مقتدی بھی سورۃ الفاتحہ پڑھیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ظہر اور عصر سرّی نمازیں ہیں' ان میں امام خاموشی سے قراءت کرتا ہے' بلند آواز سے نہیں پڑھتا' جبکہ فجر' مغرب اور عشاء جہری نمازیں ہیں' جن میں سورۃ الفاتحہ اور قرآن کا مزید کچھ حصہ پہلی دو رکعتوں میں آواز کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے کہ نماز خواہ جہری ہو خواہ سرّی ہو' نماز باجماعت کی صورت میں مقتدی خاموش رہے گا اور سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھے گا۔

ان کے علاوہ ایک درمیانی مسلک بھی ہے اور وہ امام مالکؒ اور امام ابن تیمیہؒ وغیرہما کا ہے۔اس ضمن میں اُن کا موقف یہ ہے کہ جہری رکعت میں مقتدی سورۃ الفاتحہ مت پڑھے' بلکہ امام کی قراءت خاموشی سے سنے' ازروئے نصِ قرآنی: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾﴾ (الاعراف) ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو تم پوری توجہ سے اسے سنا کرو اور خود خاموش رہا کرو' تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' اسی طرح حدیث نبویؐ ہے: ((اِذَا قَرَاَ [الْاِمَامُ] فَاَنْصِتُوْا)) [۴] ''جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو''۔ چنانچہ جب امام بالجہر قراءت کر رہا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○﴾ تو آپ سنیے اور خود خاموش رہیے' لیکن جو سرّی نماز ہے اس میں امام اپنے طور پر سورۃ الفاتحہ پڑھے اور آپ اپنے طور پر خاموشی سے پڑھیں۔ یہ درمیانی موقف ہے' اور میں نے بہرحال اسی کو اختیار کیا ہوا ہے۔

فطرتِ سلیمہ کی پکار

سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں' مَیں نے عرض کیا کہ یہ دُعا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں تلقین کی ہے۔لیکن اس سے آگے بڑھ کر ذرا قرآن مجید کی حکمت اور فلسفہ پر اگر غور کریں گے تو اس سورت کی ایک اور شان سامنے آئے گی۔ بنیادی طور پر قرآن کا فلسفہ کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں جب آتا ہے تو فطرت لے کر آتا ہے' جسے قرآن حکیم ''فِطْرَتَ اللّٰہِ'' قرار دیتا ہے' ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا ط﴾ (الرّوم:۳۰) یہی حقیقت حدیثِ نبویؐ میں بایں الفاظ بیان کی گئی ہے: ((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ' فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ)) [۵] ''(نسلِ انسانی کا) ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے' لیکن یہ اس کے والدین ہیں جو اسے یہودی' نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں''۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے فطرتِ اسلام لے کر آتا ہے۔تو انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت اور اپنی محبت ودیعت کر دی ہے۔ اس لیے کہ جو روحِ انسانی ہے وہ کہاں سے آئی ہے؟ ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ ''(اے نبیؐ!) یہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ روح میرے ربّ کے امر میں سے ہے''۔ ہماری روح ربّ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے' لہٰذا اس کے اندر اللہ کی معرفت بھی ہے' اللہ کی محبت بھی ہے۔تو جب تک ایک انسان کی فطرت میں کوئی کجی نہ آئے' وہ بے راہ روی (perversion) سے محفوظ رہے تو اسے ہم کہتے ہیں فطرتِ سلیمہ' یعنی سالم اور محفوظ فطرت۔اس فطرت والا انسان جب بلوغ کو پہنچتا ہے اور اسے عقلِ سلیم بھی مل جاتی ہے' یعنی صحیح صحیح انداز میں غور کرنے کی صلاحیت مل جاتی ہے تو ان دونوں چیزوں کے امتزاج کے نتیجہ میں ایمانیات کے کچھ بنیادی حقائق انسان پر خود منکشف ہو جاتے ہیں' خواہ اسے کوئی وحی ملے یا نہ ملے۔ یہ ہے فطرت کا معاملہ اور یہ ہے قرآن کی حکمت اور فلسفہ کا اصول۔اس کی ایک بڑی شاندار مثال قرآن مجید میں حضرت لقمان کی دی گئی ہے' جو نہ نبی تھے نہ کسی نبی کے پیروکار اور اُمتی تھے' لیکن انہیں اللہ نے حکمت عطا فرمائی تھی۔

''حکمت'' فطرتِ سلیمہ' قلبِ سلیم اور عقلِ سلیم کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔اگر فطرت بھی محفوظ ہے' عقل بھی ٹیڑھ پر نہیں چل رہی' بلکہ صحیح اور سیدھے راستے پر چل رہی ہے تو ان دونوں کے امتزاج سے جو حکمت پیدا ہوتی ہے' انسان کو جو دانائی (wisdom) میسرّ آتی ہے اس کے نتیجہ میں وہ پہچان لیتا ہے کہ اس کائنات کا ایک پیدا کرنے والا ہے' یہ خود بخود نہیں بنی ہے۔دوسرے یہ کہ وہ اکیلا ہے' تنہا ہے' کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے (لَا مِثْلَ لَهٗ وَلَا مِثَالَ لَهٗ وَلَا مَثِیْلَ لَهٗ وَلَا كُفُوَ لَهٗ وَلَا ضِدَّ لَهٗ وَلَا نِدَّ لَهٗ). کوئی اس کا مدّ مقابل نہیں ہے اور اس میں تمام صفاتِ کمال بتمام وکمال موجود ہیں۔وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے' بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے' ہر جگہ موجود ہے' اور اس کی ذات میں کوئی نقص' کوئی عیب' کوئی کوتاہی' کوئی تقصیر' کوئی کمزوری' کوئی ضعف' کوئی احتیاج قطعاً نہیں ہے۔

یہ پانچ باتیں فطرتِ سلیمہ اور عقلِ سلیم کے نتیجہ میں انسان کے علم میں آتی ہیں' چاہے اُسے ابھی کسی وحی سے فیض حاصل نہ ہوا ہو۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ چین کا بڑا فلسفی اور حکیم کنفیوشس ان تمام باتوں کو ماننے والا تھا' حالانکہ وہ نبی تو نہیں تھا!

مزید برآں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انسانی زندگی صرف یہ دنیا کی زندگی نہیں ہے‘ اصل زندگی ایک اور ہے جو موت کے بعد شروع ہوگی اور اس میں انسان کو اس زندگی کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا‘ نیکیاں کمائی ہیں تو ان کی جزا ملے گی اور بدیاں کمائی ہیں تو ان کی سزا ملے گی۔ یہ وہ حقائق ہیں کہ جہاں تک انسان اپنی عقل سلیم اور فطرتِ سلیمہ کی رہنمائی سے پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک ہستی جو یکتا ہے‘ وہی پیدا کرنے والا ہے‘ پروردگار ہے‘ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے‘ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے‘ وہی رازق ہے‘ وہی خالق ہے‘ وہی مالک ہے‘ وہی مشکل کشا ہے‘ تو اب اسی کی بندگی ہونی چاہیے‘ اسی کا حکم ماننا چاہیے‘ اسی سے محبت کرنی چاہیے‘ اسی کو مطلوب بنانا چاہیے‘ اسی کو مقصود بنانا چاہیے۔ یہ اس کا منطقی نتیجہ ہے اور یہاں تک انسان عقل سلیم اور فطرتِ سلیمہ کی رہنمائی سے پہنچ جاتا ہے۔

درخواستِ ہدایت

البتہ اب آگے مسئلہ آتا ہے کہ میں کیا کروں کیا نہ کروں؟ اس میں بھی جہاں تک انفرادی معاملات ہیں‘ اُن کے ضمن میں ایک روشنی اللہ نے انسان کے باطن میں رکھی ہوئی ہے‘ اس کے ضمیر کے اندر‘ قلب اور روح کے اندر یہ روشنی موجود ہے کہ انسان نیکی اور بدی کو خوب جانتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ (الشّمس) ’’قسم ہے نفس انسانی کی اور جو اسے سنوارا (درست کیا‘ اس کی نوک پلک سنواری) پھر اس میں نیکی اور بدی کا علم الہامی طور پر رکھ دیا‘‘۔ ہر انسان جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا برا ہے‘ سچ بولنا اچھا ہے‘ وعدہ پورا کرنا اچھا ہے‘ وعدہ خلافی بُری بات ہے‘ پڑوسی کو ستانا بہت بری بات ہے جبکہ پڑوسی کے ساتھ خوش خُلقی کے ساتھ پیش آنا انسانیت کا تقاضا ہے۔ تو انفرادی سطح پر بھی انسان صحیح اور غلط‘ حق اور باطل میں کچھ نہ کچھ فرق کر لیتا ہے۔ لیکن جب اجتماعی زندگی کا معاملہ آتا ہے تو اس کے لیے مجبوری ہے کہ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ اعتدال کا راستہ کون سا ہے۔ عائلی زندگی میں عورت کا مقام کیا ہونا چاہیے‘ عورت کے حقوق کیا ہونے چاہئیں۔ چنانچہ ایک انتہا تو یہ ہے کہ دنیا میں عورت کو مرد کی ملکیت بنا لیا گیا۔ جیسے بھیڑ بکری کسی کی ملکیت ہے‘ ایسے ہی گویا بیوی بھی خاوند کی ملکیت ہے‘ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں‘ اس کے کوئی حقوق ہی نہیں‘ اس کا کوئی legal status ہی نہیں‘ اس کے کوئی دستوری حقوق ہی نہیں۔ وہ نہ کسی شے کی مالک ہو سکتی ہے‘ نہ کوئی کاروبار کر سکتی ہے۔ اور ایک انتہا یہ ہوتی ہے کہ کوئی قلوپطرہ ہے جو کسی قوم کی سربراہ بن کر بیٹھ جائے اور پھر اس کا بیڑا غرق کر دے‘ جیسے مصر کا بیڑا قلوپطرہ نے غرق کیا۔ تو یہ دو متضاد انتہائیں ہیں۔

آج ہمیں مغرب میں نظر آ رہا ہے کہ مرد و زن بالکل شانہ بشانہ اور برابر ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ فیملی لائف ختم ہو کر رہ گئی۔ اب وہاں صرف one parent family ہے۔ بل کلنٹن نے سالِ نو پر اپنی قوم کو جو پیغام دیا تھا اس میں کہا تھا کہ عنقریب ہماری امریکی قوم کی عظیم اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہو گی۔ (اُس نے الفاظ استعمال کیے تھے: Born without any wedlock)۔ حلال زادہ اور حرام زادہ میں یہی تو فرق ہے کہ اگر ماں باپ کا نکاح ہوا ہے‘ شادی ہوئی ہے تو ان کے ملاپ کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ ان کی حلال اور جائز اولاد ہے۔ لیکن اگر ایک مرد اور ایک عورت نے بغیر نکاح کے تعلق قائم کر لیا ہے تو اس طرح بغیر کسی Legal marriage کے‘ بغیر کسی شادی کے بندھن کے جو اولاد ہو گی وہ حرامی ہے۔ بل کلنٹن کو معلوم تھا کہ ان کے یہاں اب جو بچے پیدا ہو رہے ہیں وہ اکثر و بیشتر بغیر کسی شادی کے بندھن کے پیدا ہو رہے ہیں‘ لہٰذا اس نے کہا کہ عنقریب ہماری قوم کی اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہو گی۔ ایک قوم کی کج روی اور perversion کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے بنیادی فارموں میں سے باپ کا نام ہی نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ بہت سے بچوں کو پتا ہی نہیں ہے کہ ہمارا باپ کون ہے‘ وہ تو اپنی ماں سے واقف ہیں‘ باپ کے بارے میں انہیں کچھ علم نہیں ہے۔

اسی طرح سرمایہ اور محنت کے درمیان حقوق و فرائض کا توازن کیا ہو؟ یہاں بھی انسان بے بس ہے۔ سرمایہ دار کی اپنی مصلحتیں ہیں اور مزدور کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ سرمایہ دار کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مزدور پر کیا بیت رہی ہے‘ وہ کن مشقتوں میں ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

لہٰذا سرمایہ کے کیا حقوق ہیں اور لیبر کے کیا حقوق ہیں‘ ان میں توازن کیا ہو‘ یہ کس طرح معیّن ہو گا؟

اسی طرح کا معاملہ فرد اور معاشرے کا ہے۔ ایک طرف انفرادی حقوق اور انفرادی آزادی ہے اور دوسری طرف معاشرہ‘ قوم اور ریاست (state) ہے۔ کس کے حقوق زیادہ ہوں گے؟ ایک فرد کہتا ہے میں آزاد ہوں‘ میں مادرزاد برہنہ ہو کر سڑک پر چلوں گا‘ تم کون ہو مجھے روکنے والے؟ آیا اسے روکا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اسے روک دیا جائے تو اس کی آزادی پر قدغن ہو جائے گی۔ اگر اسے کہا جائے کہ تم اس طرح نہیں نکل سکتے تو آزادی تو نہیں رہی‘ اس کی مادر پدر آزادی تو ختم ہو جائے گی! لیکن ظاہر بات ہے کہ ایک ریاست اور معاشرہ کے کچھ اصول ہیں‘ اس کے کچھ اخلاقیات ہیں‘ کچھ قواعد و قوانین ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ ان کی پابندی کی جائے‘ اور پابندی کرانے کے لیے وہ چاہتی ہے کہ اس کے پاس اختیارات ہوں‘ اتھارٹی ہو۔ دوسری طرف عوام یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے حقوق کا سارا معاملہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اب اس میں اعتدال کا راستہ کون سا ہے؟

یہ ہے وہ عقدۂ لاینحل (dilemma) کہ جس میں انسان کے لیے اس کے سوا کوئی اور شکل نہیں ہے کہ گھٹنے ٹیک کر اللہ سے دعا کرے کہ پروردگار! میں اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا‘ میں تجھ سے رہنمائی چاہتا ہوں۔ تو مجھے ہدایت دے‘ سیدھے راستہ پر چلا! میں نے تجھے پہچان لیا‘ میں نے یہ بھی جان لیا کہ مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے اور حساب کتاب ہو گا اور مجھے جواب دہی کرنی پڑے گی‘ اور میں اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکا ہوں کہ تیری ہی بندگی کرنی چاہیے‘ تیری ہی اطاعت کرنی چاہیے‘ تیرے ہی حکم پر چلنا چاہیے..... لیکن اس سے آگے میں کیا کروں کیا نہ کروں؟ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے؟ کیا جائز ہے کیا ناجائز ہے؟ میرا نفس تو مجھے اپنی مرغوب چیزوں پر اُکساتا ہے۔ لیکن جس چیز کے لیے میرے نفس نے مجھے اکسایا ہے وہ جائز بھی ہے یا نہیں؟ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ فوری طور پر تو مجھے اس سے مسرت حاصل ہو رہی ہے‘ مجھے اس سے لذت حاصل ہو رہی ہے‘ منفعت پہنچ رہی ہے‘ لیکن

میں نہیں جانتا کہ آخر کار' نتیجے کے اعتبار سے یہ چیز معاشرے کے لیے اور خود میرے لیے نقصان دہ بھی ہوسکتی ہے؟ اے اللہ! میں نہیں جانتا' تو مجھے ہدایت دے' مجھے راستہ دکھا' سیدھا راستہ' درمیانی راستہ' ایسا راستہ جو متوازن ہو' جس میں انصاف ہو' جس میں عدل اور قسط ہو' جس میں کسی کے حقوق ساقط نہ ہوں اور کوئی جابر بن کر مسلطّ نہ ہو جائے' جس میں نہ کوئی حزن و ملال اور مایوسی و درماندگی (depression) ہو' نہ کوئی معاشی استحصال ہو' نہ کوئی سماجی امتیاز ہو۔ اے ربّ! ان تینوں چیزوں سے پاک ایک صراطِ مستقیم مَیں اپنے ذہن سے تلاش نہیں کرسکتا' میرے فیصلے جو ہیں غلط ہو جائیں گے۔ تو میں ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس سیدھے راستے کی ہدایت بخش دے۔

یوں سمجھئے کہ پس منظر میں ایک شخص ہے جو اپنی سلامتیٔ طبع' سلامتیٔ فطرت اور سلامتیٔ عقل کی رہنمائی میں یہاں تک پہنچ گیا کہ اُس نے اللہ کو پہچان لیا' آخرت کو پہچان لیا' یہ بھی طے کرلیا کہ راستہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ کی بندگی کا راستہ' لیکن اس کے بعد اسے احتیاج محسوس ہو رہی ہے کہ مجھے بتایا جائے کہ اب میں دائیں طرف مڑوں یا بائیں طرف مڑوں؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ قدم قدم پر چوراہے آ رہے ہیں' سہ راہے آ رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے ان میں سے ایک ہی راستہ ہوگا جو سیدھا منزلِ مقصود تک لے کر جائے گا۔ کہیں میں غلط موڑ مڑ گیا تو میرا حال اس شعر کے مصداق ہو جائے گا۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دُور شد!

ایک چھوٹی سی غلطی انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سیدھے راستہ سے آپ ذرا سا کج ہو گئے تو جتنا آپ آگے بڑھیں گے اسی قدر اس صراطِ مستقیم سے آپ کا فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ آغاز میں تو محض دس ڈگری کا اینگل تھا' زیادہ فاصلہ نہیں تھا' لیکن یہ دس ڈگری کا اینگل کھلتا چلا جائے گا اور آپ صراطِ مستقیم سے دُور سے دُور تر ہوتے چلے جائیں گے۔

اللہ کرے کہ سورۃ الفاتحہ کو پڑھتے ہوئے ہم بھی اسی مقام پر کھڑے ہوں کہ ہمارا دل ٹھکا ہوا ہو' ہمیں اللہ پر ایمان' اللہ کی ربوبیتّ پر ایمان' اللہ کی رحمانیتّ پر ایمان' اللہ کے مالک یوم الدینّ ہونے پر ایمان حاصل ہو۔ یہ بھی ہمارا عزم ہو اور ہمارا طے شدہ فیصلہ ہو کہ اُسی کی بندگی کرنی ہے' اور پھر اُس کے سامنے دست سوال دراز کریں کہ پروردگار ہمیں ہدایت عطا فرما!

سورۃ الفاتحہ کے تین حصے

اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب کے حوالے سے اب میں اس کے مضامین کا تجزیہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ اس سورۂ مبارکہ کو آپ تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلی تین آیات میں اللہ کی حمد وثنا ہے' آخری تین آیات میں اللہ سے دُعا ہے' جبکہ درمیان کی چوتھی آیت میں بندے کا اپنے ربّ سے ایک عہد و پیمان ہے۔ یہ گویا اللہ اور بندے کا ایک hand shake ہے۔

جزوِ اوّل: پہلی تین آیات میں انسان کی طرف سے ان حقائق کا اظہار ہے جہاں تک وہ خود پہنچ گیا ہے۔ یہ تین آیتیں مل کر ایک جملہ بنتی ہیں۔ گرامر کے اعتبار سے بھی یہ بڑی خوبصورت تقسیم ہے۔ پہلی تین آیتوں میں (جو مل کر ایک جملہ بنتی ہیں) اللہ کی حمد وثنا ہے۔

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ○﴾

''کل شکر اور کل ثنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے۔ بہت رحم فرمانے والا' نہایت مہربان ہے' جزا و سزا کے دن کا مالک ومختار ہے۔''

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ﴾ اَلۡحَمۡدُ مبتدأ' لِلّٰہِ خبر۔ ''کل تعریف (کل حمد وثنا اور کل شکر) اللہ کے لیے ہے''۔ اب وہ اللہ کون ہے؟ ﴿رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ''جو تمام جہانوں کا مالک ہے (پروردگار ہے' پرورش کنندہ ہے)''۔ ﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○﴾ ''جو رحمٰن اور رحیم ہے''۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ میں لام حرفِ جر ہے لہٰذا ''اللّٰہ'' مجرور ہے۔ اس کے بعد آنے والے کلمات رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ' الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اور مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ''اللّٰہ'' کا بدل ہونے کے باعث مجرور ہیں۔ یہ گویا ایک جملہ چلا آ رہا ہے: کل حمد' کل ثنا' کل شکر اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا مالک ہے' مختار ہے' آقا ہے' پروردگار ہے' رحمٰن ہے اور رحیم ہے۔

نوٹ کر لیجیے کہ آیت بسم اللہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ یہ دونوں صفاتی نام ''الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' آئے ہیں۔ بلکہ دونوں جگہ اللہ کے لیے تین نام ہیں۔ سب سے پہلا نام ''اللّٰہ'' ہے۔ اسے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ہے۔ اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ یہ بھی ایک صفاتی نام ہے۔ ''الٰہ'' پر ''ال'' داخل ہو کر ''اللّٰہ'' بن گیا۔ لیکن بہرحال ''اللّٰہ'' کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے اور عرب میں سب سے زیادہ معروف یہی نام تھا۔ جب قرآن نے رحمٰن کا تذکرہ کرنا شروع کیا تو وہ حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ (مَا الرَّحۡمٰنُ) تب یہ کہا گیا: ﴿قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۚ﴾ (بنی اسراء یل: ۱۱۰) ''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دو کہ اُسے اللہ کہہ کر پکارلو یا رحمٰن کہہ کر پکارلو' جو کہہ کر بھی پکارو گے تو تمام اچھے نام اسی کے ہیں''۔ یہ تمام صفاتِ کمال اُسی کی ذات میں موجود ہیں۔

(Call the rose by any name it will smell as sweet)

اسم ''اللہ'' کے تین معنی ہیں۔ تفصیل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عرض کر رہا ہوں کہ عوام کے نزدیک اللہ سے مراد حاجت روا ہے' جس کی طرف انسان تکلیف اور مصیبت میں' مشکلات میں' رزق کے لیے اور اپنی دیگر حاجات کے لیے رجوع کرتا ہے۔ ''اللہ'' کا ایک اور مفہوم یہ ہے کہ وہ ہستی جو انسان کو سب سے زیادہ محبوب ہو ﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾ یہ صوفیاء کرام کا تصوّر ہے۔ اور ایک ہے فلاسفہ کا تصوّر کہ ''اللہ'' وہ ہستی ہے جس کی کنہ سے کوئی واقف نہیں ہوسکتا' اس کے بارے میں غور وفکر سے سوائے تحیّر کے اور کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ تو اس مادّہ ''ا ل ھ'' یا ''و ل ھ'' کے اندر تین معانی ہیں —— (ا) وہ ہستی کہ جس کی طرف اپنی تکلیف ومصیبت کے رفع کرنے کے لیے اور اپنی ضروریات پوری کرانے کے لیے رجوع کیا جائے۔

(۲) وہ ہستی جس سے انتہائی محبت ہو۔ (۳) جس کی ہستی کا ادراک ممکن نہیں' جس کی کنہ ہمارے فہم اور ہمارے تصوّر سے ماوراء' وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔

﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝﴾ رحمت کے مادہ سے یہ اللہ کے دو اسماء ہیں۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ رَحۡمٰن' فَعْلَان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے' چنانچہ اس کے اندر مبالغہ کی کیفیت ہے' یعنی انتہائی رحم کرنے والا۔ اس لیے کہ عرب جو اس وزن پر کوئی لفظ لاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نہایت شدت ہے۔ مثلاً غَضْبان ''غصہ میں لال بھبھوکا شخص''۔ سورۃ الاعراف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے الفاظ آئے ہیں: ﴿غَضۡبَانَ اَسِفًا﴾ ''غصہ اور رنج میں بھرا ہوا''۔ عرب کہے گا: اَنَا عَطْشَانُ: میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں۔ اَنَا جَوْعَانُ: میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔ تو رحمٰن وہ ہستی ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہے۔

اور ''رَحِیۡم'' فعیل کے وزن پر صفتِ مشبّہ ہے۔ جب کوئی صفت کسی کی ذات میں مستقل اور دائم ہو جائے تو وہ فعیل کے وزن پر آتی ہے۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ دونوں صفات اکٹھی ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند بھی ہے اور اس کی رحمت میں دوام بھی ہے' وہ ایک دریا کی طرح مستقل رواں دواں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ دونوں شانیں بیک وقت موجود ہیں۔ ہم اس کا کچھ اندازہ ایک مثال سے کر سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہیں کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہوا اور وہاں آپ دیکھیں کہ کوئی خاتون بے چاری مرگئی ہے اور اس کا دودھ پیتا بچہ اس کی چھاتی کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ یہ بھی پتا نہیں ہے کہ وہ کون ہے' کہاں سے آئی ہے' کوئی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ہر شخص کا دل پسیج جائے گا اور ہر وہ شخص جس کی طبیعت کے اندر نیکی کا کچھ مادہ ہے' چاہے گا کہ اس لاوارث بچے کی کفالت اور اس کی پرورش کی ذمہ داری میں اٹھا لوں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ جذبات کے جوش میں آپ یہ کام تو کر جائیں لیکن کچھ دنوں کے بعد آپ کو پچھتاوا لاحق ہو جائے کہ میں خواہ مخواہ یہ ذمہ داری لے بیٹھا اور میں نے ایک بوجھ اپنے اوپر ناحق طاری کر لیا۔ چنانچہ ہمارے اندر رحم کا جو جذبہ ابھرتا ہے وہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے' وہ مستقل اور دائم نہیں ہے' جبکہ اللہ کی رحمت میں جوش بھی ہے اور دوام بھی ہے' دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔

﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾ ''وہ جزا اور سزا کے دن کا مالک ہے''۔ وہ مختارِ مطلق ہے۔ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال کے مطابق جزا اور سزا کے فیصلے ہوں گے۔ کسی کی وہاں کوئی سفارش نہیں چلے گی' کسی کا وہاں زور نہیں چلے گا' کوئی دے دلا کر چھوٹ نہیں سکے گا' کسی کو کہیں سے مطلقاً کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اُس روز کہا جائے گا: ﴿لِمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ﴾ ''آج کس کے ہاتھ میں اختیار اور بادشاہی ہے؟'' ﴿لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ الۡقَہَّارِ﴾ ''اُس اللہ کے ہاتھ میں ہے جو اکیلا ہے اور پوری کائنات پر چھایا ہوا ہے۔''

اب دیکھئے گرامر کی رو سے یہ ایک جملہ مکمل ہوا: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾ ''کل حمد و ثنا اور شکر اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے' جو رحمٰن ہے' رحیم ہے' اور جو جزا و سزا کے دن کا مالک اور مختارِ مطلق ہے۔''

جزوِ ثانی: سورۃ الفاتحہ کا دوسرا حصہ صرف ایک آیت پر مشتمل ہے' جو ہر اعتبار سے اس سورۃ کی مرکزی آیت ہے:

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾

''ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور ہم صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہتے رہیں گے۔''

ضمیرِ مخاطب ''کَ'' کو مقدم کرنے سے حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ پھر عربی میں فعل مضارع' زمانۂ حال اور مستقبل دونوں کے لیے آتا ہے' لہٰذا میں نے ترجمہ میں ان باتوں کا لحاظ رکھا ہے۔ یہ بندے کا اپنے پروردگار سے عہد و پیمان ہے جسے میں نے hand shake سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا صحیح تصوّر ایک حدیث قدسی کی روشنی میں سامنے آتا ہے' جسے میں بعد میں پیش کروں گا۔ یہاں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ کر لینا تو آسان ہے کہ اے اللہ! میں تیری ہی بندگی کروں گا' لیکن اس فیصلہ کو نبھانا بہت مشکل ہے ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اللہ کی بندگی کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنا آسان نہیں ہے' لہٰذا بندگی کا عہد کرنے کے فوراً بعد اللہ کی پناہ میں آنا ہے کہ اے اللہ! میں اس ضمن میں تیری ہی مدد چاہتا ہوں۔ فیصلہ تو میں نے کر لیا ہے کہ تیری ہی بندگی کروں گا اور اس کا وعدہ کر رہا ہوں' لیکن اس پر کاربند رہنے کے لیے مجھے تیری مدد درکار ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اذکارِ ماثورہ میں ہر نماز کے بعد آپ ﷺ کا ایک ذکر یہ بھی ہے: ((رَبِّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ))(۶) ''پروردگار! میری مدد فرما کہ میں تجھے یاد رکھ سکوں' تیرا شکر ادا کر سکوں اور تیری بندگی احسن طریقے سے بجا لاؤں''۔ تیری مدد کے بغیر میں یہ نہیں کر سکوں گا۔

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ جب بھی آپ اس آیت کو پڑھیں تو آپ کے اوپر ایک خاص کیفیت طاری ہونی چاہیے کہ پہلے کپکپی طاری ہو جائے کہ اے اللہ! میں تیری بندگی کا وعدہ تو کر رہا ہوں' میں نے ارادہ تو کر لیا ہے کہ تیرا بندہ بن کر زندگی گزاروں گا' میں تیری جناب میں اس کا اقرار کر رہا ہوں' لیکن اے اللہ! میں تیری مدد کا محتاج ہوں' تیری طرف سے توفیق ہوگی' تیسیر ہوگی' تعاون ہوگا' نصرت ہوگی تب ہی میں یہ عہد و پیمان پورا کر سکوں گا' ورنہ نہیں۔

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ آیت ایک ہے لیکن جملے دو ہیں۔ ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ'' مکمل جملہ ہے' جملہ فعلیہ انشائیہ' اور ''اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ'' دوسرا جملہ ہے۔ بیچ میں حرفِ عطف واؤ ہے۔ اس سے پہلے اس سورۂ مبارکہ میں کوئی حرفِ عطف نہیں آیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری صفات اُس کی ذات میں بیک وقت موجود ہیں۔ یہاں حرفِ عطف آ گیا: ''اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے'' اور ''تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے''۔ ہمارا سارا دار و مدار اور توکل تجھ ہی پر ہے۔ ہم تیری مدد ہی کے سہارے پر اتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہم تیری ہی

بندگی کرتے رہیں گے۔

ہم نمازِ وتر میں جو دعائے قنوت پڑھتے ہیں کبھی آپ نے اس کے مفہوم پر بھی غور کیا ہے؟ اس میں ہم اللہ تعالیٰ کے حضور بہت بڑا اقرار کرتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُؤْمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ وَنَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ، وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ، اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ، وَنَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ

''اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں' اور تجھ ہی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں' اور ہم تجھ پر ایمان رکھتے ہیں' اور تجھ پر توکل کرتے ہیں' اور تیری تعریف کرتے ہیں' اور تیرا شکر ادا کرتے ہیں اور تیری ناشکری نہیں کرتے۔ اور ہم علیحدہ کر دیتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں ہر اُس شخص کو جو تیری نافرمانی کرے۔ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے ہی لیے نماز پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں' اور ہم تیری طرف کوشش کرتے ہیں اور ہم حاضری دیتے ہیں۔ اور ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں' بے شک تیرا عذاب کافروں کو پہنچنے والا ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ اس دعا کو پڑھتے ہوئے لرزہ طاری ہوتا ہے کہ کتنی بڑی بڑی باتیں ہم اپنی زبان سے نکال رہے ہیں۔ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ ''اے اللہ! ہم صرف تیری ہی مدد چاہتے ہیں'' لیکن نہ معلوم کس کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور کس کس کے سامنے جبیں سائی کرتے ہیں' کس کس کے سامنے اپنی عزتِ نفس کا دھیلا کرتے ہیں۔ پھر یہ الفاظ دیکھئے: نَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ کہ جو بھی تیری نافرمانی کرے اسے ہم علیحدہ کر دیتے ہیں' اس کو ہم چھوڑ دیتے ہیں' اس سے ترکِ تعلق کر لیتے ہیں۔ لیکن کیا واقعۃً ہم کسی سے ترکِ تعلق کرتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں دوستی ہے' رشتہ داری ہے کیا کریں' وہ اپنا عمل جانیں میں اپنا عمل جانوں۔ ہمارا طرزِ عمل تو یہ ہے۔ تو کتنا بڑا دعویٰ ہے اس دُعا کے اندر؟ اور وہ پورا دعویٰ اس ایک جملے میں مضمر ہے: اِیَّاکَ نَعْبُدُ ''پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے''۔ چنانچہ اُس وقت فوری طور پر بندے کے سامنے یہ کیفیت آ جانی چاہیے کہ اے اللہ میں یہ اسی صورت میں کر سکوں گا اگر تیری مدد شاملِ حال رہے۔

جزوِ ثالث: سورۃ الفاتحہ کا تیسرا حصہ تین آیات پر مشتمل ہے' تاہم یہ ایک ہی جملہ بنتا ہے۔

﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝﴾ (آمین!)

''(اے ربّ ہمارے!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی۔ راہ اُن لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا' جو نہ تو مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔''

اب دیکھئے' یہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہی کی تشریح ہے جو آخری تین آیتوں میں ہے۔ ہمیں اللہ سے کیا مدد چاہیے؟ پیسہ چاہیے؟ دولت چاہیے؟ نہیں نہیں! اے اللہ ہمیں یہ نہیں چاہیے۔ پھر کیا چاہیے؟ ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝﴾ ''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما''۔ یہ جو زندگی کے مختلف معاملات میں دوراہے' سہ راہے اور چوراہے آ جاتے ہیں' وہاں ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ صحیح کیا ہے' غلط کیا ہے۔ لہٰذا اے اللہ! ہمیں سیدھے راستہ کی طرف ہدایت بخش۔ ''اِھْدِ'' ہدایت سے فعل امر ہے کہ ہمیں ہدایت دے۔ ہدایت کا ایک درجہ یہ بھی ہے کہ سیدھا راستہ بتا دیا جائے۔ ہدایت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ دکھا دیا جائے' اور ہدایت کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ انگلی پکڑ کر سیدھے راستے پر چلایا جائے' جیسے بچوں کو لے کر آتے ہیں۔ لہٰذا سیدھے راستے کی ہدایت کی دعا میں یہ سارے مفہوم شامل ہوں گے۔ اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا دے۔ اے اللہ! اس سیدھے راستے کے لیے ہمارے سینوں کو کھول دے۔ اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ قُلُوْبَنَا بِالْاِیْمَانِ وَاشْرَحْ صُدُوْرَنَا لِلْاِسْلَامِ ''اے اللہ! ہمارے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منوّر کر دے اور ہمارے سینوں کو اسلام کے لیے کھول دے''۔ ہمیں اس پر انشراحِ صدر ہو جائے۔ اور پھر یہ کہ ہمیں اس سیدھے راستے کے اوپر چلا۔

اب آگے اس صراطِ مستقیم کی بھی وضاحت ہے' اور یہ وضاحت دو طرح سے ہے۔ صراطِ مستقیم کی وضاحت ایک مثبت انداز میں اور ایک منفی انداز میں کی گئی ہے۔ مثبت انداز یہ ہے کہ ﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵﴾ ''(اے اللہ!) ان لوگوں کے راستہ پر (ہمیں چلا) جن پر تو نے اپنا انعام نازل فرمایا''۔ یہ مضمون جا کر سورۃ النساء میں کھلے گا کہ منعم علیہم چار گروہ ہیں: ﴿مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ۶۹﴾ ''کہ وہ نبی' صدّیقین' شہداء اور صالحین ہیں۔ اور بہت ہی خوب ہے ان کی رفاقت''۔ اے اللہ! ان کے راستہ پر ہمیں چلا۔ یہ تو مثبت بات ہوگئی۔ منفی انداز یہ اختیار فرمایا: ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝﴾ ''نہ اُن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی وہ گمراہ ہوئے''۔ جو لوگ صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے وہ دو قسم کے ہیں۔ ان میں فرق یہ ہے کہ جو شرارتِ نفس کی وجہ سے غلط راستہ پر چلتا ہے اس پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے' اور جس کی نیت تو غلط نہیں ہوتی' لیکن وہ غلو کر کے جذبات میں آ کر کوئی غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے تو وہ ضالّ (گمراہ) ہے۔ چنانچہ 'مَغْضُوْب عَلَیْھِمْ' کی سب سے بڑی مثال یہود ہیں کہ اللہ کی کتاب ان کے پاس تھی' شریعت موجود تھی' لیکن شرارتِ نفس اور تکبر کی وجہ سے وہ غلط راستہ پر چل پڑے۔ جبکہ نصاریٰ 'ضَآلِّیْن' ہیں' انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں صرف غلو کیا ہے۔ جیسے ہمارے یہاں بھی بعض نعت گو اور نعت خواں نبی کریم ﷺ کی شان بیان کرتے ہیں تو مبالغہ آرائی کرتے ہوئے کبھی انہیں اللہ سے بھی اوپر لے جاتے ہیں۔ یہ غلو ہوتا ہے' لیکن ہوتا ہے نیک نیتی سے' محبت سے۔ چنانچہ نصاریٰ نے حبِ رسول میں غلو سے کام لیتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ ہمارے شیعہ بھائیوں میں سے بھی بعض لوگ ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا ہی بنا بیٹھے ہیں۔ مثلاً ع

''لیکن نہیں ہے ذاتِ خدا سے جدا علی!''

بہر حال یہ غلو ہوتا ہے جو انسان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے: ﴿قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ﴾ (المائدۃ:۷۷) ''اے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق غلو سے کام نہ لو''۔ لیکن نصاریٰ نے اپنے دین میں اور

حضرت عیسٰیؑ کی محبت میں غلو سے کام لیا تو وہ گمراہ ہو گئے۔ تو اے اللہ! ان سب کے راستے سے ہمیں بچا کر سیدھے راستے پر چلا 'جو صدّیقین کا' انبیاء کا' شہداء کا اور صالحین کا راستہ ہے۔

حدیثِ قدسی

آخر میں وہ حدیث قدسی پیش کر رہا ہوں جس میں سورۃ الفاتحہ ہی کو الصَّلٰوۃ (نماز) قرار دیا گیا ہے۔ یہ مسلم شریف کی روایت ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ' فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ' وَاِذَا قَالَ ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ' وَاِذَا قَالَ ﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ قَالَ مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ —— وَقَالَ مَرَّۃً: فَوَّضَ اِلَیَّ عَبْدِیْ —— فَاِذَا قَالَ ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ قَالَ ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ' فَاِذَا قَالَ ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ قَالَ ھٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ)) (۷)

''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے (اس کا نصف حصہ میرے لیے اور نصف حصہ میرے بندے کے لیے ہے) اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اُس نے طلب کیا۔ جب بندہ کہتا ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی (میرا شکر ادا کیا)۔ جب بندہ کہتا ہے: "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب بندہ کہتا ہے: "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی —— اور ایک مرتبہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''میرے بندے نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا —— (گویا یہ پہلا حصہ کل کا کل اللہ کے لیے ہے۔) پھر جب بندہ کہتا ہے: "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اُس نے مانگا۔ (گویا یہ حصہ ایک قول و قرار اور عہد و میثاق ہے۔ اسے میں نے کہا تھا کہ یہ اللہ اور بندے کے درمیان hand shake ہے۔) پھر جب بندہ کہتا ہے: ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (کل کا کل) میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اُسے بخشا''۔

اس حدیث کی رو سے سورۃ الفاتحہ کے تین حصے بن جائیں گے۔ پہلا حصہ کلیتاً اللہ کے لیے ہے اور آخری حصہ کلیتاً بندے کے لیے' جبکہ درمیانی و مرکزی آیت: ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' بندے اور اللہ کے مابین قول و قرار ہے۔ گویا اس کا بھی نصفِ اوّل اللہ کے لیے اور نصفِ ثانی بندے کے لیے ہے۔ اس طرح نصف نصف کی تقسیم بتمام و کمال پوری ہو گئی!

ایک بات یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس حدیثِ قدسی میں ''قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ'' کے بعد آیت ''بسم اللہ'' کا ذکر نہیں ہے' بلکہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' سے بات براہِ راست آگے بڑھتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس ضمن میں امام ابو حنیفہؒ کا موقف درست ہے کہ آیت بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جزو نہیں ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر ''آمین'' کہنا مسنون ہے۔ ''آمین'' کے معنی ہیں ''اے اللہ ایسا ہی ہو!'' اس سورۂ مبارکہ کا اسلوب چونکہ دعائیہ ہے' لہٰذا دعا کے اختتام پر ''آمین'' کہہ کر بندہ گویا پھر بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ اے پروردگار! میں نے یہ عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے' تو اسے شرفِ قبول عطا فرما!

بارك الله لی ولكم فی القرآن العظيم ونفعنی واياكم بالآيات والذكر الحكيم

❁❁❁

سُورۃُ البقرۃ

تمہیدی کلمات

قرآن حکیم کی پہلی سورت سورۃ الفاتحہ ہے' جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ یہ بات آپ کے سامنے آ چکی ہے کہ یہ وہ پہلی سورت ہے جو رسول اللہ ﷺ پر پوری کی پوری نازل ہوئی۔ اس سے پہلے صرف متفرق آیات نازل ہوئی تھیں۔ یعنی سورۃ العلق' سورۃ القلم' سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات۔

یہ بات بھی آپ کے سامنے آ چکی ہے کہ قرآن حکیم میں مکی اور مدنی سورتوں کے مجموعوں کے اعتبار سے بھی سات گروپ ہیں۔ پہلا گروپ وہ ہے جس کا ہم سورۃ الفاتحہ سے آغاز کر چکے ہیں۔ اس گروپ میں جو مکی سورت ہے وہ صرف سورۃ الفاتحہ ہے۔ یہ حجم کے اعتبار سے بہت چھوٹی لیکن اپنے مقام و مرتبہ اور فضیلت کے اعتبار سے بہت بڑی ہے' یہاں تک کہ اسے ''القرآن العظیم'' بھی کہا گیا۔ گویا یہ اپنی جگہ پر خود ایک عظیم قرآن ہے۔ اس کے بعد مدنی سورتیں چار ہیں۔ یہ طویل ترین مدنی سورتیں ہیں اور دو دو سورتوں کے دو جوڑوں پر مشتمل ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن حکیم کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں' جبکہ کچھ منفرد بھی ہیں۔ سورۃ الفاتحہ منفرد ہے' اس کا کوئی جوڑا نہیں ہے' اگرچہ اس کی معنوی مناسبت قرآن مجید کی آخری سورت سورۃ الناس کے ساتھ جڑتی ہے' لیکن بہر حال اُس کا جوڑا سورۃ الفلق ہے۔ قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ اور قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ دونوں سورتوں پر مشتمل ایک جوڑا ہے' لہٰذا سورۃ الفاتحہ کا کوئی جوڑا نہیں ہے' یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پورا قرآن ہی اس کا جوڑا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے بعد جو چار سورتیں ہیں یہ جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران ایک جوڑا ہے جبکہ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ دوسرا جوڑا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں علامت یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران دونوں کا آغاز حروفِ مقطعات ''الٓمّٓ'' سے ہوتا ہے' جبکہ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ دونوں میں بغیر کسی تمہید کے گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ سورۃ النساء کا آغاز ہوتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ......﴾ اور سورۃ المائدۃ شروع ہوتی ہے: ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ﴾. پہلے کوئی تمہیدی بات نہیں کی گئی۔

سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کا یہ جو جوڑا ہے' ان دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے ''الزَّھۡرَاوَین'' کا نام عطا فرمایا ہے۔ ''زَھۡراء'' کا مطلب ہے بہت تابناک' روشن۔ یہ لفظ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام کا جزء بن چکا ہے اور انہیں فاطمۃ الزہراء کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی لختِ جگر' نورِ چشم حضرت فاطمہ بہت ہی روشن چہرے والی خاتون تھیں۔ حضور ﷺ کے الفاظ کے مطابق سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران ''الزّھۡرَاوَین'' یعنی دو انتہائی تابناک اور روشن سورتیں ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی آخری دو سورتوں کو ''المُعوَّذتَین'' کا نام دیا گیا ہے۔

پہلے گروپ کی ان مدنی سورتوں کے مضامین کے بارے میں جان لیجیے کہ دو مضمون ہیں جو اِن میں متوازی چلتے ہیں۔ پہلا مضمون شریعت اسلامی کا ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے تقریباً دو تہائی قرآن نازل ہو چکا ہے۔ سورۃ البقرۃ پہلی مدنی سورۃ ہے' اس سے پہلے زمانی اعتبار سے پورا مکی قرآن نازل ہو چکا تھا' اگرچہ ترتیب میں وہ بعد میں آئے گا۔ اس میں شریعت کے احکام نہیں تھے۔ لہٰذا اب جبکہ مدینہ میں مسلمانوں کا ایک آزاد معاشرہ قائم ہو گیا' یا یوں کہہ لیجیے کہ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہو گئی' جہاں اپنے قواعد' اپنے قوانین' اپنے اصولوں کے مطابق سارے معاملات طے کیے جا سکتے تھے' تب شریعت کا نزول شروع ہوا۔ سورۃ البقرۃ میں یوں سمجھئے کہ احکامِ شریعت کی ابتدا ہوتی ہے۔ کوئی بھی تعمیر کرنی ہو تو پہلے اس کا ابتدائی خاکہ بنتا ہے' اس کے بعد اس کے تفصیلی نقشے بنتے ہیں۔ تو ابتدائی خاکہ جو ہے شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا وہ سورۃ البقرۃ میں ہے۔ پھر سورۃ النساء میں اس کے اندر مزید اضافہ ہوتا ہے' اور سورۃ المائدۃ میں شریعت کے تکمیلی احکام آتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ تکمیل شریعت کی سورت ہے۔ اسی میں وہ آیت ہے: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾ (آیت ۳)

دوسرا مضمون جو اِن سورتوں میں چلتا ہے وہ ہے اہل کتاب سے خطاب۔ مکی قرآن میں سارا خطاب مشرکین سے تھا' یعنی عرب کے وہ لوگ جو مکہ میں اور اس کے اردگرد آباد تھے۔ وہاں کوئی یہودی یا کوئی نصرانی نہیں تھا' سب کے سب مشرکین عرب تھے۔ تو پورے مکی قرآن میں انہی سے ردّ و قدح ہے' گفتگو ہے' بحث و نزاع ہے' ان کے اعتراضات کے جوابات ہیں اور ان پر اتمامِ حجت کیا گیا ہے۔ اگرچہ اہل کتاب کا تذکرہ حوالہ کے طور پر موجود ہے' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر موجود ہے' لیکن بنی اسرائیل سے' یہودیوں سے' یا نصاریٰ سے کوئی خطاب نہیں ہوا۔ ان سے خطاب مدینہ میں آ کر شروع ہوا ہے' کیونکہ وہاں یہودی آباد تھے۔ مدینہ میں یہود کے تین مضبوط قبیلے موجود تھے۔ تو یہ ہیں دو بنیادی مضمون اس پہلے گروپ کے۔ ان میں آپ کو ایک اور تقسیم نظر آ جائے گی کہ اہل کتاب میں سے جن سے ''یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ'' کے الفاظ سے خطاب ہو رہا ہے یعنی یہود' ان سے ساری گفتگو سورۃ البقرۃ میں ہے' جبکہ جو نصاریٰ ہیں ان سے گفتگو سورۂ آل عمران میں ہے۔

سورۃ البقرۃ کی اہمیت و فضیلت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اسے حضور ﷺ نے قرآن مجید کا ذروۂ سنام یعنی کلائمکس قرار دیا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلۡبَقَرَۃُ سَنَامُ الۡقُرۡآنِ وَذُرۡوَتُہٗ)) (مسند احمد) حجم کے اعتبار سے بھی قرآن کی سب سے بڑی سورت یہی ہے' ۲۸۶ آیات پر مشتمل ڈھائی پاروں پر پھیلی ہوئی ہے۔

سورۃ البقرۃ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور اس اعتبار سے میں نے اس کا ایک نام تجویز کیا ہے "سُوْرَۃُ الْاُمَّتَیْن" یعنی دو اُمتوں کی سورت۔ اس کے نصف اوّل میں اصل روئے سخن اُمت سابق یہود کی طرف ہے' جو اُس وقت تک اللہ کے نمائندہ تھے اور زمین پر وہی اُمتِ مسلمہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی بداعمالی کی وجہ سے اپنے آپ کو اس مقام کا نااہل ثابت کیا' لہٰذا وہ معزول کیے گئے اور ایک نئی اُمت اُمتِ محمدﷺ اس مقام پر فائز کی گئی۔ تو نصفِ اوّل میں سابق اُمت سے گفتگو ہے اور ان پر گویا فردِ جرم عائد کی گئی ہے کہ تم نے یہ کیا' یہ کیا اور یہ کیا۔ ہم نے تم پر یہ احسانات کیے' ہم نے یہ بھلائیاں کیں' تمہارے اوپر ہماری یہ رحمتیں ہوئیں' لیکن تمہارا طرزِ عمل یہ ہے' جس کی بنا پر اب تم معزول کیے جا رہے ہو۔ یہ مضمون ہے پہلے نصف کا۔ اور اب جو دوسری اُمت قائم ہوئی ہے یعنی اُمتِ محمدﷺ' اس سے خطاب ہے نصفِ ثانی کے اندر۔ تو اس کی یہ ترتیب ذہن میں رکھیے۔ پہلا حصہ اٹھارہ رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس کی آیات کی تعداد ۱۵۲ ہے۔ جبکہ دوسرا حصہ بائیس رکوعوں پر مشتمل ہے' لیکن تعدادِ آیات ۱۳۴ ہے۔ اس طرح یہ دونوں حصے تقریباً برابر بن جاتے ہیں۔

نصفِ اوّل کے جو اٹھارہ رکوع ہیں ان کو بھی تین حصوں میں تقسیم کر لیجیے۔ پہلے چار رکوع تمہیدی ہیں۔ پھر دس رکوعوں میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ پھر چار رکوع تحویلی ہیں۔ تمہیدی رکوعوں میں سے پہلے دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کی ایک تقسیم بیان کر دی گئی جو دنیا میں ہمیشہ پائے جائیں گے۔ جب بھی کوئی نئی دعوت آئے گی تو کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اسے تہہ دل سے قبول کریں گے اور اس کے لیے "ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" کے مصداق سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ کچھ لوگ وہ ہوں گے جو اس کی مخالفت پر اوّل روز سے کمر کس لیں گے اور اسے ہرگز نہیں مانیں گے۔ اور کچھ وہ ہوں گے جو بین بین رہیں گے۔ ان کا طرزِ عمل یہ رہے گا کہ بات کچھ اچھی لگتی بھی ہے لیکن اس کے لیے قربانی دینا کٹھن ہے' اس کے تقاضے بڑے مشکل ہیں۔ بات اچھی ہے' قبول بھی کرتے ہیں' لیکن عملاً اس کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ ان کے لیے سورۃ النساء میں ﴿لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ تفصیل پہلے دو رکوعوں میں آئی ہے۔

اس کے بعد دوسرے دو رکوعوں میں گویا کلی قرآن کا خلاصہ آ گیا ہے۔ ایک رکوع میں قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ اور ایک رکوع میں قرآن مجید کا فلسفہ بیان کر دیا گیا۔ یہ مضامین اصل میں مکی سورتوں کے ہیں اور وہاں تفصیل سے زیر بحث آ چکے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کے نزول سے پہلے ان مضامین پر بہت مفصل بحثیں ہو چکی ہیں' لیکن چونکہ حکمتِ خداوندی میں اس مصحف کی ترتیب میں سب سے پہلے سورۃ البقرۃ ہے' لہٰذا سورۃ البقرۃ میں ان مضامین کا خلاصہ درج کر دیا گیا' تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے وہ مضامین ذہن نشین کر لیے جائیں۔

اب بسم اللہ کر کے ہم سورۃ البقرۃ کے مطالعہ کا آغاز کر رہے ہیں۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

﴿الٓمّٓ ① ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۛ فِیۡہِ ۚۛ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ② الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ③ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ④ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّھِمۡ ٭ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ⑤ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡھِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَھُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡھُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ⑥ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ وَ عَلٰی سَمۡعِھِمۡ ؕ وَ عَلٰۤی اَبۡصَارِھِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫ وَّ لَھُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ⑦﴾

آیت ۱ ﴿الٓمّٓ ①﴾ "ا۔ ل۔ م۔"

یہ حروفِ مقطعات ہیں جن کے بارے میں یہ جان لیجیے کہ ان کے حقیقی' حتمی اور یقینی مفہوم کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ اور اس کے رسولﷺ کے۔ یہ ایک راز ہے اللہ اور اس کے رسولﷺ کے مابین۔ حروفِ مقطعات کے بارے میں اگرچہ بہت سی آراء ظاہر کی گئی ہیں' لیکن ان میں سے کوئی شے رسول اللہﷺ سے منقول نہیں ہے۔ البتہ یہ بات ثابت ہے کہ اس طرح کے حروفِ مقطعات کا کلام میں استعمال عرب میں معروف تھا' اس لیے کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ قرآن مجید کی ۱۱۴ میں سے ۲۹ سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوا ہے۔ سورۂ قٓ' سورۃ القلم اور سورۂ صٓ کے آغاز میں ایک ایک حرف ہے۔ حٰمٓ' طٰہٰ اور یٰسٓ دو دو حرف ہیں۔ الٓمّٓ اور الٓرٰ تین تین حروف ہیں جو کئی سورتوں کے آغاز میں آئے ہیں۔ الٓمّٓصٓ اور الٓمّٓرٰ چار چار حروف ہیں۔ حروفِ مقطعات میں زیادہ سے زیادہ پانچ حروف یکجا آتے ہیں۔ چنانچہ کٓھٰیٰعٓصٓ سورۂ مریم کے آغاز میں اور حٰمٓ عٓسٓقٓ سورۃ الشوریٰ کے آغاز میں آئے ہیں۔ ان کے بارے میں اس وقت مجھے اس سے زائد کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔ اپنے مفصل درسِ قرآن میں مَیں نے ان پر تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔

آیت ۲ ﴿ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۛ فِیۡہِ ۚۛ﴾ "یہ الکتاب ہے' اس میں کچھ شک نہیں"۔ یا "یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔"

آیت کے اس ٹکڑے کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ پہلے ترجمے کی رو سے یہ ہے وہ کتابِ موعود جس کی خبر دی گئی تھی کہ نبی آخر الزماںﷺ آئیں گے اور اُن کو ہم ایک کتاب دیں گے۔ یہ گویا حوالہ ہے محمد رسول اللہﷺ کے بارے میں پیشین گوئیوں کی طرف کہ جو تورات میں موجود تھیں۔ آج بھی "کتابِ مقدس" کی کتاب استثناء (Deuteronomy) کے اٹھارہویں باب کی اٹھارہویں آیت کے اندر یہ الفاظ موجود ہیں کہ: "میں ان (بنی اسرائیل) کے لیے ان کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا"۔ تو یہ بائبل میں حضرت محمدﷺ کی پیشین گوئیاں تھیں۔ آگے چل کر سورۃ الاعراف میں ہم اسے تفصیل سے پڑھ بھی لیں گے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہی وہ کتابِ موعود ہے کہ جو نازل کر دی گئی ہے محمد رسول اللہﷺ پر۔ اس

میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں ہر شے اپنی جگہ پر یقینی ہے' حتمی ہے' اٹل ہے' اور یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو یہ دعویٰ لے کر اٹھی ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ جو کتابیں آسمانی کہلائی جاتی ہیں اُن کے اندر بھی یہ دعویٰ کہیں موجود نہیں ہے' انسانی کتابوں میں تو اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ علامہ اقبال جیسے نابغہ عصر فلسفی بھی اپنے لیکچرز کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سب صحیح ہے' ہوسکتا ہے جیسے جیسے علم آگے بڑھے مزید نئی باتیں سامنے آئیں۔ لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ''اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے''۔ پہلے ترجمہ کی رو سے ''ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ'' ایک جملہ مکمل ہوگیا اور ''لَا رَیۡبَ فِیۡہِ'' دوسرا جملہ ہے۔ جبکہ دوسرے ترجمہ کی رو سے ''ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ'' مکمل جملہ ہے۔ یعنی ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔''

﴿ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲﴾﴾ ''ہدایت ہے پرہیزگار لوگوں کے لیے۔''

یعنی ان لوگوں کے لیے جو بچنا چاہیں۔ تقویٰ کا لفظی معنی ہے بچنا۔ ''وَقٰی۔ یَقِی'' کا مفہوم ہے ''کسی کو بچانا'' جبکہ تقویٰ کا معنی ہے خود بچنا۔ یعنی کج روی سے بچنا' غلط روی سے بچنا اور افراط وتفریط کے دھکوں سے بچنا۔ جن لوگوں کے اندر فطرتِ سلیمہ ہوتی ہے اُن کے اندر یہ اخلاقی حِس موجود ہوتی ہے کہ وہ بھلائی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہر بُری چیز سے بچنا چاہتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو قرآن مجید کے اصل مخاطبین ہیں۔ گویا جس کے اندر بھی بچنے کی خواہش ہے اس کے لیے یہ کتاب ہدایت ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں ہماری فطرت کی ترجمانی کی گئی تھی اور ہم سے یہ کہلوایا گیا تھا: ﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝﴾ ''(اے پروردگار!) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش''۔ آیت زیر مطالعہ گویا اس کا جواب ہے: ﴿ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۛ فِیۡہِ ۚۛ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲﴾﴾ لو وہ کتاب موجود ہے کہ جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اور یہ ان تمام لوگوں کے لیے ہدایت کے تقاضوں کے اعتبار سے کفایت کرتی ہے جن میں غلط روی سے بچنے کی خواہش موجود ہے۔

وہ لوگ کون ہیں؟ اب یہاں دیکھئے تاویل خاص کا معاملہ آجائے گا کہ اُس وقت رسول اللہ ﷺ کی تیرہ برس کی محنت کے نتیجہ میں مہاجرین وانصار کی ایک جماعت وجود میں آگئی تھی' جس میں حضراتِ ابوبکر' عمر' عثمان' علی' طلحہ' زبیر' سعد بن عبادہ اور سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہم جیسے نفوسِ قدسیہ شامل تھے۔ تو گویا اشارہ کر کے دکھایا جارہا ہے کہ دیکھو یہ وہ لوگ ہیں' دیکھ لو اِن میں کیا اوصاف ہیں۔

آیت ۳ ﴿الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ﴾ ''جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر''

یہ متقین کے اوصاف میں سے پہلا وصف ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بس جو کچھ ہماری آنکھوں سے نظر آرہا ہے' حواسِ خمسہ کی زد میں ہے بس وہی کل حقیقت ہے۔ نہیں! اصل حقیقت تو ہمارے حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہوئی ہے۔

ہدایتِ قرآنی کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ جو اصل حقیقت ہے وہ اس کی نگاہوں سے مستور ہے۔ انگلستان کے بہت بڑے فلسفی بریڈلے (Bradley) کی کتاب کا عنوان ہے: ''Appearance and Reality''۔ اس نے لکھا ہے کہ جو کچھ نظر آرہا ہے یہ حقیقت نہیں ہے' حقیقت اس کے پیچھے ہے' کنفیوشس (۵۵۱ تا ۴۷۹ ق م) چین کا بہت بڑا حکیم اور فلسفی تھا' اس کی تعلیمات میں اخلاقی رنگ بہت نمایاں ہے۔ اُس کا ایک جملہ ہے:

There is nothing more real than what can not be seen; and there is nothing more certain than what can not be heard.

یعنی وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے اور کانوں سے سنے نہیں جا سکتے اُن سے زیادہ یقینی اور واقعی حقائق کوئی اور نہیں ہیں۔

﴿وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ﴾ ''اور نماز قائم کرتے ہیں''

اللہ کے ساتھ اپنا ایک ذہنی وقلبی اور روحانی رشتہ استوار کرنے کے لیے نماز قائم کرتے ہیں۔

﴿وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳﴾﴾ ''اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

یعنی خیر میں' بھلائی میں' نیکی میں' لوگوں کی تکالیف دور کرنے میں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے' اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

آیت ۴ ﴿وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ﴾ ''اور جو ایمان رکھتے ہیں اُس پر بھی جو (اے نبی ﷺ) آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے''

﴿وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ﴾ ''اور اُس پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا۔''

یہ بہت اہم الفاظ ہیں۔ عام طور پر آج کل ہمارے ہاں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ سابقہ آسمانی کتب تورات اور انجیل وغیرہ کے پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں' اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ''کوئی ضرورت نہیں'' کی حد تک تو شاید بات صحیح ہو' لیکن ''کوئی فائدہ نہیں'' والی بات بالکل غلط ہے۔ دیکھئے قرآن کے آغاز ہی میں کس قدر اہتمام کے ساتھ کہا جارہا ہے کہ ایمان صرف قرآن پر ہی نہیں' اس پر بھی ضروری ہے جو اس سے پہلے نازل کیا گیا۔ سورۃ النساء کوئی چھ ہجری میں جاکر نازل ہوئی ہے' اور اس کی آیت ۱۳۶ کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ الۡکِتٰبِ الَّذِیۡ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَ الۡکِتٰبِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول (محمد ﷺ) پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کرچکا ہے۔''

چنانچہ تورات' انجیل' زبور اور صحفِ ابراہیمؑ پر اجمالی ایمان کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ البتہ چونکہ ہم سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ان کتابوں میں تحریف ہوگئی ہے لہٰذا ان کتابوں کی کوئی شے قرآن پر حجت نہیں ہوگی۔ جو چیز قرآن سے ٹکرائے گی ہم اس کو ردّ کردیں گے اور ان کتابوں کی کسی شے کو دلیل کے طور پر نہیں لائیں گے۔ لیکن جہاں قرآن مجید کی کسی بات کی نفی نہ ہو رہی ہو وہاں ان سے استفادہ میں کوئی حرج نہیں۔ بہت سے حقائق ایسے ہیں جو ہمیں ان کتابوں ہی سے ملتے ہیں۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام کے

درمیان زمانی ترتیب (Chronological Order) ہمیں تورات سے ملتی ہے' جو قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں کبھی حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر بعد میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلے آ جاتا ہے۔ یہاں تو کسی اور پہلو سے ترتیب آتی ہے' لیکن تورات میں ہمیں حضراتِ ابراہیم' اسحاق' یعقوب' انبیاءِ بنی اسرائیل موسیٰ اور عیسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام) کی تاریخ ملتی ہے۔ اس اعتبار سے سابقہ کتبِ سماویہ کی اہمیت پیشِ نظر رہنی چاہیے۔

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾ ''اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔''

یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ باقی سب چیزوں کے لیے تو لفظ ایمان آیا ہے جبکہ آخرت کے لیے ''ایقان'' آیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ مؤثر شے ایمان بالآخرۃ ہے۔ اگر انسان کو یہ یقین ہے کہ آخرت کی زندگی میں مجھے اللہ کے حضور حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے تو اس کا عمل صحیح ہوگا۔ لیکن اگر اس یقین میں کمی واقع ہو گئی تو توحید بھی محض ایک عقیدہ (Dogma) بن کر رہ جائے گی اور ایمان بالرسالت بھی بدعات کو جنم دے گا۔ پھر ایمان بالرسالت کے مظاہر یہ رہ جائیں گے کہ بس عید میلاد النبیؐ منا لیجیے اور نعتیہ اشعار کہہ دیجیے' اللہ اللہ خیر صلا۔ انسان کا عمل تو آخرت کے یقین کے ساتھ درست ہوتا ہے۔

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾ کے الفاظ میں یہ مفہوم بھی ہے کہ ''آخرت پر انہی کا یقین ہے''۔ یہاں گویا حصر بھی ہے۔ اس اعتبار سے کہ یہودی بھی مدعی تھے کہ ہم آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہاں تضاد (contrast) دکھایا جا رہا ہے کہ آخرت پر یقین رکھنے والے تو یہ لوگ ہیں! تاویلِ خاص کے اعتبار سے یہ کہا جائے گا کہ یہ لوگ تمہاری نگاہوں کے سامنے موجود ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کی تیرہ برس کی کمائی ہیں۔ جو انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج یعنی تلاوتِ آیات' تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت کا نتیجہ ہیں۔

آیت ۵ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ربّ کی طرف سے ہدایت پر ہیں''

وہ ابتدائی ہدایت بھی ان کے پاس تھی اور اس تکمیلی ہدایت یعنی قرآن پر بھی ان کا پورا یقین ہے' اور محمد ﷺ کا اتباع بھی وہ کر رہے ہیں۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵﴾ ''اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

''فلاح'' کا لفظ بھی قرآن مجید کی بہت اہم اصطلاح ہے۔ اس کا معنی ہے منزلِ مراد کو پہنچ جانا' کسی باطنی حقیقت کا عیاں ہو جانا۔ اس پر ان شاء اللہ سورۃ المؤمنون کے شروع میں گفتگو ہوگی۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ فلاح پانے والے' کامیاب ہونے والے' منزلِ مراد کو پہنچنے والے اصل میں یہی لوگ ہیں۔ تاویلِ خاص کے اعتبار سے یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف اشارہ ہو گیا' جبکہ تاویلِ عام کے اعتبار سے ہر شخص کو بتا دیا گیا کہ اگر قرآن کی ہدایت سے مستفید ہونا ہے تو یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کرو۔

آیت ۶ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاۗءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶﴾ ''یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا (یعنی وہ لوگ کہ جو کفر پر اڑ گئے) ان کے لیے برابر ہے (اے محمد ﷺ) کہ آپ انہیں انذار فرمائیں یا نہ فرمائیں' وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''

''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو اپنے کفر پر اڑ گئے۔ اس کو ہم تاویلِ عام میں نہیں لے سکتے۔ اس لیے کہ اس صورت میں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص نے کسی بھی وقت کفر کیا اب وہ ہدایت پر آ ہی نہیں سکتا! یہاں یہ بات مراد نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مغالطہ کی بنا پر یا عدم توجہی کی بنا پر کفر میں ہے' حق اس پر واضح نہیں ہوا ہے تو انذار و تبشیر سے اسے فائدہ ہو جائے گا۔ آپ اسے وعظ و نصیحت کریں تو وہ اس کا اثر قبول کرے گا۔ لیکن جو لوگ حق کو حق سمجھنے اور پہچاننے کے باوجود محض ضد' ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے یا تکبر اور حسد کی وجہ سے کفر پر اڑے رہے تو ان کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ اے نبی (ﷺ)! ان کے لیے برابر ہے خواہ آپؐ انہیں سمجھائیں یا نہ سمجھائیں' ڈرائیں یا نہ ڈرائیں' انذار فرمائیں یا نہ فرمائیں' وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس لیے کہ سوتے کو تو جگایا جا سکتا ہے' جاگتے کو آپ کیسے جگائیں گے؟ یہ گویا مکہ کے سرداروں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ ان کے دل اور دماغ گواہی دے چکے ہیں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور قرآن ان پر اتمامِ حجت کر چکا ہے اور وہ مان چکے ہیں کہ قرآن کا مقابلہ ہم نہیں کر سکتے' یہ محمد (ﷺ) کا مکمل معجزہ ہے' اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے۔

آیت ۷ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ﴾ ''اللہ نے مہر کر دی ہے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر۔''

ایسا کیوں ہوا؟ ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر ابتدا ہی میں نہیں لگا دی گئی' بلکہ جب انہوں نے حق کو پہچاننے کے بعد رد کر دیا تو اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی اور ان کی سماعت پر بھی۔

﴿وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ﴾ ''اور ان کی آنکھوں کے سامنے پردہ پڑ چکا ہے''

یہ مضمون سورۂ یٰسٓ کے شروع میں بہت شرح وبسط کے ساتھ دوبارہ آئے گا۔

﴿وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷﴾ ''اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

یہ دوسرے گروہ کا تذکرہ ہو گیا۔ ایک رکوع (کل سات آیات) میں دو گروہوں کا ذکر سمیٹ لیا گیا۔ ایک وہ گروہ جس نے قرآن کریم کی دعوت سے صحیح صحیح استفادہ کیا' اُن میں طلبِ ہدایت کا مادہ موجود تھا' ان کی فطرتیں سلیم تھیں' ان کے سامنے دعوت آئی تو انہوں نے قبول کی اور قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ وہ گلستانِ محمدیؐ کے گلِ سرسبد ہیں۔ وہ شجرۂ قرآنی کے نہایت مبارک اور مقدس پھل ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے حق کو پہچان بھی لیا' لیکن اپنے تعصب یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس کو رد کر دیا۔ اُن کا ذکر بھی بہت اختصار کے ساتھ آ گیا۔ ان کا تفصیلی ذکر آپ کو مکی سورتوں میں ملے گا۔ اب آگے تیسرے گروہ کا ذکر آ رہا ہے۔

آیات ۸ تا ۲۰

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا ہُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ۸ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَمَا
یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ۹ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ بِمَا
کَانُوۡا یَکۡذِبُوۡنَ ۱۰ وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ۱۱ اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ
الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ ۱۲ وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ اٰمِنُوۡا کَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ کَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَہَآءُ ؕ
اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ السُّفَہَآءُ وَلٰکِنۡ لَّا یَعۡلَمُوۡنَ ۱۳ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰی شَیٰطِیۡنِہِمۡ ۙ
قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَکُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَہۡزِءُوۡنَ ۱۴ اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ وَیَمُدُّہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ۱۵
اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی ۪ فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُہُمۡ وَمَا کَانُوۡا مُہۡتَدِیۡنَ ۱۶ مَثَلُہُمۡ کَمَثَلِ
الَّذِی اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَہٗ ذَہَبَ اللّٰہُ بِنُوۡرِہِمۡ وَتَرَکَہُمۡ فِیۡ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ ۱۷ صُمٌّ
بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَہُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ۱۸ اَوۡ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیۡہِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ ۚ یَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ
اٰذَانِہِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ؕ وَاللّٰہُ مُحِیۡطٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ ۱۹ یَکَادُ الۡبَرۡقُ یَخۡطَفُ اَبۡصَارَہُمۡ ؕ کُلَّمَاۤ
اَضَآءَ لَہُمۡ مَّشَوۡا فِیۡہِ ۙ وَاِذَاۤ اَظۡلَمَ عَلَیۡہِمۡ قَامُوۡا ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَذَہَبَ بِسَمۡعِہِمۡ وَاَبۡصَارِہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی
کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۲۰﴾

آیت ۸ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا ہُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ۸﴾ ''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر بھی اور یومِ آخر پر بھی' مگر وہ حقیقت میں مؤمن نہیں ہیں۔''

یہاں ایک بات سمجھ لیجیے! اکثر و بیشتر مفسرینؒ نے اس تیسری قسم (category) کے بارے میں یہی رائے قائم کی ہے کہ یہ منافقین کا تذکرہ ہے' اگرچہ یہاں لفظ منافق یا لفظِ نفاق نہیں آیا۔ لیکن مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اس کے بارے میں ایک رائے ظاہر کی ہے جو بڑی قیمتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں ایک کردار کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے' غور کرنے والے غور کر لیں' دیکھ لیں کہ وہ کس پر چسپاں ہو رہا ہے۔ اور جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں تو اِن میں شخصیات کی کردار نگاری کا یہ جو نقشہ کھینچا جا رہا ہے یہ بالفعل دو طبقات کے اوپر راست آ رہا تھا۔ ایک طبقہ علماءِ یہود کا تھا۔ وہ بھی کہتے تھے کہ ہم بھی اللہ کو مانتے ہیں' آخرت کو بھی مانتے ہیں۔ (اسی لیے یہاں رسالت کا ذکر نہیں ہے۔) وہ کہتے تھے کہ اگر سوا لاکھ نبی آئے ہیں تو ان سوا لاکھ کو تو ہم مانتے ہیں' بس ایک محمد (ﷺ) کو ہم نے نہیں مانا اور ایک عیسیٰ (علیہ السلام) کو نہیں مانا' تو ہمیں بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہاں جس انداز میں تذکرہ ہو رہا ہے اس سے ان کا کردار بھی جھلک رہا ہے اور روئے سخن بھی اُن کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے دسویں جماعت کے زمانے میں دہلی میں مَیں نے جوتوں کی ایک دکان پر دیکھا تھا کہ ایک بہت بڑا جوتا لٹکایا ہوا تھا اور ساتھ لکھا تھا: .Free to Whom it Fits یعنی جس کے پاؤں میں یہ ٹھیک ٹھیک آ جائے وہ اِسے مفت لے جائے! تو یہاں بھی ایک کردار کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ اب یہ کردار جس کے اوپر بھی فٹ بیٹھ جائے وہ اس کا مصداق شمار ہو گا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' زیادہ تر مفسرینؒ کی رائے تو یہی ہے کہ یہ منافقین کا تذکرہ ہے۔ لیکن یہ کردار بعینہٖ یہود کے علماء پر بھی منطبق ہو رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ مدینہ منورہ میں نفاق کا پودا' بلکہ صحیح تر الفاظ میں نفاق کا جھاڑ جھنکاڑ جو پروان چڑھا ہے وہ یہودی علماء کے زیر اثر پروان چڑھا ہے۔ جیسے جنگل کے اندر بڑے بڑے درخت بھی ہوتے ہیں اور ان کے نیچے جھاڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ تو یہ نفاق کا جھاڑ جھنکاڑ دراصل یہودی علماء کا جو بہت بڑا پودا تھا اُس کے سائے میں پروان چڑھا ہے اور ان دونوں میں معنوی ربط بھی موجود ہے۔

آیت ۹ ﴿یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ﴾ ''وہ دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اللہ کو اور اہل ایمان کو۔''

یُخٰدِعُوۡنَ باب مفاعلہ ہے۔ اس باب کا خاصہ ہے کہ اس میں ایک کشمکش اور کشاکش موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے اس کا ترجمہ کیا: ''وہ دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

﴿وَمَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ﴾ ''اور نہیں دھوکہ دے رہے مگر صرف اپنے آپ کو''

یہ بات یقینی ہے کہ اپنے آپ کو تو دھوکہ دے رہے ہیں' لیکن یہ اللہ' اُس کے رسولؐ کو اور اہل ایمان کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۴۲ میں منافقین کے بارے میں یہی بات بڑے واضح انداز میں بایں الفاظ آئی ہے: ﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَہُوَ خَادِعُہُمۡ ۚ﴾ ''یقیناً منافقین اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں' حالانکہ اللہ ہی انہیں دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔''

﴿وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ۹﴾ ''اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔''

یہ بات بہت اچھی طرح نوٹ کر لیجیے کہ منافقین کی بھی اکثریت وہ تھی جنہیں اپنے نفاق کا شعور نہیں تھا۔ وہ اپنے تئیں خود کو مسلمان سمجھتے تھے۔ وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہتے تھے کہ انہوں نے خواہ مخواہ اہل مکہ کے ساتھ لڑائی مول لے لی ہے' اس کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں امن کے ساتھ رہنا چاہیے اور امن و آشتی کے ماحول میں ان سے بات کرنی چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم خیر خواہ ہیں' ہم بھلی بات کہہ رہے ہیں' جبکہ یہ بیوقوف لوگ ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ کس سے ٹکرا رہے ہیں! ہاتھ میں اسلحہ نہیں ہے اور لڑائی کے لیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ تو بیوقوف ہیں۔ اپنے بارے میں وہ سمجھتے تھے کہ ہم تو بڑے مخلص ہیں۔ جان لیجیے کہ منافقین میں یقیناً بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ جو اسلام میں داخل ہی دھوکہ دینے کی خاطر ہوتے تھے اور اُن پر پہلے دن سے یہ واضح ہوتا تھا کہ ہم مسلمان نہیں ہیں' ہم نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام کا محض لبادہ اوڑھا ہے۔ ایسے منافقین کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۷۲ میں آئے گا۔ لیکن اکثر و بیشتر منافقین دوسری طرح کے تھے' جنہیں اپنے

نفاق کا شعور حاصل نہیں تھا۔

آیت ۱۰ ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ ’’اُن کے دلوں میں ایک روگ ہے‘‘

یہ روگ اور بیماری کیا ہے؟ ایک لفظ میں اس کو ’’کردار کی کمزوری‘‘ (weakness of character) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص وہ ہوتا ہے جو حق کو حق سمجھ کر قبول کر لیتا ہے اور پھر ’’ہر چہ بادا باد‘‘ (جو ہو سو ہو) کی کیفیت کے ساتھ اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جو حق کو پہچان لینے کے باوجود رد کر دیتا ہے۔ اسے ’’کافر‘‘ کہا جاتا ہے۔ جبکہ ایک شخص وہ بھی ہے جو حق کو حق پہچان کر آیا تو سہی‘ لیکن کردار کی کمزوری کی وجہ سے اس کی قوتِ ارادی کمزور ہے۔ ایسے لوگ آخرت بھی چاہتے ہیں لیکن دنیا بھی ہاتھ سے دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہاں کا بھی کوئی نقصان نہ ہو اور آخرت کا بھی سارا بھلا ہمیں مل جائے۔ درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے بارے میں کہا گیا کہ ان کے دلوں میں ایک روگ ہے۔

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ ’’تو اللہ نے ان کے روگ میں اضافہ کر دیا۔‘‘

یہ اللہ کی سنت ہے۔ آپ حق پر چلنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ حق کا راستہ آپ پر آسان کر دے گا‘ لیکن اگر آپ برائی کی طرف جانا چاہیں تو بڑی سے بڑی برائی آپ کے لیے ہلکی ہوتی چلی جائے گی۔ آپ خیال کریں گے کہ کوئی خاص بات نہیں‘ جب یہ کر لیا تو اب یہ بھی کر گزرو۔ اور اگر کوئی بین بین لٹکنا چاہے تو اللہ اس کو اُسی راہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ ٹھیک ہے‘ وہ سمجھتے ہیں ہم کامیاب ہو رہے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کو بھی دھوکہ دے لیا‘ وہ ہمیں مسلمان سمجھتے ہیں اور یہودیوں کو بھی دھوکہ دے لیا‘ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اُن کے ساتھی ہیں۔ تو ان کا یہ سمجھنا کہ ہم کامیاب ہو رہے ہیں‘ بالکل غلط ہے۔ حقیقت میں یہ کامیابی نہیں ہے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ نے وہ تباہ کن راستہ ان کے لیے آسان کر دیا ہے جو انہوں نے خود منتخب کیا تھا۔ ان کے دلوں میں جو روگ موجود تھا اللہ نے اس میں اضافہ فرما دیا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ ’’اور ان کے لیے تو دردناک عذاب ہے‘‘

اوپر کفار کے لیے الفاظ آئے تھے: ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑦﴾ اور یہاں عَذَابٌ اَلِيْمٌ کا لفظ آیا ہے کہ اُن کے لیے دردناک اور المناک عذاب ہے۔

﴿بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ⑩﴾ ’’بسبب اس جھوٹ کے جو وہ بول رہے تھے۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ ’’اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ مت فساد کرو زمین میں‘‘

اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم نے محمدﷺ کو اللہ کا رسول مان لیا تو اب ان کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرو‘ انؐ کے پیچھے چلو۔ انؐ کا حکم ہے تو جنگ کے لیے نکلو۔ انؐ کی طرف سے تقاضا آتا ہے تو مال پیش کرو۔ اور اگر تم اس سے کتراتے ہو تو پھر جماعتی زندگی کے اندر فتنہ و فساد پھیلا رہے ہو۔

﴿قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪﴾ ’’وہ کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔‘‘

ہم تو صلح کرانے والے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ لڑنا بھڑنا کوئی اچھی بات نہیں ہے‘ ٹکراؤ اور تصادم کوئی اچھے کام تھوڑے ہی ہیں۔ بس لوگوں کو ٹھنڈے ٹھنڈے دعوت دیتے رہو‘ جو چاہے قبول کر لے اور جو چاہے رد کر دے۔ یہ خواہ مخواہ دشمن سے ٹکرانا اور جنگ کرنا کس لیے؟ اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے قربانیاں دینے‘ مصیبتیں جھیلنے اور مشقتیں برداشت کرنے کے مطالبے کاہے کے لیے؟

آیت ۱۲ ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ کہ حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں‘ مگر انہیں شعور نہیں ہے۔‘‘

یہی تو ہیں جو فساد پھیلانے والے ہیں۔ اس لیے کہ محمدﷺ کی دعوت تو زمین میں اصلاح کے لیے ہے۔ اس اصلاح کے لیے کچھ آپریشن کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ مریض اس درجے کو پہنچ چکا ہے کہ آپریشن کے بغیر اس کی شفا ممکن نہیں ہے۔ اب اگر تم اس آپریشن کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہو تو درحقیقت تم فساد مچا رہے ہو‘ لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔ آیت کے آخری الفاظ ﴿وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫﴾ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ شعوری نفاق اور شے ہے‘ جبکہ یہاں سارا تذکرہ غیر شعوری نفاق کا ہو رہا ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ ’’اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ‘ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں‘‘

آخر دیکھو‘ یہ دوسرے اہل ایمان ہیں‘ جب بلاوا آتا ہے تو فوراً لبیک کہتے ہوئے حاضر ہوتے ہیں‘ جبکہ تم نے اور ہی روش اختیار کر رکھی ہے۔

﴿قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ ’’وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جیسے یہ بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟‘‘

منافقین سچے اہل ایمان کے بارے میں کہتے تھے کہ انہیں تو اپنے نفع کی فکر ہے نہ نقصان کی‘ نہ خطرات کا کوئی خیال ہے نہ اندیشوں کا کوئی گمان۔ جان‘ مال اور اولاد کی کوئی پروا نہیں۔ یہ گھر بار کو چھوڑ کر آ گئے ہیں‘ اپنے بال بچے کفارِ مکہ کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے ہیں کہ سردارانِ قریش اُن کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں‘ تو یہ تو بیوقوف لوگ ہیں۔ (آج کل آپ ایسے لوگوں کو fanatics کہتے ہیں) بھئی دیکھ بھال کر چلنا چاہیے‘ دائیں بائیں دیکھ کر چلنا چاہیے۔ اپنے نفع و نقصان کا خیال کر کے چلنا چاہیے۔ ٹھیک ہے‘ اسلام دینِ حق ہے‘ لیکن بہرحال اپنی اور اپنے اہل و عیال کی مصلحتوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔ یہ لوگ تو معلوم ہوتا ہے بالکل دیوانے اور fanatics ہو گئے ہیں۔

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ کہ وہی بیوقوف ہیں‘ لیکن انہیں علم نہیں۔‘‘

وہ صادق الایمان جو ایمان کے ہر تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت حاضر ہیں' ان سے بڑا عقل مند اور ان سے بڑا سمجھ دار کوئی نہیں۔ انہوں نے یہ جان لیا ہے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے' یہ زندگی تو عارضی ہے' تو اگر کل کے بجائے آج ختم ہو جائے یا ابھی ختم ہو جائے تو کیا فرق پڑے گا؟ یہاں سے جانا تو ہے' آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں' جانا تو ہے۔ تو عقل تو ان کے اندر ہے۔

آیت ۱۴ ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚ﴾ ''اور جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان رکھتے ہیں۔''

عام یہودی بھی کہتے تھے کہ ہم بھی تو آخر اللہ کو اور آخرت کو مانتے ہیں' جبکہ منافق تو رسولؐ کو بھی مانتے تھے۔

﴿وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰی شَیٰطِیۡنِہِمۡ ۙ﴾ ''اور جب یہ خلوت میں ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس''

یہاں ''شیاطین'' سے مراد یہود کے علماء بھی ہو سکتے ہیں اور منافقین کے سردار بھی۔ عبداللہ بن اُبی منافقینِ مدینہ کا سردار تھا۔ اگر وہ کبھی انہیں ملامت کرتا کہ معلوم ہوتا ہے تم تو بالکل پوری طرح سے مسلمانوں میں شامل ہی ہو گئے ہو' تمہیں کیا ہو گیا ہے تم محمد (ﷺ) کی ہر بات مان رہے ہو' تو اب انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے کہنا پڑتا تھا کہ نہیں نہیں' ہم تو مسلمانوں کو بیوقوف بنا رہے ہیں' ہم ان سے ذرا تمسخر کر رہے ہیں' ہم آپ ہی کے ساتھ ہیں' آپ فکر نہ کریں۔ منافق تو ہوتا ہی دو رُخا ہے۔ ''نفق'' کہتے ہیں سرنگ کو' جس کے دو راستے ہوتے ہیں۔ ''نافقاء'' گوہ کے بِل کو کہا جاتا ہے۔ گوہ اپنے بل کے دو منہ رکھتا ہے کہ اگر کتا شکار کے لیے ایک طرف سے داخل ہو جائے تو وہ دوسری طرف سے نکل بھاگے۔ تو منافق بھی ایسا شخص ہے جس کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ سورۃ النساء میں منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے: ﴿مُذَبۡذَبِیۡنَ بَیۡنَ ذٰلِکَ ٭ۖ لَاۤ اِلٰی ہٰۤـؤُلَآءِ وَلَاۤ اِلٰی ہٰۤـؤُلَآءِ ؕ﴾ (آیت ۱۴۳) یعنی کفر و ایمان کے درمیان ڈانوا ڈول ہیں' مذبذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ نہ اِدھر کے ہیں نہ اُدھر کے ہیں۔

لفظ ''شَیۡطٰن'' کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مادہ ''ش ط ن'' ہے اور دوسری یہ کہ یہ ''ش و ط'' مادہ سے ہے۔ شَطَنَ کے معنی ہیں تَبَعَّدَ یعنی بہت دور ہو گیا۔ پس شیطان سے مراد ہے جو اللہ کی رحمت سے بہت دور ہو گیا۔ جبکہ شَاطَ یَشُوۡطُ کے معنی ہیں اِحۡتَرَقَ غَضَبًا وَحَسَدًا یعنی کوئی شخص غصے اور حسد کے اندر جل اٹھا۔ اس سے فَعۡلَان کے وزن پر ''شیطان'' ہے' یعنی وہ جو حسد اور غضب کی آگ میں جل رہا ہے۔ چنانچہ ایک تو شیطان وہ ہے جو جنات میں سے ہے' جس کا نام پہلے ''عزازیل'' تھا' اب ہم اسے ابلیس کے نام سے جانتے ہیں۔ پھر یہ کہ دنیا میں جو بھی اُس کے پیروکار ہیں اور اس کے مشن میں شریک کار ہیں' خواہ انسانوں میں سے ہوں یا جنوں میں سے' وہ بھی شیاطین ہیں۔ اسی طرح اہل کفر اور اہل زیغ کے جو بڑے بڑے سردار ہوتے ہیں ان کو بھی شیاطین سے تعبیر کیا گیا۔ آیت زیر مطالعہ میں شیاطین سے یہی سردار مراد ہیں۔

﴿قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَکُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے تو محض مذاق کر رہے ہیں۔''

جب وہ علیحدگی میں اپنے شیطانوں یعنی سرداروں سے ملتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں' ان مسلمانوں کو تو ہم بیوقوف بنا رہے ہیں' ان سے استہزاء اور تمسخر کر رہے ہیں جو ان کے سامنے ''اٰمَنَّا'' کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔

آیت ۱۵ ﴿اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ وَیَمُدُّہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾ ''درحقیقت اللہ اُن کا مذاق اڑا رہا ہے اور اُن کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دے رہا ہے کہ وہ اپنے عقل کے اندھے پن میں بڑھتے چلے جائیں۔''

اللہ تعالیٰ سرکشوں کی رسّی دراز کرتا ہے۔ کوئی شخص سرکشی کے راستے پر چل پڑے تو اللہ تعالیٰ اسے فوراً نہیں پکڑتا' بلکہ اسے ڈھیل دیتا ہے کہ چلتے جاؤ جہاں تک جانا چاہتے ہو۔ تو ان کی بھی اللہ تعالیٰ رسّی دراز کر رہا ہے' لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اصل میں مذاق تو اللہ کے نزدیک اُن کا اڑ رہا ہے۔

لفظ ''یَعۡمَہُوۡنَ'' عقل کے اندھے پن کے لیے آیا ہے۔ اس کا مادہ ''ع م ھ'' ہے۔ آگے آیت ۱۸ میں لفظ ''عُمۡیٌ'' آ رہا ہے جو ''ع م ی'' سے ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ''عَمِہَ یَعۡمَہُ'' بصیرت سے محرومی کے لیے آتا ہے اور ''عَمِیَ یَعۡمٰی'' بصارت سے محرومی کے لیے۔

آیت ۱۶ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی ۪﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ہدایت کے عوض گمراہی خرید لی ہے۔''

یہ بڑا پیارا اندازِ بیان ہے۔ ان کے سامنے دونوں options تھے۔ ایک شخص نے گمراہی کو چھوڑا اور ہدایت لے لی۔ اسے اس کی بھاری قیمت دینا پڑی۔ اسے تکلیفیں اٹھانی پڑیں' آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا' قربانیاں دینا پڑیں۔ اس نے یہ سب کچھ منظور کیا اور ہدایت لے لی۔ جبکہ ایک شخص نے ہدایت دے کر گمراہی لے لی ہے۔ آسانی تو ہو گئی' فوری تکلیف سے تو بچ گئے' دونوں طرف سے اپنے مفادات کو بچا لیا' لیکن حقیقت میں سب سے زیادہ گھاٹے کا سودا یہی ہے۔

﴿فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُہُمۡ وَمَا کَانُوۡا مُہۡتَدِیۡنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''سو نافع نہ ہوئی ان کی تجارت ان کے حق میں اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔''

''رَبِحَ یَرۡبَحُ'' کے معنی ہیں تجارت وغیرہ میں نفع اٹھانا' جو ایک صحیح اور جائز نفع ہے' جبکہ ''ر ب و'' مادہ سے رَبَا یَرۡبُوۡ کے معنی بھی مال میں اضافہ اور بڑھوتری کے ہیں' لیکن وہ حرام ہے۔ تجارت کے اندر جو نفع ہو جائے وہ ''رِبح'' ہے' جو جائز نفع ہے اور اپنا مال کسی کو قرض دے کر اُس سے سود وصول کرنا ''رِبا'' ہے جو حرام ہے۔

اب یہاں دو بڑی پیاری تمثیلیں آ رہی ہیں۔ پہلی تمثیل کفار کے بارے میں ہے اور دوسری تمثیل منافقین کے بارے میں۔

آیت ۱۷ ﴿مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ﴾ ''ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی۔''

﴿فَلَمَّآ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ﴾ ''پھر جب اُس آگ نے سارے ماحول کو روشن کر دیا''

﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ﴾ ''تو اللہ نے ان کا نورِ بصارت سلب کر لیا''

﴿وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور چھوڑ دیا ان کو ان اندھیروں کے اندر کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔''

یہاں ایک شبِ تاریک کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے۔علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل!

اندھیری شب ہے۔قافلہ بھٹک رہا ہے۔کچھ لوگ بڑی ہمت کرتے ہیں کہ اندھیرے میں بھی اِدھر اُدھر سے لکڑیاں جمع کرتے ہیں اور آگ روشن کر دیتے ہیں۔لیکن عین اُس وقت جب آگ روشن ہوتی ہے تو کچھ لوگوں کی بینائی سلب ہو جاتی ہے۔پہلے وہ اندھیرے میں اس لیے تھے کہ خارج میں روشنی نہیں تھی۔اب بھی وہ اندھیرے ہی میں رہ گئے کہ خارج میں تو روشنی آ گئی مگر ان کے اندر کی روشنی گل ہو گئی‘ان کی بصارت سلب ہو گئی۔یہ مثال ہے اُن کفار کی جو اسلام کی روشنی پھیلنے کے باوجود اس سے محروم رہے‘محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے ہر سو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔کوئی حقیقت واضح نہیں تھی۔قافلۂ انسانیت اندھیری شب میں بھٹک رہا تھا۔محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور انہوں نے آگ روشن کر دی۔اس طرح ہدایت واضح ہو گئی۔لیکن کچھ ضد‘تعصب‘تکبّر یا حسد کی بنیاد پر کچھ لوگوں کی اندر کی بینائی زائل ہو گئی۔چنانچہ وہ تو ویسے کے ویسے بھٹک رہے ہیں۔جیسے پہلے اندھیرے میں تھے ویسے ہی اب بھی اندھیرے میں ہیں۔روشنی میں آنے والے تو وہ ہیں جن کا ذکر سب سے پہلے ''الْمُتَّقِین'' کے نام سے ہوا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''یہ بہرے ہیں‘گونگے ہیں‘اندھے ہیں‘سو اب یہ نہیں لوٹیں گے۔''

اَصَمّ بہرے کو کہتے ہیں‘صُمٌّ اس کی جمع ہے‘ اَبۡكَم گونگے کو کہا جاتا ہے‘بُكۡمٌ اس کی جمع ہے۔اَعۡمٰی اندھے کو کہتے ہیں‘عُمۡیٌ اس کی جمع ہے۔فرمایا کہ یہ بہرے ہیں‘گونگے ہیں‘اندھے ہیں‘اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔یہ کون ہیں؟ابو جہل‘ابولہب‘ولید بن مغیرہ اور عقبہ ابن ابی معیط سب کے سب ابھی زندہ تھے جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں۔یہ سب تو غزوۂ بدر میں واصلِ جہنم ہوئے جو سن ۲ ہجری میں ہوا۔تو یہ لوگ اس مثال کا مصداقِ کامل تھے۔آگے اب دوسری مثال بیان کی جا رہی ہے۔

آیت ۱۹ ﴿اَوۡ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ ۚ﴾ ''یا اُن کی مثال ایسی ہے جیسے بڑے زور کی بارش برس رہی ہے آسمان سے‘اُس میں اندھیرے بھی ہیں اور گرج اور بجلی (کی چمک) بھی۔''

﴿يَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِىۡٓ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ؕ﴾ ''یہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں کے اندر ٹھونسے لیتے ہیں مارے کڑک کے‘موت کے ڈر سے۔''

یعنی اس ہیبت ناک کڑک سے کہیں اُن کی جانیں نہ نکل جائیں۔

﴿وَاللّٰهُ مُحِيۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور اللہ ایسے کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

وہ ان منکرینِ حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے‘یہ بچ کر کہاں جائیں گے؟

آیت ۲۰ ﴿يَكَادُ الۡبَرۡقُ يَخۡطَفُ اَبۡصَارَهُمۡ ؕ﴾ ''قریب ہے کہ بجلی اُچک لے ان کی آنکھیں۔''

﴿كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِيۡهِ ۙ﴾ ''جب چمکتی ہے ان پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں۔''

جونہی انہیں ذرا روشنی محسوس ہوتی ہے اور دائیں بائیں کچھ نظر آتا ہے تو کچھ دور چل لیتے ہیں۔

﴿وَاِذَآ اَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُوۡا ؕ﴾ ''اور جب ان پر تاریکی طاری ہو جاتی ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔''

یہ ایک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ایک طرف بارش ہو رہی ہے۔یعنی قرآن مجید آسمان سے نازل ہو رہا ہے۔بارش کو قرآن مجید ''مَآءً مُّبٰرَكًا'' قرار دیتا ہے اور یہ خود ''كِتٰبٌ مُّبٰرَكٌ'' ہے۔لیکن یہ کہ اس کے ساتھ کڑکے ہیں‘گرج ہے‘کفر سے مقابلہ ہے‘کفر کی طرف سے دھمکیاں ہیں‘اندیشے اور خطرات ہیں‘امتحانات اور آزمائشیں ہیں۔چنانچہ منافقین کا معاملہ یہ ہے کہ ذرا کہیں حالات کچھ بہتر ہوئے‘کچھ breething space ملی تو مسلمانوں کے شانہ بشانہ تھوڑا سا چل لیے کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔جب وہ دیکھتے کہ حالات کچھ پُرسکون ہیں‘کسی جنگ کے لیے بلایا نہیں جا رہا ہے تو بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے اور اپنے ایمان کا اظہار بھی کرتے‘لیکن جیسے ہی کوئی آزمائش آتی ٹھٹک کر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔

﴿وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمۡعِهِمۡ وَاَبۡصَارِهِمۡ ؕ﴾ ''اور اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت کو سلب کر لیتا۔''

لیکن اللہ کا قانون یہی ہے کہ وہ فوری گرفت نہیں کرتا۔اُس نے انسان کو ارادے اور عمل کی آزادی دی ہے۔تم اگر مؤمن صادق بن کر رہنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ اُس روش کو تمہارے لیے آسان کر دے گا۔اور اگر تم نے اپنے تعصب یا تکبّر کی وجہ سے کفر کا راستہ اختیار کر لیا تو اللہ اُسی کو تمہارے لیے کھول دے گا۔اور اگر تم بیچ میں لٹکنا چاہتے ہو ﴿لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ﴾ تو لٹکتے رہو۔اللہ تعالیٰ نہ کسی کو جبراً حق پر لائے گا اور نہ ہی کسی کو جبراً باطل کی راہ پر لے کر جائے گا۔اس لیے کہ اگر جبر کا معاملہ ہو تو پھر امتحان کیسا؟ پھر تو جزا و سزا کا تصور غیر منطقی اور غیر معقول ٹھہرتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۰﴾﴾ ''یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

سورۃ البقرۃ کے یہ ابتدائی دو رکوع اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں انسانی شخصیتوں کی تین گروہوں میں تقسیم کردی گئی ہے' اور تاؤ یل عام ذہن میں رکھیے کہ جب بھی کوئی دعوتِ حق اُٹھے گی' اگر وہ واقعتاً کل کی کل حق کی دعوت ہو اور اُس میں انقلابی رنگ ہو کہ باطل سے پنجہ آزمائی کر کے اسے نیچا دکھانا ہے اور حق کو غالب کرنا ہے' تو یہ تین قسم کے افراد لازماً وجود میں آ جائیں گے۔ ان کو پہچاننا اور ان کے کردار کے پیچھے جو اصل پس منظر ہے اس کو جاننا بہت ضروری ہے۔

آیات ۲۱ تا ۲۹

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَ ادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُہَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَۃُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾ وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ؕ کُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡہَا مِنۡ ثَمَرَۃٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا ہٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَ اُتُوۡا بِہٖ مُتَشَابِہًا ؕ وَ لَہُمۡ فِیۡہَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ ٭ۙ وَّ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵﴾ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ ۪ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ۚ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ٭ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىہُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۹﴾﴾

سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع میں قرآن کی دعوت کا خلاصہ آ گیا ہے کہ قرآن اپنے مخاطب کو کیا ماننے کی دعوت دیتا ہے اور اُس کی پکار کیا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' سورۃ البقرۃ کے نزول سے قبل دو تہائی قرآن نازل ہو چکا تھا۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے وہ قرآن بعد میں آئے گا' لیکن ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے وہ پس منظر میں موجود ہے۔ لہٰذا سورۃ البقرۃ کے پہلے دو رکوعوں میں مکی قرآن کے مباحث کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے اور تیسرے رکوع میں قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ اور لبِ لباب آ گیا ہے' جبکہ قرآن مجید کا فلسفہ اور بعض نہایت اہم موضوعات و مسائل کا خلاصہ چوتھے رکوع میں بیان ہوا ہے۔

اب ہم تیسرے رکوع کا مطالعہ کر رہے ہیں:

آیت ۲۱ ﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس ربّ (مالک) کی جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے جتنے لوگ گزرے ہیں (انہیں بھی پیدا کیا) تاکہ تم بچ سکو۔''

یہ قرآن کی دعوت کا خلاصہ ہے اور یہی تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام کی دعوت تھی۔ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں ایک ایک رسول کا نام لے کر اس کی دعوت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو' تمہارا کوئی اور الٰہ اُس کے سوا نہیں ہے''۔ سورۃ الشعراء میں رسولوں کی دعوت کے ضمن میں بار بار یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ۞﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔ سورۂ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت ان الفاظ میں بیان ہوئی: ﴿اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۳﴾﴾ ''کہ اللہ کی بندگی کرو' اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!''

پھر از روئے قرآن یہی عبادتِ ربّ انسان کی غایتِ تخلیق ہے: ﴿وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی صرف اس لیے کیا ہے کہ ہماری بندگی کریں''۔ چنانچہ تمام رسولوں کی دعوت یہی ''عبادتِ ربّ'' ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی یہی ہے' لیکن یہاں ایک بہت بڑا فرق واقع ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ باقی تمام رسولوں کی دعوت کے ضمن میں صیغۂ خطاب ''یٰقَوۡمِ'' ہے۔ یعنی ''اے میری قوم کے لوگو!'' جبکہ یہاں صیغۂ خطاب ہے: ''یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ'' یعنی ''اے بنی نوعِ انسان!'' معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام رسول علیہم السلام صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف آئے' جبکہ پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری اور کامل رسول ہیں جن کی دعوت آفاقی ہے۔

عام طور پر لوگ جو غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں اُس پر اِس دلیل سے جمے رہتے ہیں کہ ہمارے آباء و اَجداد کا راستہ یہی تھا۔ ﴿الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ﴾ کے الفاظ میں اس دلیل کا ردّ بھی موجود ہے کہ جیسے تم مخلوق ہو ویسے ہی تمہارے آباء و اجداد بھی مخلوق تھے' جیسے تم خطا کر سکتے ہو اسی طرح وہ بھی تو خطا کر سکتے تھے۔ لہٰذا یہ نہ دیکھو کہ آباء و اجداد کا راستہ کیا تھا' بلکہ یہ دیکھو کہ حق کیا ہے۔

﴿لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''تاکہ تم بچ سکو''۔ یعنی دنیا میں افراط و تفریط کے دھکوں سے بچ سکو اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ سکو۔ ان دونوں سے اگر بچنا ہے تو اللہ کی بندگی کی روش اختیار کرو۔

آیت ۲۲ ﴿الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪﴾ ''جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنا دیا اور

آسمان کو چھت بنا دیا۔''

﴿وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ ''اور آسمان سے پانی برسایا''

﴿فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾ ''پھر اُس (پانی) کے ذریعے سے (زمین سے) ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔''

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾ ''تو ہرگز اللہ کے مدمقابل نہ ٹھہراؤ جانتے بوجھتے۔''

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جب تم بھی مانتے ہو کہ اس کائنات کا خالق اللہ کے سوا کوئی نہیں' تو پھر اس کے شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ اہل عرب یہ بات مانتے تھے کہ کائنات کا خالق صرف اور صرف اللہ ہے' البتہ جو اُن کے دیوی دیوتا تھے انہیں وہ سمجھتے تھے کہ یہ اللہ کے اَوتار ہیں یا اللہ کے ہاں بہت پسندیدہ ہیں' اُس کے محبوب ہیں' اُس کے اولیاء ہیں' اُس کی بیٹیاں ہیں' لہٰذا یہ شفاعت کریں گے تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ جب تم یہ مانتے ہو کہ کائنات کا خالق ایک اللہ ہے' وہی اس کا مدبر ہے تو اب کسی کو اس کا مدمقابل نہ بناؤ۔

اَنْدَاد 'نِدّ'' کی جمع ہے' اس کا معنی مدمقابل ہے۔ خطبہ جمعہ میں آپ نے یہ الفاظ سنے ہوں گے: ''لَا ضِدَّ لَهٗ وَلَا نِدَّ لَهٗ''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ)) [1] ''یہ کہ تو اس کا کوئی مدمقابل ٹھہرائے حالانکہ اُس نے تجھے پیدا کیا ہے''۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کسی درجے میں کوئی شریک یا مدمقابل نہیں ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ اُمت کو اس درجے توحید کی باریکیوں تک پہنچا کر گئے ہیں کہ ایسے تصورات کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے۔ ایک صحابیؓ نے آپ ﷺ کے سامنے ایسے ہی کہہ دیا: ''مَاشَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتَ'' یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپؐ چاہیں۔ آپ ﷺ نے انہیں فوراً ٹوک دیا اور فرمایا: ((اَجَعَلْتَنِيْ لِلّٰهِ نِدًّا؟ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ)) ''کیا تو نے مجھے اللہ کا مدمقابل بنا دیا ہے؟ (بلکہ وہی ہوگا) جو تنہا اللہ چاہے۔'' [2] اس کائنات میں مشیت صرف ایک ہستی کی چلتی ہے۔ کسی اور کی مشیت اس کی مشیت کے تابع پوری ہو جائے تو ہو جائے' لیکن مشیت مطلقہ صرف اُس کی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (القصص:٥٦)

''(اے نبی ﷺ!) یقیناً آپ جسے چاہیں اُسے ہدایت نہیں دے سکتے' بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

اگر ہدایت کا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں ہوتا تو ابوطالب دنیا سے ایمان لائے بغیر رخصت نہ ہوتے۔

ان دو آیتوں میں توحید کے دونوں پہلو بیان ہو گئے' توحید نظری بھی اور توحید عملی بھی۔ توحید عملی یہ ہے کہ بندگی صرف اُسی کی ہے۔ اب اگلی آیت میں ایمان بالرسالت کا بیان آ رہا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا﴾ ''اور اگر تم واقعتاً شک میں ہو اس کلام کے بارے میں

جو ہم نے اتارا اپنے بندے پر (کہ یہ ہمارا نازل کردہ ہے یا نہیں)''

﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ ''تو لے آؤ ایک ہی سورت اِس جیسی۔''

''تعارفِ قرآن'' میں یہ بات تفصیل سے بیان کی گئی تھی کہ قرآن حکیم میں ایسے پانچ مقامات ہیں جہاں پر یہ چیلنج موجود ہے کہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ کلام محمد (ﷺ) کی اختراع ہے تو تم بھی مقابلے میں ایسا ہی کلام پیش کرو۔ سورۃ الطّور کی آیات ۳۳' ۳۴ میں ارشاد ہوا: ''کیا ان کا یہ کہنا ہے کہ اسے محمد (ﷺ) نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں۔ پھر چاہیے کہ وہ اسی طرح کا کوئی کلام پیش کریں اگر وہ سچے ہیں''۔ سورۂ بنی اسراءیل (آیت ۸۸) میں فرمایا گیا کہ ''اگر تمام جن وانس جمع ہو کر بھی اس قرآن جیسی کتاب پیش کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکیں گے' چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں''۔ پھر سورۂ ہود (آیت ۱۳) میں فرمایا گیا کہ ''(اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجیے (اگر پورے قرآن کی نظیر نہیں لا سکتے) تو ایسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ!'' اس کے بعد مزید نیچے اتر کر' جسے بر سبیلِ تنزل کہا جاتا ہے' سورۂ یونس (آیت ۳۸) میں اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر لے آنے کا چیلنج دیا گیا۔ مذکورہ بالا تمام مقامات مکی سورتوں میں ہیں۔ پہلی مدنی سورۃ ''البقرۃ'' کی آیت زیر مطالعہ میں یہی بات بڑے اہتمام کے ساتھ فرمائی گئی کہ اگر تم لوگوں کو اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورت تم بھی موزوں کر کے لے آؤ! یہ ایک سورت سورۃ العصر کے مساوی بھی ہو سکتی تھی' سورۃ الکوثر کے مساوی بھی ہو سکتی تھی۔

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٣﴾﴾ ''اور بلا لو اپنے سارے مددگاروں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔''

قریش کا خیال یہ تھا کہ شعراء کے پاس جن ہوتے ہیں' جو انہیں شعر سکھاتے ہیں' ورنہ عام آدمی تو شعر نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ فرمایا کہ جو بھی تمہارے مددگار ہوں' ایک اللہ کو چھوڑ کر جس کی بھی تم مدد حاصل کر سکتے ہو' جنات ہوں یا انسان ہوں' خطیب ہوں' شعراء ہوں یا ادیب ہوں' ان سب کو جمع کر لو اور اس قرآن جیسی ایک ہی سورت بنا کر لے آؤ' اگر تم سچے ہو۔

قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جھانکنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں گویا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا جا رہا ہے کہ حقیقت میں تمہیں اس قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' یہ تو تم محض بات بنا رہے ہو۔ اگر تمہیں واقعتاً شک ہے' اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو آؤ میدان میں اور اس جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ!

آیت ۲۴ ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ ''پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو' اور ہرگز نہ کر سکو گے!''

ذرا انداز دیکھئے' کیسا تحدی اور چیلنج کا ہے! اور یہ چیلنج اللہ کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ انداز دنیا کی کسی کتاب کا نہیں ہے' یہ دعویٰ صرف قرآن کا ہے۔ کیسا دوٹوک انداز ہے: ''پھر اگر تم نہ کر پاؤ' اور تم ہرگز نہیں کر پاؤ گے۔''

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ ''تو پھر بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔''

جہنم کے ایندھن کے طور پر پتھروں کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اس کے دو امکانات ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کو معلوم ہے پتھر کے کوئلے کی آگ عام لکڑی کے کوئلے کے مقابلے میں بڑی سخت ہوتی ہے۔ لہٰذا جہنم کی آگ بہت بڑے بڑے پتھروں سے دہکائی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ مشرکین نے جو معبود تراش رکھے تھے وہ پتھر کے ہوتے تھے۔ مشرکین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے ساتھ تمہارے ان معبودوں کو بھی جہنم میں جھونکا جائے گا تاکہ تمہاری حسرت کے اندر اضافہ ہو کہ یہ ہیں وہ معبودانِ باطل جن سے ہم دعائیں مانگا کرتے تھے' جن کے سامنے ماتھے ٹیکتے تھے' جن کے سامنے ڈنڈوت کرتے تھے' جن کو چڑھاوے چڑھاتے تھے!

﴿اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔''

یہ جہنم منکرینِ حق کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اب یہاں گویا ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے بعد ایمان بالآخرت کا ذکر آ گیا۔

آیت ۲۵ ﴿وَبَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور بشارت دے دیجیے (اے نبیؐ!) ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے''

﴿اَنَّ لَہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ؕ﴾ ''کہ اُن کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی۔''

یہ لفظی ترجمہ ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اس لیے کہ فطری باغ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جس میں ذرا اُونچائی پر درخت لگے ہوئے ہیں اور دامن میں ندی بہہ رہی ہے' جس سے خود بخود آب پاشی ہو رہی ہے اور درختوں کی جڑوں تک پانی پہنچ رہا ہے۔

﴿کُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡہَا مِنۡ ثَمَرَۃٍ رِّزۡقًا ۙ﴾ ''جب بھی انہیں دیا جائے گا وہاں کا کوئی پھل رزق کے طور پر (یعنی کھانے کے لیے)''

﴿قَالُوۡا ہٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ﴾ ''وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی ملتا تھا''

﴿وَاُتُوۡا بِہٖ مُتَشَابِہًا ؕ﴾ ''اور دیے جائیں گے ان کو پھل ایک صورت کے۔''

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جنت میں اہل جنت کی جو ابتدائی دعوت یا ابتدائی ضیافت (نُـزُل) ہو گی اس میں انہیں وہی پھل پیش کیے جائیں گے جو دنیا میں معروف ہیں' مثلاً انار' انگور' سیب' کھجور وغیرہ۔ اہلِ جنت انہیں دیکھ کر کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں جو ہم دنیا میں کھاتے آئے ہیں' لیکن جب انہیں چکھیں گے تو ظاہری مشابہت کے باوجود ذائقے میں زمین و آسمان کا فرق پائیں گے۔ اور ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ اہل جنت کو جنت میں بھی وہی پھل ملتے رہیں گے' لیکن ہر بار اُن کا ذائقہ بدلتا رہے گا۔ ان کی شکل وصورت وہی رہے گی' لیکن ذائقہ وہ نہیں رہے گا۔ لہٰذا یہ دنیا والا معاملہ نہیں ہو گا کہ ایک ہی شے کو کھاتے کھاتے انسان کی طبیعت بھر جاتی ہے۔

﴿وَلَہُمۡ فِیۡہَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ ٭ۙ﴾ ''اور ان کے لیے اُس (جنت) میں نہایت پاکباز بیویاں ہوں گی۔''

﴿وَّہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''اور وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

ان پانچ آیات (۲۱ تا ۲۵) میں ایمانیات ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرۃ کی دعوت آ گئی۔ اب آگے کچھ ضمنی مسائل زیر بحث آئیں گے۔

آیت ۲۶ ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ﴾ ''یقیناً اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ بیان کرے کوئی مثال مچھر کی یا اُس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے۔''

کفارّ کی طرف سے قرآن کے بارے میں کئی اعتراضات اٹھائے جاتے تھے۔ وہ کبھی بھی اُس چیلنج کا مقابلہ تو نہ کر سکے جو قرآن نے انہیں ﴿فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ﴾ کے الفاظ میں دیا تھا' لیکن خواہ مخواہ کے اعتراضات اٹھاتے رہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کسی مصورّ کی تصویر پر اعتراض کرنے والے تو بہت تھے لیکن جب کہا گیا کہ یہ برش لیجیے اور ذرا اس کو ٹھیک کر دیجیے تو سب پیچھے ہٹ گئے۔ قرآن کے مقابلے میں کوئی سورت لانا تو ان کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن اِدھر اُدھر سے اعتراضات کرنے کے لیے ان کی زبانیں کھلتی تھیں۔ اُن میں سے ان کا ایک اعتراض یہاں نقل کیا جا رہا ہے کہ قرآن مجید میں مکھی کی تشبیہہ آئی ہے' یہ تو بہت حقیر سی شے ہے۔ کوئی اعلیٰ متکلمّ اپنے اعلیٰ کلام میں ایسی حقیر چیزوں کا تذکرہ نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں مکڑی جیسی حقیر شے کا بھی ذکر ہے' چنانچہ یہ کوئی اعلیٰ کلام نہیں ہے۔ یہاں اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ دراصل تشبیہہ اور تمثیل کے اندر ممثل لہٗ اور ممثل بہٖ میں مناسبت اور مطابقت ہونی چاہیے۔ یعنی کوئی تمثیل یا تشبیہہ بیان کرنی ہو تو جس شے کے لیے تشبیہہ دی جا رہی ہے اُس سے مطابقت اور مناسبت رکھنے والی شے سے تشبیہہ دی جانی چاہیے۔ کوئی شے اگر بہت حقیر ہے تو اسے کسی عظمت والی شے سے آخر کیسے تشبیہہ دی جائے گی؟ اسے تو کسی حقیر شے ہی سے تشبیہہ دی جائے گی تو تشبیہہ کا اصل مقصد پورا ہو گا۔ چنانچہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی شرم یا عار کی بات نہیں ہے کہ وہ مچھر کی مثال بیان کرے یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے۔ لفظ ''فَوۡقَہَا'' (اس سے اوپر) میں دونوں معنی موجود ہیں۔ یعنی کمتر اور حقیر ہونے میں اس سے بھی بڑھ کر یا یہ کہ اُس سے اوپر کی کوئی شے۔ اس لیے کہ مکھی یا مکڑی بہرحال مچھر سے ذرا بڑی شے ہے۔

﴿فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ﴾ ''تو جو لوگ صاحبِ ایمان ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ یقیناً حق ہے اُن کے ربّ کی طرف سے۔''

﴿وَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ۘ﴾ ''اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کہ کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے؟''

حق کے منکر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں اور اعتراض کر رہے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیا مراد لی ہے؟ اس ضمن میں اگلا جملہ بہت اہم ہے۔

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ﴾ ''گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے اسی کے ذریعے سے بہتوں کو۔''

اِن مثالوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت سوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہدایت اور گمراہی کا دار و مدار انسان کی اپنی داخلی کیفیت (subjective condition) پر ہے۔ آپ کے دل میں خیر ہے' بھلائی ہے' آپ کی نیت طلبِ ہدایت اور طلبِ علم کی ہے تو آپ کو اس قرآن سے ہدایت مل جائے گی' اور اگر دل میں زیغ ہے' کجی ہے' نیت میں ٹیڑھ اور فساد ہے تو اسی کے ذریعے سے اللہ آپ کی گمراہی میں اضافہ کر دے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کسی کو ہدایت دینا اور کسی کو گمراہی میں مبتلا کر دینا الل ٹپ نہیں ہے' کسی قاعدے اور قانون کے بغیر نہیں ہے۔

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾﴾ ''اور نہیں گمراہ کرتا وہ اس کے ذریعے سے مگر صرف سرکش لوگوں کو۔''

اس سے گمراہی میں وہ صرف انہی کو مبتلا کرتا ہے جن میں سرکشی ہے' تعدیّ ہے' تکبر ہے۔ اگلی آیت میں اُن کے اوصاف بیان کر دیے گئے۔

آیت ۲۷ ﴿الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠﴾ ''جو توڑ دیتے ہیں اللہ کے (ساتھ کیے ہوئے) عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد۔''

اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان سب سے بڑا عہد ''عہدِ الست'' ہے' جس کا ذکر سورۃ الاعراف میں آئے گا۔ یہ عہد عالمِ ارواح میں تمام ارواحِ انسانیہ نے کیا تھا' ان میں مَیں بھی تھا' آپ بھی تھے' سب تھے۔ الغرض تمام کے تمام انسان جتنے آج تک دنیا میں آ چکے ہیں اور جو قیامت تک ابھی آنے والے ہیں' اس عہد کے وقت موجود تھے' لیکن صرف ارواح کی شکل میں تھے' جسم موجود نہیں تھے۔ اور یہ بات یاد رکھیے کہ انسان کا روحانی وجود مکمل وجود ہے اور اوّلاً تخلیق اُسی کی ہوئی تھی۔ ''عہدِ الست'' میں تمام بنی آدم سے اللہ تعالیٰ نے دریافت فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟) سب نے ایک ہی جواب دیا: بَلٰی (کیوں نہیں!) تو یہ جو فاسق ہیں' نافرمان ہیں' سرکش ہیں' انہوں نے اس عہد کو توڑا اور اللہ کو اپنا مالک' اپنا خالق اور اپنا حاکم ماننے کی بجائے خود حاکم بن کر بیٹھ گئے اور اس طرح کے دعوے کیے: ﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ ''کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟'' غیر اللہ کی حاکمیت (sovereignty) کو تسلیم کرنا سب سے بڑی بغاوت' سرکشی' فسق اور نافرمانی ہے' خواہ وہ ملوکیت کی صورت میں ہو یا عوامی حاکمیت (popular sovereignty) کی صورت میں۔

﴿وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ ''اور کاٹتے ہیں اُس چیز کو جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے'' اللہ نے صلہ رحمی کا حکم دیا ہے' یہ قطع رحمی کرتے ہیں۔ مال کی طلب میں' اُس کے مال کو ہتھیانے کے لیے بھائی بھائی کو ختم کر دیتا ہے۔ انسان اپنی ذاتی اغراض کے لیے' اپنے تکبر اور تعلّی کی خاطر تمام اخلاقی حدود کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ہماری شریعت کا فلسفہ یہ ہے کہ ہمیں دو طرح کے تعلقات جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک تعلق ہے بندے کا اللہ کے ساتھ۔ اس کا تعلق ''حقوق اللہ'' سے ہے۔ جبکہ ایک تعلق ہے بندوں کا بندوں کے ساتھ۔ یہ ''حقوق العباد'' سے متعلق ہے۔ اللہ کا حق یہ ہے کہ اُسے حاکم اور مالک سمجھو اور خود اُس کے بندے بنو۔ جبکہ انسانوں کا حق یہ ہے کہ: ((كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا)) [۳] ''سب آپس میں بھائی بھائی ہو کر اللہ کے بندے بن جاؤ۔'' اس ضمن میں اہم ترین رحمی رشتہ ہے' یعنی سگے بہن بھائی۔ پھر دادا دادی کی اولاد میں تمام چچا زاد وغیرہ (cousins) آ جائیں گے۔ اس کے اوپر پردادا پردادی کی اولاد کا دائرہ مزید وسیع ہو جائے گا۔ اسی طرح اوپر چلتے جائیں یہاں تک کہ آدم وحوا پر تمام انسان جمع ہو جائیں گے۔ تو رحمی رشتہ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں فاسقین کی دو صفات بیان کر دی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے عہد کو مضبوطی سے باندھنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ انہیں قطع کرتے ہیں۔

﴿وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ ''اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔''

متذکرہ بالا دونوں چیزوں کے نتیجے میں زمین میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ انسان اللہ کی اطاعت سے باغی ہو جائیں یا آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگیں تو اس کا نتیجہ فساد فی الارض کی صورت میں نکلتا ہے۔

﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٢٧﴾﴾ ''یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

یہی لوگ ہیں جو بالآخر آخری اور دائمی خسارے میں رہنے والے ہیں۔

آیت ۲۸ ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ﴾ ''تم کیسے کفر کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے' پھر اُس نے تمہیں زندہ کیا۔''

﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾﴾ ''پھر وہ تمہیں مارے گا' پھر جلائے گا' پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔''

اس مقام پر ایک بڑی گہری حکمت اور فلسفے کی بات بیان کی گئی ہے جو آج نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ ہم دنیا میں آنے سے پہلے مردہ تھے (كُنْتُمْ اَمْوَاتًا)۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

یہ مضمون سورۂ غافر (سورۃ المؤمن) میں زیادہ وضاحت سے آیا ہے' جو سورۃ البقرۃ سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ لہٰذا یہاں اجمالی تذکرہ ہے۔ وہاں اہل جہنم کا قول بایں الفاظ نقل ہوا ہے: ﴿رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿١١﴾﴾ ''اے ہمارے ربّ! تو نے دو مرتبہ ہم پر موت وارد کی اور دو مرتبہ ہمیں زندہ کیا' اب ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے' تو اب یہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟'' اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ انسان کی تخلیق اوّل عالمِ ارواح میں صرف ارواح کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ احادیث میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ))

[متفق علیہ] یعنی ارواح جمع شدہ لشکروں کی صورت میں تھیں۔ ان ارواح سے وہ عہد لیا گیا جو ''عہدِ الست'' کہلاتا ہے۔ پھر انہیں سلا دیا گیا۔ یہ گویا پہلی موت تھی جو ہم گزار آئے ہیں۔ (آپ جانتے ہیں کہ مُردہ معدوم نہیں ہوتا' بے جان ہوتا ہے' ایک طرح سے سویا ہوا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں موت اور نیند کو باہم تشبیہہ دی گئی ہے۔) پھر دنیا میں عالمِ خلق کا مرحلہ آیا' جس میں تناسل کے ذریعے سے اجسادِ انسانیہ کی تخلیق ہوتی ہے اور اُن میں ارواح پھونکی جاتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے مروی متفق علیہ حدیث کے مطابق رحمِ مادر میں جنین جب چار ماہ کا ہو جاتا ہے تو اُس میں وہ روح لا کر پھونک دی جاتی ہے۔ یہ گویا پہلی مرتبہ کا زندہ کیا جانا ہو گیا۔ ہم اِس دنیا میں اپنے جسد کے ساتھ زندہ ہو گئے' ہمیں پہلی موت کی نیند سے جگا دیا گیا۔ اب ہمیں جو موت آئے گی وہ ہماری دوسری موت ہو گی اور اس کے نتیجے میں ہمارا جسد وہیں چلا جائے گا جہاں سے آیا تھا (یعنی مٹی میں) اور ہماری روح بھی جہاں سے آئی تھی وہیں واپس چلی جائے گی۔ یہ فلسفہ و حکمتِ قرآنی کا بہت گہرا نکتہ ہے۔

آیت ۲۹ ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ق﴾ ''وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے۔''

اس آیت میں خلافت کا مضمون شروع ہو گیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ((اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَۃِ))(٤) ''یہ دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے بنائے گئے ہو۔'' اگلی آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلافتِ ارضی کا ذکر ہے۔ گویا زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا گیا ہے وہ انسان کی خلافت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط﴾ ''پھر وہ متوجہ ہوا آسمانوں کی طرف اور انہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمانوں کی شکل میں بنا دیا۔''

یہ آیت تا حال آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔ سات آسمانوں کی کیا حقیقت ہے' ہم ابھی تک پورے طور پر اس سے واقف نہیں ہیں۔

﴿وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

اُسے ہر شے کا علمِ حقیقی حاصل ہے۔

آیات ۳۰ تا ۳۹

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ ج وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ط قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ لا فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ج فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ لا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لا وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ ز وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ وَکُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا کَانَا فِیْهِ ص وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ط اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ج فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾

آیت ۳۰ ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط﴾ ''اور یاد کرو جب کہ کہا تھا تمہارے ربّ نے فرشتوں سے کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ۔''

خلیفہ درحقیقت نائب کو کہتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کو مغالطہ لاحق ہوتا ہے کہ خلیفہ اور جانشین کسی کی موت کے بعد مقرر ہوتا ہے' زندگی میں نہیں ہوتا۔ لیکن اس دنیا میں انسان کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے وائسرائے کا تصور ذہن میں رکھیے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہم انگریز کے غلام تھے۔ ہمارا اصل حاکم (بادشاہ یا ملکہ) انگلستان میں تھا' جبکہ دہلی میں وائسرائے ہوتا تھا۔ وائسرائے کا کام یہ تھا کہ His Majesty یا Her Majesty کی حکومت کا جو بھی حکم موصول ہوا سے بلاچون و چرا بغیر کسی تغیر اور تبدل کے نافذ کرے۔ البتہ وائسرائے کو اختیار حاصل تھا کہ اگر کسی معاملے میں انگلستان سے حکم نہ آئے تو وہ یہاں کے حالات کے مطابق اپنی بہترین رائے قائم کرے۔ وہ غور و فکر کرے کہ یہاں کی مصلحتیں کیا ہیں اور جو چیز بھی سلطنت کی مصلحت میں ہو اُس کے مطابق فیصلہ کرے۔ بعینہٖ یہی رشتہ کائنات کے اصل حاکم اور زمین پر اُس کے خلیفہ کے مابین ہے۔ کائنات کا اصل حاکم اور مالک اللہ تعالیٰ ہے' لیکن اُس نے اپنے آپ کو غیب کے پردے میں چھپا لیا ہے۔ زمین پر انسان اس کا خلیفہ ہے۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ جو ہدایت اللہ کی طرف سے آ رہی ہے اس پر تو بے چون و چرا عمل کرے اور جس معاملے میں کوئی واضح ہدایت نہیں ہے وہاں غور و فکر اور سوچ بچار کرے اور استنباط و اجتہاد سے کام لیتے ہوئے جو بات روحِ دین سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھنے والی ہو اسے اختیار کرے۔ یہی درحقیقت رشتۂ خلافت ہے جو اللہ اور انسان کے مابین ہے۔

یہ حیثیت تمام انسانوں کو دی گئی ہے اور بالقوۃ (potentially) ہر انسان اللہ کا خلیفہ ہے' لیکن جو اللہ کا باغی ہو جائے' جو خود حاکمیت کا مدعی ہو جائے تو وہ اس خلافت کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر کسی بادشاہ کا ولی عہد اپنے باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کر دے اور حکومت حاصل کرنا چاہے تو اب وہ واجب القتل ہے۔ اسی طرح جو لوگ بھی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی

اکمیتِ اعلیٰ کے منکر ہو کر خود حاکمیت کے مدعی ہو گئے اگرچہ وہ واجب القتل ہیں‘ لیکن دنیا میں انہیں مہلت دی گئی ہے۔اس لیے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ انہیں فوراً ختم نہیں کرتا۔ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ط﴾ (الشوریٰ:١٤) ’’اور اگر ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی ایک وقتِ معین تک تمہارے ربّ کی طرف سے تو ان کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا‘‘۔چونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک وقتِ معین تک کے لیے مہلت دی ہے لہٰذا انہیں فوری طور پر ختم نہیں کیا جاتا‘ لیکن کم از کم اتنی سزا ضرور ملتی ہے کہ اب وہ خلافت کے حق سے محروم کر دیے گئے ہیں۔گویا کہ اب دنیا میں خلافت صرف خلافت المسلمین ہو گی۔صرف وہ شخص جو اللہ کو اپنا حاکمِ مطلق مانے‘ وہی خلافت کا اہل ہے۔تو یہ چند باتیں خلافت کی اصل حقیقت کے ضمن میں یہیں پر سمجھ لیجیے۔﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ط﴾ ’’اور یاد کرو جب تمہارے ربّ نے کہا تھا فرشتوں سے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔‘‘

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج﴾ ’’انہوں نے کہا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا؟‘‘

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط﴾ ’’اور ہم آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔‘‘

﴿قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٠﴾﴾ ’’فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔‘‘

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو انسان کے بارے میں یہ گمان یا یہ خیال کیسے ہوا؟ اس کے ضمن میں دو آراء ہیں۔ایک تو یہ کہ انسان کی تخلیق سے پہلے اس زمین پر جنات موجود تھے اور انہیں بھی اللہ نے کچھ تھوڑا سا اختیار دیا تھا اور انہوں نے یہاں فساد برپا کر رکھا تھا۔ان ہی پر قیاس کرتے ہوئے فرشتوں نے سمجھا کہ انسان بھی زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا۔ایک دوسری اُصولی بات یہ کہی گئی ہے کہ جب خلافت کا لفظ استعمال ہوا تو فرشتے سمجھ گئے کہ انسان کو زمین میں کوئی نہ کوئی اختیار بھی ملے گا۔جنات کے بارے میں خلافت کا لفظ کہیں نہیں آیا‘ یہ صرف انسان کے بارے میں آ رہا ہے۔اور خلیفہ بالکل بے اختیار نہیں ہوتا۔جیسا کہ میں نے عرض کیا جہاں واضح حکم ہے اس کا کام اس کی تنفیذ ہے اور جہاں نہیں ہے وہاں اپنے غور و فکر اور سوچ بچار کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسے بہتر سے بہتر رائے قائم کرنا ہوتی ہے۔ظاہر بات ہے جہاں اختیار ہو گا وہاں اس کے صحیح استعمال کا بھی امکان ہے اور غلط کا بھی۔پولیٹیکل سائنس کا تو یہ مسلمہ اصول (axiom) ہے :

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

چنانچہ اختیار کے اندر بدعنوانی کا رُجحان موجود ہے۔اس بنا پر انہوں نے قیاس کیا کہ انسان کو زمین میں اختیار ملے گا تو یہاں فساد ہو گا‘ خون ریزی ہو گی۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنی حکمتوں سے مَیں خود واقف ہوں۔میں انسان کو خلیفہ کیوں بنا رہا ہوں‘ یہ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

آیت ۳۱ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ’’اور اللہ نے سکھا دیے آدم کو تمام کے تمام نام‘‘

مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ اس سے مراد تمام اشیاء کے نام ہیں اور تمام اشیاء کے ناموں سے مراد اُن کی حقیقت کا علم ہے۔آپ انسانی علم (Human Knowledge) کا تجزیہ کریں تو وہ یہی ہے کہ انسان ایک چیز کو پہچانتا ہے‘ پھر اس کا ایک نام رکھتا ہے یا اس کے لیے کوئی اصطلاح (term) قائم کرتا ہے۔وہ اُس نام اور اُس اصطلاح کے حوالے سے اُس چیز کے بارے میں بہت سے حقائق کو اپنے ذہن میں محفوظ کرتا ہے۔تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام نام سکھا دیے۔گویا کل مادّی کائنات کے اندر جو کچھ وجود میں آنے والا تھا‘ ان سب کی حقیقت سے حضرت آدم علیہ السلام کو امکانی طور پر (potentially) آگاہ کر دیا۔یہ انسان کا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) ہے جو اسے سمع و بصر اور عقل و دماغ سے حاصل ہوتا ہے۔

انسان کو حاصل ہونے والے علم کے دو حصے ہیں۔ایک الہامی علم (Revealed Knowledge) ہے جو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے بھیجتا ہے‘ جبکہ ایک علم بالحواس یا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) ہے جو انسان خود حاصل کرتا ہے۔اُس نے آنکھوں سے دیکھا‘ کانوں سے سنا‘ نتیجہ نکالا اور دماغ کے کمپیوٹر نے اُس کو پراسیس کر کے اُس نتیجے کو کہیں حافظے (memory) کے اندر محفوظ کر لیا۔پھر کچھ اور دیکھا‘ کچھ اور سنا‘ کچھ چھو کر‘ کچھ چکھ کر‘ کچھ سونگھ کر معلوم ہوا اور کچھ اور نتیجہ نکالا تو اسے سابقہ یادداشت کے ساتھ tally کر کے نتیجہ نکالا۔ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿٣٦﴾﴾ (بنی اسراءیل) انسان کو یہ اکتسابی علم (Acquired Knowledge) تین چیزوں سے حاصل ہو رہا ہے: سماعت‘ بصارت اور عقل۔عقل اُس تمام sense data کو جو اسے مہیا ہوتا ہے‘ حواس (sense organs) کے ذریعے سے پراسیس کرتی ہے اور فائدہ اخذ کرتی ہے۔یہ علم ہے جو بالقوۃ (potentially) حضرت آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا۔اب اس کی exfoliation ہو رہی ہے اور درجہ بدرجہ وہ علم پھیل رہا ہے‘ بڑھ رہا ہے۔بڑھتے بڑھتے یہ کہاں تک پہنچے گا‘ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے! اس نصف صدی میں علم انسانی میں جو explosion ہوا ہے میں اور آپ اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔اکثر بڑے بڑے سائنس دانوں کو بھی اس کا ادراک وشعور نہیں ہے کہ انسانی علم نے کتنی بڑی زقند لگائی ہے۔اس لیے کہ ایک شخص اپنی لائن کے بارے میں تو جانتا ہے کہ اس میں کیا کچھ ہو گیا۔مثلاً ایک سائنس دان صرف فزکس یا اس کی بھی کسی شاخ کے بارے میں جانتا ہے‘ باقی دوسری شاخوں کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔یہ دَورِ سپیشلائزیشن کا دَور ہے‘ لہٰذا علم کے میدان میں جو بڑا دھماکہ (explosion) ہوا ہے اس کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ایک چیز جو آج ایجاد ہوتی ہے چند دنوں کے اندر اندر اُس کا نیا version آ جاتا ہے اور یہ چیز متروک (outdated) ہو جاتی ہے۔ابلاغ اور مواصلات (communications) کے اندر انقلابِ عظیم برپا ہوا ہے۔آپ یہ سمجھیے کہ اقبال نے جو یہ شعر کبھی کہا تھا‘ اس کی تعبیر قریب سے قریب تر آ رہی ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے!

اور یہ ''مہ کامل'' اُس وقت بنے گا جب دجّال کی شکل اختیار کرے گا۔ دجّال وہ شخص ہو گا جو ان تمام قواعدِ طبیعیہ (Physical Laws) کے اوپر قابو پا لے گا۔ جب چاہے گا' جہاں چاہے گا بارش برسائے گا۔ وہ رزق کے تمام خزانے اپنے ہاتھ میں لے لے گا اور اعلان کر دے گا کہ جو اُس پر ایمان لائے گا اُسی کو رزق ملے گا' کسی اور کو نہیں ملے گا۔ اُس کی آواز پوری دنیا میں سنائی دے گی۔ وہ چند دنوں کے اندر پوری دنیا کا چکر لگا لے گا۔ یہ ساری باتیں حدیث میں دجال کے بارے میں آئی ہیں۔ وہ آدم کے اس اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کی اس حد کو پہنچ جائے گا کہ فطرت کے تمام اسرار (mysteries) اس پر منکشف ہو جائیں اور اسے قواعدِ طبیعیہ پر تصرف حاصل ہو جائے' وہ انہیں harness کر لے' قابو میں لے آئے اور انہیں استعمال کرے۔

انسان نے جو سب سے پہلا ذریعہ توانائی (source of energy) دریافت کیا وہ آگ تھا۔ آج سے ہزاروں سال پہلے ہمارے کسی جدّامجد نے دیکھا کہ کوئی چٹان اوپر سے گری' پتھر سے پتھر ٹکرایا تو اس میں سے آگ کا شعلہ نکلا۔ اُس کا یہ مشاہدہ آگ پیدا کرنے کے لیے کافی ہو گیا کہ پتھروں کو آپس میں ٹکراؤ اور آگ پیدا کر لو۔ چنانچہ آگ اُس دَور کی سب سے بڑی ایجاد اور اوّلین ذریعہ توانائی تھی۔ اب وہ توانائی (energy) کہاں سے کہاں پہنچی! پہلے اُس آگ نے بھاپ کی شکل اختیار کی' پھر ہم نے بجلی ایجاد کی اور اب ایٹمی توانائی (Atomic Energy) حاصل کر لی ہے اور ابھی نہ معلوم اور کیا کیا حاصل ہونا ہے۔ واللہ اعلم! ان تمام چیزوں کا تعلق خلافت ارضی کے ساتھ ہے۔ لہٰذا فرشتوں کو بتایا گیا کہ آدم کو صرف اختیار ہی نہیں' علم بھی دیا جا رہا ہے۔

﴿ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ ۙ﴾ ''پھر اُن (تمام اشیاء) کو پیش کیا فرشتوں کے سامنے''

﴿فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾﴾ ''اور فرمایا کہ بتاؤ مجھے ان چیزوں کے نام اگر تم سچے ہو۔''

اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے زمین کا انتظام بگڑ جائے گا۔

آیت ۳۲ ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَکَ﴾ ''انہوں نے کہا (پروردگار!) نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے''

آپ ہر نقص سے' ہر عیب سے' ہر ضعف سے' ہر احتیاج سے مبرا اور منزہ ہیں' اعلیٰ و ارفع ہیں۔

﴿لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ﴾ ''ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اُس کے جو آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔''

اس کی یہی تعبیر بہتر معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کائناتی حکومت میں ملائکہ کی حیثیت درحقیقت اس کے کارندوں (یا civil servants) کی ہے۔ چنانچہ ہر ایک کو صرف اس کے شعبے کے مطابق علم دیا گیا ہے' ان کا علم جامع نہیں ہے اور ان کے پاس تمام چیزوں کا مجموعی علم حاصل کرنے کی استعداد نہیں ہے۔ مثلاً کوئی فرشتہ بارش کے انتظام پر مامور ہے' کوئی پہاڑوں پر مامور ہے' جس کا ذکر سیرت میں آتا ہے کہ جب طائف میں رسول اللہ ﷺ پر پتھراؤ ہوا تو اس کے بعد ایک فرشتہ حاضر ہوا کہ میں مَلَکُ الجبال ہوں' اللہ نے مجھے پہاڑوں پر مامور کیا ہوا ہے' اگر آپ فرمائیں تو میں اِن دو پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دوں جن کے درمیان طائف کی یہ وادی واقع ہے اور اس طرح اہل طائف پس کر سُرمہ بن جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے۔ تو فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف خدمات پر مامور ہیں اور ان کو جو علم دیا گیا ہے وہ صرف اُن کے اپنے فرائض منصبی اور اُن کے اپنے اپنے شعبے سے متعلق دیا گیا ہے' جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کو علم کی جامعیت بالقوۃ (potentially) دے دی گئی' جو بڑھتے بڑھتے اب ایک بہت تناور درخت بن چکا ہے۔

﴿اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ﴿۳۲﴾﴾ ''یقیناً آپ ہی ہیں جو سب کچھ جاننے والے کامل حکمت والے ہیں۔''

آپ ہی کی ذات ہے جو کُل کے کُل علم کی مالک ہے اور جس کی حکمت بھی کامل ہے۔ باقی تو مخلوق میں سے ہر ایک کا علم ناقص ہے۔

آیت ۳۳ ﴿قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ ۚ﴾ ''اللہ نے فرمایا کہ اے آدم' ان کو بتاؤ ان چیزوں کے نام!''

﴿فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ ۙ﴾ ''تو جب اُس نے بتا دیے ان کو اُن سب کے نام''

﴿قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّـکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ﴾ ''تو (اللہ نے) فرمایا: کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی ہوئی چیزوں کو''

جو تمہاری نگاہوں سے اوجھل اور مخفی ہیں۔

﴿وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کر رہے تھے اور جو کچھ تم چھپا رہے تھے۔''

ان الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ فرشتوں کی خواہش یہ تھی کہ خلافت ہمیں ملے' ہم خدامِ ادب ہیں' ہر وقت تسبیح و تحمید اور تقدیس میں مصروف ہیں' جو حکم ملتا ہے بجا لاتے ہیں' تو یہ خلافت کسی اور مخلوق کو کیوں دی جا رہی ہے۔

اب آگے چونکہ تیسری مخلوق کا ذکر بھی آئے گا لہٰذا یہاں نوٹ کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی تین مخلوقات ایسی ہیں جو صاحب تشخص اور صاحبِ شعور ہیں اور جن میں ''اَنَا'' (میں) کا شعور ہے۔ ایک ملائکہ ہیں' ان کی تخلیق نور سے ہوئی ہے۔ دوسرے انسان ہیں' جن کی تخلیق گارے سے ہوئی ہے اور تیسرے جنات ہیں' جن کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ باقی حیوانات ہیں' اُن میں شعور (consciousness) تو ہے' خود شعوری (self consciousness) نہیں ہے۔ انسان جب دیکھتا ہے تو اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں' جبکہ کتا یا بلا دیکھتا ہے تو اسے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ میں دیکھ رہا ہوں۔ حیوانات میں ''میں'' کا شعور نہیں ہے۔ یہ اَنَا 'Self یا Ego' صرف فرشتوں میں' انسان میں اور جنات میں ہے۔ ان میں سے ایک نوری مخلوق ہے' ایک ناری مخلوق ہے اور ایک خاکی ہے' جو زمین کے اس قشر (crust) میں

مٹی اور پانی کے ملغوبے یعنی گارے سے وجود میں آئی ہے۔

آیت ۳۴ ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے سوائے ابلیس کے۔''

یہاں ایک بات تو یہ سمجھئے کہ آدمؑ کو تمام ملائکہ کے سجدے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا یہ صرف تعظیماً تھا؟ اور اگر تعظیماً تھا تو کیا آدم خاکی کی تعظیم مقصود تھی یا کسی اور شے کی تعظیم تھی؟ مکی سورتوں میں یہ بات دو جگہ بایں الفاظ واضح کی گئی ہے: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝﴾ (الحجر:۲۹ و صٓ:۷۲) ''پھر جب میں اس (آدم) کی تخلیق مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب گر پڑنا اُس کے سامنے سجدے میں''۔ چنانچہ تعظیم اگر ہے تو آدمِ خاکی کی نہیں ہے‘ اس کے اندر موجود ''روحِ ربّانی'' کی ہے‘ جو ایک Divine Element یا Divine Spark ہے‘ جسے خود خالق نے ''مِنْ رُّوْحِيْ'' سے تعبیر فرمایا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سجدے کی حکمت کیا ہے؟ اس کی علت اور غرض و غایت کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ اس کائنات یعنی اس آفاقی حکومت کے کارندے تو فرشتے ہیں اور خلیفہ بنایا جا رہا ہے انسان کو۔ لہٰذا جب تک یہ ساری سول سروس اس کے تابع نہ ہو وہ خلافت کیسے کرے گا! جب ہم کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں اور کوئی فعل کرنا چاہتے ہیں تو اس فعل کے پورا ہونے میں‘ اُس کے ظہور پذیر ہونے میں نمعلوم کون کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور فطرت کی کون کون سی قوتیں (forces) ہمارے ساتھ موافقت کرتی ہیں تو ہم وہ کام کر سکتے ہیں‘ اور ان سب پر فرشتے مامور ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اقلیم (domain) ہے۔ اگر وہ انسان کے تابع نہ ہوں تو خلافت کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ اسے خلافت دی گئی ہے‘ یہ جدھر جانا چاہتا ہے جانے دو‘ یہ نماز کے لیے مسجد میں جانا چاہتا ہے جانے دو‘ یہ چوری کے لیے نکلا ہے نکلنے دو۔ انسان کو جو اختیار دیا گیا ہے اس کے استعمال میں یہ تمام قوتیں اس کے ساتھ موافقت کرتی ہیں تب ہی اُس کا کوئی ارادہ‘ خواہ اچھا ہو یا برا‘ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ اس موافقت کی علامت کے طور پر تمام فرشتوں کو انسان کے آگے جھکا دیا گیا۔

اس آیت میں ''اِلَّآ اِبْلِيْسَ'' (سوائے ابلیس کے) سے یہ مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید ابلیس بھی فرشتہ تھا۔ اس لیے کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو دیا گیا تھا۔ اس مغالطے کا ازالہ سورۃ الکہف میں کر دیا گیا جو سورۃ البقرۃ سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی۔ وہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ﴾ (آیت ۵۰) ''وہ جنوں میں سے تھا‘ پس اس نے سرکشی کی اپنے ربّ کے حکم سے''۔ فرشتوں میں سے ہوتا تو نافرمانی کر ہی نہ سکتا۔ فرشتوں کی شان تو یہ ہے کہ وہ اللہ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ (التحریم) ''وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اُسے بجا لاتے ہیں''۔ جنات بھی انسانوں کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہے جسے ایمان و کفر اور طاعت و معصیت دونوں کی قدرت بخشی گئی ہے۔ چنانچہ جنات میں نیک بھی ہیں بد بھی ہیں‘ اعلیٰ بھی ہیں ادنیٰ بھی ہیں‘ جیسے انسانوں میں ہیں۔ لیکن یہ ''عزازیل'' جو جن تھا‘ علم اور عبادت دونوں کے اعتبار سے بہت بلند ہو گیا تھا اور فرشتوں کا ہم نشین تھا۔ یہ فرشتوں کے ساتھ اس طور پر شامل تھا جیسے بہت سے انسان بھی اگر اپنی بندگی میں‘ زُہد میں‘ نیکی میں ترقی کریں تو اُن کا عالمِ ارواح کے ساتھ‘ عالمِ ملائکہ کے ساتھ اور ملاءِ اعلیٰ کے ساتھ ایک رابطہ قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح عزازیل بھی جن ہونے کے باوجود اپنی نیکی‘ عبادت‘ پارسائی اور اپنے علم میں فرشتوں سے بہت آگے تھا‘ اس لیے ''مُعَلِّمُ الْمَلَكُوْت'' کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اسے اپنی اس حیثیت کا بڑا زعم تھا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا‘ قرآن حکیم میں قصہ آدم و ابلیس کے ضمن میں یہ بات سات مرتبہ آئی ہے کہ فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کرو‘ سب جھک گئے مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کر دیا۔ آیات زیر مطالعہ میں قصہ آدم و ابلیس ساتویں مرتبہ آ رہا ہے۔ اگرچہ مصحف میں یہ پہلی مرتبہ آ رہا ہے لیکن ترتیب نزولی کے اعتبار سے یہاں ساتویں مرتبہ آ رہا ہے۔ آدم و ابلیس کا یہ قصہ سورۃ البقرۃ کے بعد سورۃ الاعراف میں‘ پھر سورۃ الحجر میں‘ پھر سورۂ بنی اسرائیل میں‘ پھر سورۃ الکہف میں‘ پھر سورۂ طٰہٰ میں اور پھر سورۂ صٓ میں آئے گا۔ یعنی یہ قصہ قرآن حکیم میں چھ مرتبہ مکی سورتوں میں آیا ہے اور ایک مرتبہ مدنی سورت سورۃ البقرۃ میں۔

ابلیس کا اصل نام ''عزازیل'' تھا‘ ابلیس اب اس کا صفاتی نام ہے۔ اس لیے کہ اَبْلَسَ‘ يُبْلِسُ کے معنی ہوتے ہیں مایوس ہو جانا۔ یہ اللہ کی رحمت سے بالکل مایوس ہے اور جو اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائے وہ شیطان ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اب میرا تو چھٹکارا نہیں ہے‘ میری تو عاقبت خراب ہو ہی چکی ہے‘ لہٰذا میں اپنے ساتھ اور جتنوں کو برباد کر سکتا ہوں کرلوں۔ ع ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے!'' اب وہ شیطان اس معنی میں ہے کہ انسان کی عداوت اس کی گھٹی میں پڑ گئی۔ اُس نے اللہ سے اجازت بھی لے لی کہ مجھے مہلت دے دے قیامت کے دن تک کے لیے ﴿اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ تو میں ثابت کر دوں گا کہ یہ آدم اُس رُتبے کا حق دار نہ تھا جو اسے دیا گیا۔

﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ﴾ ''اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا۔''

قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر اس کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝﴾ (الاعراف:۱۲ و صٓ:۷۶) ''میں اس سے بہتر ہوں‘ تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے گارے سے بنایا''۔ درحقیقت یہی وہ تکبر ہے جس نے اسے راندۂ درگاہِ حق کر دیا ؎

تکبر عزازیل را خوار کرد   کہ در طوقِ لعنت گرفتار کرد

﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴﴾ ''اور ہو گیا وہ کافروں میں سے''۔ یا ''اور تھا وہ کافروں میں سے۔''

كَانَ عربی زبان میں دو طرح کا ہوتا ہے: ''تامّہ'' اور ''ناقصہ''۔ كَانَ ناقصہ کے اعتبار سے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اپنے اس استکبار اور انکار کی وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ جبکہ كَانَ تامّہ کے اعتبار سے یہ معنی ہوں گے کہ وہ تھا ہی کافروں میں سے۔ یعنی اس کے اندر سرکشی چھپی ہوئی تھی‘ اب ظاہر ہو گئی۔ ایسا معاملہ کبھی ہمارے مشاہدے میں بھی آتا ہے کہ کسی شخص کی بدنیتی پر نیکی اور زُہد کے پردے پڑے رہتے ہیں اور کسی خاص وقت میں آ کر وہ ننگا ہو جاتا ہے اور اس کی باطنی حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔

آیت ۳۵ ﴿وَقُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُکَ الۡجَنَّۃَ﴾ ''اور ہم نے کہا اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جنت کون سی ہے؟ اکثر حضرات کے نزدیک یہ جنت کہیں آسمان ہی میں تھی اور آسمان ہی میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ البتہ یہ سب مانتے ہیں کہ یہ وہ جنت الفردوس نہیں تھی جس میں جانے کے بعد نکلنے کا کوئی سوال نہیں۔ اس جنت میں تو آخرت میں لوگوں کو جا کر داخل ہونا ہے اور اس میں داخلے کے بعد پھر وہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے' اور میرا رُجحان اسی رائے کی طرف ہے' کہ تخلیق آدمؑ اسی زمین پر ہوئی ہے۔ وہ تخلیق جن مراحل سے گزری وہ اِس وقت ہمارا موضوعِ بحث نہیں ہے۔ بائیولوجی اور وحی دونوں اس پر متفق ہیں کہ قشرِ ارض (Crust of the Earth) یعنی مٹی سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس کے بعد کسی اونچے مقام پر کسی سرسبز و شاداب علاقے میں حضرت آدمؑ کو رکھا گیا' جہاں ہر قسم کے میوے تھے' ہر شے بافراغت میسر تھی۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِیۡہَا وَلَا تَعۡرٰی ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّکَ لَا تَظۡمَؤُا فِیۡہَا وَلَا تَضۡحٰی ﴿۱۱۹﴾﴾ (طٰہٰ) ''یہاں تمہارے لیے یہ آسائشیں موجود ہیں کہ نہ تمہیں اس میں بھوک لگے گی نہ عریانی لاحق ہوگی۔ اور یہ کہ نہ تمہیں اس میں پیاس تنگ کرے گی نہ دھوپ ستائے گی''۔ حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کو وہاں ہر طرح کی آسائشیں حاصل تھیں۔ البتہ یہ جنت صرف ایک demonstration کے لیے تھی کہ انہیں نظر آ جائے کہ شیطان ان کا اور اُن کی اولاد کا ازلی دشمن ہے' وہ انہیں ورغلائے گا اور طرح طرح سے وسوسہ اندازی کرے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کسی شخص کا انتخاب تو ہو گیا اور وہ CSP cadre میں آ گیا' لیکن اس کی تعیناتی (posting) سے پہلے اسے سول سروس اکیڈمی میں زیر تربیت رکھا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں جو لفظ ھبوط (اُترنا) آ رہا ہے وہ صرف اسی ایک معنی میں نہیں آتا' اس کے دوسرے معانی بھی ہیں۔ یہ چیزیں پھر متشابہات میں سے رہیں گی۔ اس لیے ان کے بارے میں غور و فکر سے کوئی ایک یا دوسری رائے اختیار کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم!

﴿وَکُلَا مِنۡہَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا ۪﴾ ''اور کھاؤ اس میں سے بافراغت جہاں سے چاہو۔''

یہاں ہر طرح کے پھل موجود ہیں' جو چاہو بلا روک ٹوک کھاؤ۔

﴿وَلَا تَقۡرَبَا ہٰذِہِ الشَّجَرَۃَ﴾ ''مگر اس درخت کے قریب مت جانا۔''

یہاں پر اس درخت کا نام نہیں لیا گیا' اشارہ کر دیا گیا کہ اس درخت کے قریب بھی مت جانا۔

﴿فَتَکُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔''

تم حد سے گزرنے والوں میں شمار ہو گے۔

اب اس کی بھی حکمت سمجھئے کہ یہ اس demonstration کا حصہ ہے کہ دنیا میں کھانے پینے کی ہزاروں چیزیں مباح ہیں' صرف چند چیزیں حرام ہیں۔ اب اگر تم ہزاروں مباح چیزوں کو چھوڑ کر حرام میں منہ مارتے ہو تو یہ نافرمانی شمار ہو گی۔ اللہ نے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے۔ چند رشتے ہیں جو بیان کر دیے گئے کہ یہ حرام ہیں' محرماتِ ابدیہ ہیں' ان سے تو شادی نہیں ہو سکتی' باقی ایک مسلمان مرد کسی مسلمان عورت سے دنیا کے کسی بھی کونے میں شادی کر سکتا ہے' اس کے لیے کروڑوں options کھلے ہیں۔ پھر ایک نہیں' دو دو' تین تین' چار چار تک عورتوں سے شادی کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے باوجود انسان شادی نہ کرے اور زنا کرے' تو یہ گویا اس کی اپنی خباثتِ نفس ہے۔ چنانچہ آدم و حوا (علیہما السلام) کو بتا دیا گیا کہ یہ پورا باغ تمہارے لیے مباح ہے' بس یہ ایک درخت ہے' اس کے پاس نہ جانا۔ درخت کا نام لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ تو صرف ایک آزمائش اور اس کی demonstration تھی۔

آیت ۳۶ ﴿فَاَزَلَّہُمَا الشَّیۡطٰنُ عَنۡہَا﴾ ''پھر پھسلا دیا اُن دونوں کو شیطان نے اُس درخت کے بارے میں''

اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں آئی ہے کہ شیطان نے انہیں کس کس طریقے سے پھسلایا اور انہیں اس درخت کا پھل چکھنے پر آمادہ کیا۔

﴿فَاَخۡرَجَہُمَا مِمَّا کَانَا فِیۡہِ ۪﴾ ''تو نکلوا دیا ان دونوں کو اُس کیفیت میں سے جس میں وہ تھے۔''

وہ کیا کیفیت تھی کہ نہ کوئی مشقت ہے' نہ کوئی محنت ہے اور انسان کو ہر طرح کا اچھے سے اچھا پھل مل رہا ہے' تمام ضروریات فراہم ہیں اور خاص خلعت فاخرہ سے بھی نوازا گیا ہے' جنت کا خاص لباس عطا کیا گیا ہے۔ لیکن ان کیفیات سے نکال کر انہیں کہا گیا کہ اچھا اب جاؤ اور زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرو۔ یاد رکھنا کہ شیطان تمہارا اور تمہاری نسل کا دشمن ہے اور وہ تمہیں پھسلائے گا جیسے آج پھسلایا ہے' تم اس کی شرارتوں سے ہوشیار رہنا: ﴿اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لَکُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡہُ عَدُوًّا ؕ﴾ (فاطر:٦) ''یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے' اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو''۔ لیکن اگر کچھ لوگ اسے اپنا دوست بنا لیں اور اس کے ایجنٹ اور کارندے بن جائیں تو یہ اُن کا اختیار ہے جس کی سزا انہیں ملے گی۔

﴿وَقُلۡنَا اہۡبِطُوۡا بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ﴾ ''اور ہم نے کہا تم سب اترو' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔''

نوٹ کیجیے یہاں جمع کا صیغہ آیا ہے کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ تو ایک دشمنی تو شیطان اور آدم اور ذریتِ آدم کی ہے' جبکہ ایک اور دشمنی انسانوں میں مرد اور عورت کے مابین ہے۔ عورت مرد کو پھسلاتی ہے اور غلط راستے پر ڈالتی ہے اور مرد عورتوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ وَاَوۡلَادِکُمۡ عَدُوًّا لَّکُمۡ فَاحۡذَرُوۡہُمۡ ۚ﴾ (التغابن:١٤) ''اے اہل ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں' ان سے ہوشیار رہو۔'' کہیں ان کی محبت تمہیں راہِ حق سے منحرف نہ کر دے۔ شوہر ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہے لیکن بیوی رکاوٹ بن گئی یا بیوی کوئی اچھا کام کرنا چاہتی ہے اور شوہر رکاوٹ بن گیا تو یہ محبت نہیں عداوت ہے۔

﴿وَلَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور تمہارے لیے اب زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک خاص وقت تک۔''

اب زمین تمہاری جائے قیام ہے اور یہاں ضرورت کی تمام چیزیں ہم نے فراہم کر دی ہیں' لیکن یہ ایک وقتِ معین تک

کے لیے ہے' یہ ابدی نہیں ہے' ایک وقت آئے گا کہ ہم یہ بساط لپیٹ دیں گے۔ ﴿یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ ط﴾ (الانبیاء: ۱۰۴) ''جس دن کہ ہم تمام آسمانوں کو اس طرح لپیٹ لیں گے جیسے اوراق کا طومار لپیٹ لیا جاتا ہے۔'' یہ تخلیق ابدی نہیں ہے ''اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی'' ہے ''اِلٰی حِیْنٍ'' ہے۔

آیت ۳۷ ﴿فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ط﴾ ''پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے ربّ سے چند کلمات' تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کر لی۔''

اس کی وضاحت سورۃ الاعراف میں ہے۔ جب حضرت آدمؑ نے اللہ تعالیٰ کا حکم عتاب آمیز سنا اور جنت سے باہر آ گئے تو سخت پشیمانی اور ندامت پیدا ہوئی کہ یہ میں نے کیا کیا' مجھ سے کیسی خطا سرزد ہو گئی کہ میں نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ لیکن ان کے پاس توبہ و استغفار کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے معافی چاہیں۔ اللہ کی رحمت یہ ہوئی کہ اُس نے الفاظ انہیں خود تلقین فرما دیے۔ یہ اللہ کی شانِ رحیمی ہے۔ توبہ کی اصل حقیقت انسان کے اندر گناہ پر ندامت کا پیدا ہو جانا ہے۔ اقبال نے عنفوانِ شباب میں جو اشعار کہے تھے ان میں سے ایک شعر کو سن کر اُس وقت کے اساتذہ بھی پھڑک اُٹھے تھے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

یعنی شرمندگی کے باعث میری پیشانی پر پسینے کے جو قطرے نمودار ہو گئے میرے پروردگار کو وہ اتنے عزیز ہوئے کہ اُس نے انہیں موتیوں کی طرح چن لیا۔ حضرات آدم و حوا علیہما السلام کو جب اپنی غلطی پر ندامت ہوئی تو وہ گریہ و زاری میں مشغول ہو گئے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے انہیں چند کلمات اِلقا فرمائے جن سے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ وہ کلمات سورۃ الاعراف میں بیان ہوئے ہیں: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اور اگر تو نے ہمیں بخش نہ دیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے۔'' تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

اس مقام پر شیطنت اور آدمیت کا فوری تقابل موجود ہے۔ غلطی ابلیس سے بھی ہوئی' اللہ کے حکم سے سرتابی ہوئی' لیکن اُسے اس پر ندامت نہیں ہوئی بلکہ وہ تکبر کی بنا پر مزید اکڑ گیا کہ ''اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ'' اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا۔ دوسری طرف غلطی آدم سے بھی ہوئی' نافرمانی ہوئی' لیکن وہ اس پر پشیمان ہوئے اور توبہ کی۔ وہ طرزِ عمل شیطنت ہے اور یہ آدمیت ہے۔ ورنہ کوئی انسان گناہ سے اور معصیت سے مبرا نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے:

((کُلُّ بَنِیْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ)) (۵)

''آدمؑ کی تمام اولاد خطاکار ہے' اور ان خطاکاروں میں بہتر وہ ہیں جو توبہ کر لیں۔''

حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی ہوئی۔ انہیں اس پر ندامت ہوئی' انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۳۷﴾﴾ ''یقیناً وہی تو ہے توبہ کا بہت قبول کرنے والا' بہت رحم فرمانے والا۔'' توبہ کا لفظ دونوں طرف سے آتا ہے۔ بندہ بھی توّاب ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ﴿۲۲۲﴾﴾ (البقرۃ) جبکہ توّاب اللہ تعالیٰ بھی ہے۔ اس کی اصل حقیقت سمجھ لیجیے۔ بندے نے خطا کی اور اللہ سے دور ہو گیا تو اللہ نے اپنی رحمت کی نگاہ اُس سے پھیر لی۔ بندے نے توبہ کی تو اللہ پھر اپنی رحمت کے ساتھ اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ توبہ کے معنی ہیں پلٹنا۔ بندہ معصیت سے توبہ کر کے اپنی اصلاح کی طرف' بندگی کی طرف' اطاعت کی طرف پلٹ آیا' اور اللہ نے جو اپنی نظرِ رحمت بندے سے پھیر لی تھی' پھر اپنی شانِ غفاری اور رحیمی کے ساتھ بندے کی طرف توجہ فرمالی۔ اس کے لیے حدیث میں الفاظ آتے ہیں:

((...... وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا' وَاِنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً)) (۶)

''......اور اگر وہ (میرا بندہ) بالشت بھر میری طرف آتا ہے تو میں ہاتھ بھر اُس کی طرف آتا ہوں' اور اگر وہ ہاتھ بھر میری طرف آتا ہے تو میں دو ہاتھ اُس کی طرف آتا ہوں' اور اگر وہ چل کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔''

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے راہ روِ منزل ہی نہیں!

وہ تو توّاب ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ''تَابَ'' بندے کے لیے آئے گا تو ''اِلٰی'' کے صلہ کے ساتھ آئے گا۔ جیسے ﴿اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ﴾ اور جب اللہ کے لیے آئے گا تو ''عَلٰی'' کے صلہ کے ساتھ ''تَابَ عَلٰی'' آئے گا' جیسے آیت زیر مطالعہ میں آیا: ﴿فَتَابَ عَلَیْهِ﴾۔ اللہ کی شان بہت بلند ہے۔ انسان توبہ کرتا ہے تو اُس کی طرف توبہ کرتا ہے' جبکہ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ بندے پر توبہ کرتا ہے۔

آیت ۳۸ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ج﴾ ''ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اتر جاؤ۔''

اب یہاں لفظ ''اِهْبِطُوْا'' آیا ہے جو اِس سے پہلے بھی آیا ہے۔ جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ تخلیق آدمؑ آسمانوں پر ہوئی ہے اور وہ جنت بھی آسمانوں پر ہی تھی جہاں حضرت آدمؑ آزمائش یا تربیت کے لیے رکھے گئے تھے وہ ''اِهْبِطُوْا'' کا ترجمہ کریں گے کہ انہیں آسمان سے زمین پر اترنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن جو لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کو زمین پر ہی کسی بلند مقام پر رکھا گیا تھا وہ کہتے ہیں کہ ''اِهْبِطُوْا'' سے مراد بلند جگہ سے نیچے اترنا ہے نہ کہ آسمان سے زمین پر اترنا۔ وہ آزمائشی جنت کسی اونچی سطح مرتفع پر تھی۔ وہاں پر حکم دیا گیا کہ نیچے اترو اور جاؤ' اب تمہیں زمین میں ہل چلانا پڑے گا اور روٹی حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا پڑے گی۔ یہ نعمتوں کے دسترخوان جو یہاں بچھے ہوئے تھے اب تمہارے لیے نہیں ہیں۔ اس معنی میں اس لفظ کا استعمال اسی

سورۃ البقرۃ کے ساتویں رکوع میں ہوا ہے: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ (آیت ۶۱)

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ’’تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت‘ تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔‘‘

یہ ہے علمِ انسانی کا دوسرا گوشہ‘ یعنی علم بالوحی (Revealed Knowledge)۔ اس چوتھے رکوع کا حسن ملاحظہ کیجیے کہ اس کے شروع میں علم بالحواس یا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کا ذکر ہے جو بالقوۃ (potentially) حضرت آدمؑ میں رکھ دیا گیا اور جسے انسان نے پھر اپنی محنت سے‘ اپنے حواس اور عقل کے ذریعے سے آگے بڑھایا۔ یہ علم مسلسل ترقی پذیر ہے اور آج مغربی اقوام اس میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ کبھی ایک زمانے میں مسلمان بہت آگے نکل گئے تھے‘ لیکن ظاہر ہے کہ اس دنیا میں عروج تو انہی کو ہوگا جنہیں سب سے زیادہ اس کی آگہی حاصل ہوگی۔ البتہ وہ علم جو آسمان سے نازل ہوتا ہے وہ عطائی (given) ہے‘ جو وحی پر مبنی ہے۔ اور انسان کے مقامِ خلافت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو احکام اس کے پاس آئیں‘ وہ جو ہدایات بھی بھیجے ان کی پورے پورے طور پر پیروی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔

آیت ۳۹ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ’’اور جو کفر کریں گے‘‘

ہماری اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کریں گے‘ ناشکری کریں گے۔

﴿وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ﴾ ’’اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے‘‘

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ’’وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے‘ اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔‘‘

یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوعِ انسانی کو ابدی منشور (charter) عطا کر دیا گیا جب زمین پر خلیفہ کی حیثیت سے انسان کا تقرر کیا گیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے‘ سورۃ البقرۃ کے یہ ابتدائی چار رکوع قرآن کی دعوت اور قرآن کے بنیادی فلسفہ پر مشتمل ہیں‘ اور ان میں مکی سورتوں کے مضامین کا خلاصہ آ گیا ہے۔

آیات ۴۰ تا ۴۶

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾

اب یہاں سے بنی اسرائیل سے خطاب شروع ہو رہا ہے۔ یہ خطاب پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک‘ مسلسل دس رکوعات پر محیط ہے۔ البتہ ان میں ایک تقسیم ہے۔ پہلا رکوع دعوت پر مشتمل ہے‘ اور جب کسی گروہ کو دعوت دی جاتی ہے تو تشویق و ترغیب‘ دلجوئی اور نرمی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے‘ جو دعوت کے اجزاءِ لاینفک ہیں۔ اس انداز کے بغیر دعوت مؤثر نہیں ہوتی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ سات آیات (پانچواں رکوع) ان دس رکوعوں کے لیے بمنزلۂ فاتحہ ہیں۔ بنی اسرائیل کی حیثیت سابقہ اُمتِ مسلمہ کی تھی‘ جن کو یہاں دعوت دی جا رہی ہے۔ وہ بھی مسلمان ہی تھے‘ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا انکار کر کے کافر ہو گئے۔ ورنہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے‘ شریعت اُن کے پاس تھی‘ بڑے بڑے علماء اُن میں تھے‘ علم کا چرچا اُن میں تھا۔ غرضیکہ سب کچھ تھا۔ یہاں ان کو دعوت دی جا رہی ہے۔ اس سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آج مسلمانوں میں‘ جو اپنی حقیقت کو بھول گئے ہیں‘ اپنے فرضِ منصبی سے غافل ہو گئے ہیں اور دنیا کی دیگر قوموں کی طرح ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں‘ اگر کوئی ایک داعی گروہ کھڑا ہو تو ظاہر بات ہے سب سے پہلے اُسے اسی اُمت کو دعوت دینی ہوگی۔ اس لیے کہ دنیا تو اسلام کو اسی اُمت کے حوالے سے پہچانے گی (Physician heals thyself)۔ پہلے یہ خود ٹھیک ہو اور صحیح اسلام کا نمونہ پیش کرے تو دنیا کو دعوت دے سکے گی کہ آؤ دیکھو یہ ہے اسلام! چنانچہ ان کو دعوت دینے کا جو اسلوب ہونا چاہیے وہ اس اسلوب کا عکس ہوگا جو ان سات آیات میں ہمارے سامنے آئے گا۔

آیت ۴۰ ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ ’’اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا‘‘

’’بنی اسرائیل‘‘ کی ترکیب کو سمجھ لیجیے کہ یہ مرکب اضافی ہے۔ ’’اسر‘‘ کا معنی ہے بندہ یا غلام۔ اسی سے ’’اسیر‘‘ بنا ہے جو کسی کا قیدی ہوتا ہے۔ اور لفظ ’’ئیل‘‘ عبرانی میں اللہ کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ اسرائیل کا ترجمہ ہوگا ’’عبداللہ‘‘ یعنی اللہ کا غلام‘ اللہ کی اطاعت کے قلادے کے اندر بندھا ہوا۔ ’’اسرائیل‘‘ لقب ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے اور ان سے جو نسل چلی وہ بنی اسرائیل ہے۔ ان ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور انہیں تورات دی گئی۔ پھر یہ ایک بہت بڑی اُمت بنے۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت تک ان پر عروج و زوال کے چار ادوار آ چکے تھے۔ دو مرتبہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارشیں ہوئیں اور انہیں عروج نصیب ہوا‘ جبکہ دو مرتبہ دنیا پرستی‘ شہوت پرستی اور اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دینے کی سزا

میں ان پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برسے۔ اس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں آئے گا۔ اُس وقت جبکہ قرآن نازل ہو رہا تھا وہ اپنے اس زوال کے دور میں تھے۔ حال یہ تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی ان کا ''معبدِ ثانی'' (Second Temple) بھی منہدم کیا جا چکا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو ہیکل سلیمانی بنایا تھا' جس کو یہ ''معبدِ اوّل'' (First Temple) کہتے ہیں' اسے بخت نصر (Nebukadnezar) نے حضرت مسیحؑ سے بھی چھ سو سال پہلے گرا دیا تھا۔ اسے انہوں نے دوبارہ تعمیر کیا تھا جو ''معبدِ ثانی'' کہلاتا تھا۔ لیکن ۷۰ عیسوی میں محمد عربی ﷺ کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے رومیوں نے حملہ کر کے یروشلم کو تباہ و برباد کر دیا' یہودیوں کا قتل عام کیا اور جو ''معبدِ ثانی'' انہوں نے تعمیر کیا تھا اُسے بھی مسمار کر دیا' جو اب تک گرا پڑا ہے' صرف ایک دیوارِ گریہ (Veiling Wall) باقی ہے جس کے پاس جا کر یہودی ماتم اور گریہ وزاری کر لیتے ہیں' اور اب وہ اسے سہ بارہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کے ''معبدِ ثالث'' (Third Temple) کے نقشے بن چکے ہیں' اس کا ابتدائی خاکہ تیار ہو چکا ہے۔ بہرحال جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا اُس وقت یہ بہت ہی پستی میں تھے۔ اس وقت ان سے فرمایا گیا: ''اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا تھا''۔ وہ انعام کیا ہے؟ میں نے تم کو اپنی کتاب دی' نبوت سے سرفراز فرمایا' اپنی شریعت تمہیں عطا فرمائی۔ تمہارے اندر داؤد اور سلیمان علیہما السلام جیسے بادشاہ اٹھائے' جو بادشاہ بھی تھے' نبی بھی تھے۔

﴿وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ﴾ ''اور تم میرے وعدے کو پورا کرو تا کہ میں بھی تمہارے وعدے کو پورا کروں۔''

بنی اسرائیل سے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا۔ تورات میں کتابِ استثناء یا سفرِ استثناء (Deuteronomy) کے اٹھارہویں باب کی آیات ۱۸۔۱۹ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کر کے یہ الفاظ فرمائے:

''میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا' نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا۔''

یہ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو بتایا جا رہا تھا کہ نبی آخر الزماں (ﷺ) آئیں گے اور تمہیں ان کی نبوت کو تسلیم کرنا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا تفصیلی ذکر سورۃ الاعراف میں آئے گا۔ یہاں فرمایا کہ تم میرا عہد پورا کرو' میرے اس نبیؐ کو تسلیم کرو' اُسؐ پر ایمان لاؤ' اسؐ کی صدا پر لبیک کہو تو میرے انعام و اکرام مزید بڑھتے چلے جائیں گے۔

﴿وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾﴾ ''اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔''

آیت ۴۱ ﴿وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ﴾ ''اور ایمان لاؤ اُس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اُس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے''

ان الفاظ کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان لاؤ اس قرآن پر جو تصدیق کرتا ہے تورات کی اور انجیل کی۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِیۡهَا هُدًی وَّنُوۡرٌ ۚ﴾ (المائدۃ:٤٤) ''ہم نے نازل کی تورات جس میں ہدایت اور روشنی تھی''۔ ﴿وَاٰتَیۡنٰهُ الۡاِنۡجِیۡلَ فِیۡهِ هُدًی وَّنُوۡرٌ﴾ (المائدۃ:٤٦) ''اور ہم نے اُس (عیسیٰ علیہ السلام) کو دی انجیل جس میں ہدایت اور روشنی تھی''۔ اور دوسرے یہ کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ اُن پیشین گوئیوں کے مصداق بن کر آئے ہیں جو تورات میں تھیں۔ ورنہ وہ پیشین گوئیاں جھوٹی ثابت ہوتیں۔

﴿وَلَا تَكُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۪﴾ ''اور تم ہی سب سے پہلے اس کا کفر کرنے والے نہ بن جاؤ۔''

یعنی قرآن کی دیدہ و دانستہ تکذیب کرنے والوں میں اوّل مت ہو۔ تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے۔ تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ تم تو آخری نبی ﷺ کے انتظار میں تھے اور اُن کے حوالے سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس نبی آخر الزماں ﷺ کے واسطے سے ہماری مدد فرما اور کافروں کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرما۔ (یہ مضمون آگے چل کر اسی سورۃ البقرۃ ہی میں آئے گا۔) لیکن اب تم ہی اس کے اوّلین منکر ہو گئے ہو اور تم ہی اس کے سب سے بڑھ کر دشمن ہو گئے ہو۔

﴿وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۫﴾ ''اور میری آیات کے عوض حقیر سی قیمت قبول نہ کرو۔''

یہ آیاتِ الٰہیہ ہیں اور تم ان کو صرف اس لیے ردّ کر رہے ہو کہ کہیں تمہاری حیثیت' تمہاری مسندوں اور تمہاری چودھراہٹوں پر کوئی آنچ نہ آ جائے۔ یہ تو حقیر سی چیزیں ہیں۔ یہ صرف اس دنیا کا سامان ہیں' اس کے سوا کچھ نہیں۔

﴿وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور صرف میرا تقویٰ اختیار کرو''۔ مجھ ہی سے بچتے رہو!

آیت ۴۲ ﴿وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوا الۡحَقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''اور نہ گڈمڈ کرو حق کے ساتھ باطل کو اور نہ چھپاؤ حق کو درانحالیکہ تم جانتے ہو۔''

یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لیجیے کہ مغالطے میں غلط راہ پر پڑ جانا ضلالت اور گمراہی ہے' لیکن جانتے بوجھتے حق کو پہچان کر اُسے ردّ کرنا اور باطل کی روش اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ اسی سورۃ البقرۃ میں آگے چل کر آئے گا کہ علماءِ یہود محمد رسول اللہ ﷺ کو اور قرآن کو اس طرح پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے: ﴿یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۴۶) لیکن اس کے باوجود انہوں نے محض اپنی دُنیوی مصلحتوں کے پیش نظر آپ ﷺ اور قرآن کی تکذیب کی۔

آیت ۴۳ ﴿وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

﴿وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور جھکو (نماز میں) جھکنے والوں کے ساتھ''۔

یعنی با جماعت نماز ادا کیا کرو۔

اوّل تو یہود نے رکوع کو اپنے ہاں سے خارج کر دیا تھا' ثانیاً با جماعت نماز ان کے ہاں ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہیں رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ گویا صراحت کی جا رہی ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ پر صرف ایمان لانا ہی نجات کے لیے کافی نہیں' بلکہ تمام اصول میں آپؐ کی پیروی ضروری ہے۔ نماز بھی آپؐ کے طریقے پر پڑھو جس میں رکوع بھی ہو اور جو با جماعت ہو۔

آیت ۴۴ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟''

ان آیات کے اصل مخاطب علماء یہود ہیں' جو لوگوں کو تقویٰ اور پارسائی کی تعلیم دیتے تھے لیکن ان کا اپنا کردار اس کے برعکس تھا۔ ہمارے ہاں بھی علماء اور واعظین کا حال اکثر و بیشتر یہی ہے کہ اونچے سے اونچا وعظ کہیں گے' اعلیٰ سے اعلیٰ بات کہیں گے' لیکن ان کے اپنے کردار کو اُس بات سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی جس کی وہ لوگوں کو دعوت دے رہے ہوتے ہیں۔ یہی درحقیقت علماءِ یہود کا کردار بن چکا تھا۔ چنانچہ ان سے کہا گیا کہ ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟''

﴿وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط﴾ ''حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔''

تم یہ کچھ کر رہے ہو اس حال میں کہ تم اللہ کی کتاب بھی پڑھتے ہو۔ یعنی تورات پڑھتے ہو' تم صاحبِ تورات ہو۔ ہمارے ہاں بھی بہت سے علماء کا' جنہیں ہم علماءِ سوء کہتے ہیں' یہی حال ہو چکا ہے۔ بقول اقبال: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

قرآن حکیم کے ترجمے میں' اس کے مفہوم میں' اس کی تفسیر میں بڑی بڑی تحریفیں موجود ہیں۔ الحمد للہ کہ اس کا متن بچا ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟''

آیت ۴۵ ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط﴾ ''اور مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے۔''

یہاں پر صبر کا لفظ بہت بامعنی ہے۔ علماءِ سوء کیوں وجود میں آتے ہیں؟ جب وہ صبر اور قناعت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں تو حبِ مال ان کے دل میں گھر کر لیتی ہے اور وہ دنیا کے کُتّے بن جاتے ہیں۔ پھر وہ دین کو بدنام کرنے والے ہوتے ہیں۔ بظاہر دینی مراسم کے پابند نظر آتے ہیں لیکن دراصل ان کے پردے میں دنیاداری کا معاملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انہیں صبر کی تاکید کی جا رہی ہے۔ سورۃ المائدۃ میں یہود کے علماء و مشائخ پر بایں الفاظ تنقید کی گئی ہے: ﴿لَوْلَا یَنْھٰھُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ط﴾ (المائدۃ:۶۳) ''کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے علماء اور صوفیاء جھوٹ بولنے سے اور حرام کھانے سے؟'' اگر کوئی عالم یا پیر اپنے ارادت مندوں کو ان چیزوں سے روکے گا تو پھر اس کو نذرانے تو نہیں ملیں گے' اس کی خدمتیں تو نہیں ہوں گی۔ چنانچہ اگر تو دنیا میں صبر اختیار کرنا ہے' تب تو آپ حق بات کہہ سکتے ہیں' اور اگر دُنیوی خواہشات (ambitions) مقدم ہیں تو پھر آپ کو کہیں نہ کہیں سمجھوتا (compromise) کرنا پڑے گا۔

صبر کے ساتھ جس دوسری شے کی تاکید کی گئی وہ نماز ہے۔ علماء یہود وضوحِ حق کے باوجود جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لاتے تھے اس کی بڑی وجہ حبِ مال اور حبِ جاہ تھی۔ یہاں دونوں کا علاج بتا دیا گیا کہ حبِ مال کا مداوا صبر سے ہو گا' جبکہ نماز سے عبودیت و تذلل پیدا ہو گا اور حبِ جاہ کا خاتمہ ہو گا۔

﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ﴾ ''اور یقیناً یہ بہت بھاری شے ہے''

عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اِنَّھَا کی ضمیر صرف صلوٰۃ کے لیے ہے۔ یعنی نماز بہت بھاری اور مشکل کام ہے۔ لیکن ایک رائے یہ ہے کہ یہ درحقیقت اس پورے طرزِ عمل کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کے شدائد اور ابتلاءات کا مقابلہ صبر اور نماز کی مدد سے کیا جائے۔ مطلوب طرزِ عمل یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کے متعلقات میں کم سے کم پر قانع ہو جاؤ اور حق کا بول بالا کرنے کے لیے میدان میں آ جاؤ۔ اس کے ساتھ ساتھ نماز کو اپنے معمولاتِ حیات کا محور بناؤ' جو کہ عماد الدین ہے۔ فرمایا کہ یہ روش یقیناً بہت بھاری ہے' اور نماز بھی بہت بھاری ہے۔

﴿اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''مگر اُن عاجزوں پر (بھاری نہیں ہے)۔''

اُن خشوع رکھنے والوں پر' اُن ڈرنے والوں پر یہ روش بھاری نہیں ہے جن کے دل اللہ کے آگے جھک گئے ہیں۔

آیت ۴۶ ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ ''جنہیں یہ یقین ہے کہ وہ اپنے ربّ سے ملاقات کرنے والے ہیں''

میں نے شروع میں ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾﴾ کے ذیل میں توجہ دلائی تھی کہ یہ ایمان بالآخرت ہی ہے جو انسان کو عمل کے میدان میں سیدھا رکھتا ہے۔

﴿وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور (جنہیں یہ یقین ہے کہ) بالآخر انہیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔ انہیں اس کے رُوبرو حاضر ہونا ہے۔

آیات ۴۷ تا ۵۹

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ط وَفِيْ

ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴿٤٩﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ
تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا
عَنْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ فَاقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَکُمْ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ عِنْدَ بَارِئِکُمْ ط فَتَابَ عَلَیْکُمْ ط اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿٥٤﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ
یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿٥٦﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ط کُلُوْا مِنْ
طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ ط وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ
فَکُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ ط وَسَنَزِیْدُ
الْمُحْسِنِیْنَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ
السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع سے چودہویں رکوع تک' بلکہ پندرہویں رکوع کی پہلی دو آیات بھی شامل کر لیجیے' یہ دس رکوعوں سے دو آیات زائد ہیں کہ جن میں خطاب کل کا کل بنی اسرائیل سے ہے۔ البتہ ان میں سے پہلا رکوع دعوت پر مشتمل ہے' جس میں انہیں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کی پرزور دعوت دی گئی ہے' جبکہ بقیہ نو رکوع اُس فردِ قراردادِ جرم پر مشتمل ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد کی جا رہی ہے کہ ہم نے تمہارے ساتھ یہ احسان واکرام کیا' تم پر یہ فضل کیا' تم پر یہ کرم کیا' تمہیں یہ حیثیت دی' تمہیں یہ مقام دیا اور تم نے اس اس طور سے اپنے اس مشن کی خلاف ورزی کی جو تمہارے سپرد کیا گیا تھا اور اپنے مقام و مرتبہ کو چھوڑ کر دُنیا پرستی کی روش اختیار کی۔ ان نو رکوعوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا تو ایک بہت بڑا حصہ اُس کے خدوخال (features) سمیت آ گیا ہے' لیکن اصل میں یہ اُمتِ مسلمہ کے لیے بھی ایک پیشگی تنبیہ ہے کہ کوئی مسلمان اُمت جب بگڑتی ہے تو اُس میں یہ اور یہ خرابیاں آ جاتی ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَیَاْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ مَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَاءِیْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) (۷)

''میری اُمت پر بھی وہ سب حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے' بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں جو حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل ہوا ہے:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَکُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰی لَوْ سَلَکُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَکْتُمُوْهُ))

قُلْنَا : یَارَسُوْلَ اللّٰهِ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی؟ قَالَ : ((فَمَنْ؟)) (۸)

''تم لازماً اپنے سے پہلوں کے طور طریقوں کی پیروی کرو گے' بالشت کے مقابلے میں بالشت اور ہاتھ کے مقابلے میں ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی گھس کر رہو گے''۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہود و نصاریٰ کی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو اور کس کی؟''

ترمذی کی مذکورہ بالا حدیث میں تو یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ: ((حَتّٰی اِنْ کَانَ مِنْهُمْ مَّنْ اَتٰی اُمَّهٗ عَلَانِیَةً لَکَانَ فِیْ اُمَّتِیْ مَنْ یَصْنَعُ ذٰلِکَ)) یعنی اگر اُن میں کوئی بدبخت ایسا اٹھا ہو گا جس نے اپنی ماں سے علی الاعلان زنا کیا تھا تو تم میں سے بھی کوئی شقی ایسا ضرور اٹھے گا جو یہ حرکت کرے گا۔ اس اعتبار سے اِن رکوعوں کو پڑھتے ہوئے یہ نہ سمجھئے کہ یہ محض اَگلوں کی داستان ہے' بلکہ:

''خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں ..... گفتہ آید در حدیثِ دیگراں''

کے مصداق یہ ہمارے لیے ایک آئینہ ہے اور ہمیں ہر مرحلے پر سوچنا ہو گا' دروں بینی کرنی ہو گی کہ کہیں اسی گمراہی میں ہم بھی تو مبتلا نہیں؟

دوسرا اہم نکتہ پہلے سے ہی یہ سمجھ لیجیے کہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۴۷۔۴۸ جن سے اس چھٹے رکوع کا آغاز ہو رہا ہے' یہ دو آیتیں بعینہٖ پندرہویں رکوع کے آغاز میں پھر آئیں گی۔ ان میں سے پہلی آیت میں تو شوشے بھر کا فرق بھی نہیں ہے' جبکہ دوسری آیت میں صرف الفاظ کی ترتیب بدلی ہے' مضمون وہی ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ گویا دو بریکٹ ہیں اور نو (۹) رکوعوں کے مضامین ان دو بریکٹوں کے درمیان ہیں۔ اور سورۃ البقرۃ کا پانچواں رکوع جو اِن بریکٹوں سے باہر ہے' اس کے مضامین بریکٹوں کے اندر کے سارے مضامین سے ضرب کھا رہے ہیں۔ یہ حساب کا بہت ہی عام فہم سا قاعدہ ہے کہ بریکٹ کے باہر لکھی ہوئی رقم' جس کے بعد جمع یا تفریق وغیرہ کی کوئی علامت نہ ہو' وہ بریکٹ کے اندر موجود تمام اقدار (values) کے ساتھ ضرب کھائے گی۔ تو گویا اس پورے معاملے میں ہر ہر قدم پر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت موجود ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ اس حصے میں بعض آیات ایسی آ گئی ہیں جن سے کچھ لوگوں کو مغالطہ پیدا ہوا یا جن سے کچھ لوگوں نے جان بوجھ کر فتنہ پیدا کیا کہ نجاتِ اُخروی کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان ضروری نہیں ہے۔ اس فتنے نے ایک بار اکبر کے زمانے میں ''دینِ الٰہی'' کی شکل میں جنم لیا تھا کہ آخرت میں نجات کے لیے صرف خدا کو مان لینا' آخرت کو مان لینا اور نیک اعمال کرنا کافی ہے' کسی رسول پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ یہ فتنہ صوفیاء میں بھی بہت بڑے پیمانے پر پھیلا اور ''مسجد مندر ہکڑ و نور'' کے فلسفے کی تشہیر کی گئی۔ یعنی مسجد میں اور مندر میں ایک ہی نور ہے' سب مذاہب اصل میں ایک ہی ہیں' سارا فرق شریعتوں کا اور عبادات کی ظاہری شکل کا ہے۔ اور وہ رسولوں سے متعلق ہے۔ چنانچہ رسولوں کو بیچ میں سے نکال دیجیے تو یہ ''دینِ الٰہی'' (اللہ کا دین) رہ جائے گا۔ یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو ہندوستان میں اُس وقت اٹھا جب سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کا اقتدار چوٹی (climax) پر تھا۔ یہ فتنہ جس مسلمان حکمران کا اٹھایا ہوا تھا وہ ''اکبر اعظم'' اور ''مغل اعظم'' کہلاتا تھا۔ اس کے پیش کردہ ''دین'' کا فلسفہ یہ تھا کہ دینِ محمدی ﷺ کا دَور ختم ہو گیا (نعوذ باللہ)' وہ ایک ہزار سال کے لیے تھا' اب دوسرا ہزار سال (الف

ثانی) ہے اور اس کے لیے نیا دین ہے۔ اُسے ''دینِ اکبری'' بھی کہا گیا اور ''دینِ الٰہی'' بھی۔ سورۃ البقرۃ کے اس حصے میں ایک آیت آئے گی جس سے کچھ لوگوں نے اس ''دینِ الٰہی'' کے لیے استدلال کیا تھا۔

ہندوستان میں بیسویں صدی میں یہ فتنہ پھر اٹھا جب گاندھی جی نے ''متحدہ وطنی قومیت'' کا نظریہ پیش کیا۔ اس موقع پر مسلمانوں میں سے ایک بہت بڑا نابغہ (genius) انسان ابوالکلام آزاد بھی اس فتنے کا شکار ہو گیا۔ گاندھی جی اپنی پرارتھنا میں کچھ قرآن کی تلاوت بھی کرواتے' کچھ گیتا بھی پڑھواتے' کچھ اُپنشدوں سے' کچھ بائبل سے اور کچھ گُرو گرنتھ سے بھی استفادہ کیا جاتا۔ متحدہ وطنی قومیت کا تصور یہ تھا کہ ایک وطن کے رہنے والے لوگ ایک قوم ہیں' لہٰذا ان سب کو ایک ہونا چاہیے' مذہب تو انفرادی معاملہ ہے' کوئی مسجد میں چلا جائے' کوئی مندر میں چلا جائے' کوئی گُردوارے میں چلا جائے' کوئی کلیسا' سینیگاگ یا چرچ میں چلا جائے تو اس سے کیا فرق واقع ہوتا ہے؟ اس طرح کے نظریات اور تصورات کا توڑ یہی ہے کہ یوں سمجھ لیجیے کہ پانچویں رکوع کی سات آیات بریکٹ کے باہر ہیں اور یہ بریکٹوں کے اندر کے مضمون سے مسلسل ضرب کھا رہی ہیں۔ چنانچہ ان بریکٹوں کے درمیان جتنا بھی مضمون آ رہا ہے وہ ان کے تابع ہو گا۔ گویا جہاں تک محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا معاملہ ہے وہ ہر مرحلے پر مقدر (understood) سمجھا جائے گا۔ اب ہم ان آیات کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

آیت ۴۷ ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ﴾ ''اے یعقوب کی اولاد! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا''

اس کی وضاحت گزشتہ رکوع میں ہو چکی ہے' لیکن یہاں آگے جو الفاظ آ رہے ہیں بہت زوردار ہیں:

﴿وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت عطا کی تمام جہانوں پر۔''

عربی نحو کا یہ قاعدہ ہے کہ کہیں ظرف کا تذکرہ ہوتا ہے (یعنی جس میں کوئی شے ہے) لیکن اس سے مراد مظروف ہوتا ہے (یعنی ظرف کے اندر جو شے ہے)۔ یہاں بھی ظرف کی جمع لائی گئی ہے لیکن اس سے مظروف کی جمع مراد ہے۔ ''تمام جہانوں پر فضیلت'' سے مراد ''جہان والوں پر فضیلت'' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں تمام اقوامِ عالم پر فضیلت عطا کی۔ عالمِ انسانیت کے اندر جتنے بھی مختلف گروہ' نسلیں اور طبقات ہیں اُن میں فضیلت عطا کی۔

آیت ۴۸ ﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی''

قبل ازیں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ انسان کے عمل کے اعتبار سے سب سے مؤثر شے ایمان بالآخرۃ ہے۔ محاسبہ آخرت اگر مستحضر رہے گا تو انسان سیدھا رہے گا' اور اگر اس میں ضعف آ جائے تو ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت بھی نمعلوم کیا کیا شکلیں اختیار کر لیں۔ اس آیت کے اندر چار اعتبارات سے محاسبۂ اُخروی پر زور دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ ڈرو اُس دن سے جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے گی۔

﴿وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ﴾ ''اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی''

﴿وَّلَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ﴾ ''اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا''

﴿وَّلَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

ایمان بالآخرۃ کے ضمن میں لوگوں نے طرح طرح کے عقیدے گھڑ رکھے ہیں' جن میں شفاعتِ باطلہ کا تصور بھی ہے۔ اہلِ عرب سمجھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ انہوں نے لات' منات اور عزّیٰ وغیرہ کے نام سے اُن کے بتُ بنا رکھے تھے جنہیں وہ پوجتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی یہ لاڈلی بیٹیاں ہمیں اپنے ''ابا جان'' سے چھڑا لیں گی۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک!) ہمارے ہاں بھی شفاعتِ باطلہ کا تصور موجود ہے کہ اولیاء اللہ ہمیں چھڑا لیں گے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے بارے میں غلط تصورات موجود ہیں۔ ایک شفاعت حقہ ہے' جو برحق ہے' اس کی وضاحت کا یہ موقع نہیں ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں جب ہم آیت الکرسی کا مطالعہ کریں گے تو اِن شاء اللہ اس کی وضاحت بھی ہو گی۔ یہ سارے تصورات اور خیالات جو ہم نے گھڑ رکھے ہیں' ان کی نفی اس آیت کے اندر دوٹوک انداز میں کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر جو احسانات و انعامات ہوئے اور ان کی طرف سے جو ناشکریاں ہوئیں ان کا تذکرہ بڑی تیزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ واقعات کئی سو برس پر محیط ہیں اور ان کی تفصیل مکی سورتوں میں آ گئی ہے۔ ان واقعات کی سب سے زیادہ تفصیل سورۃ الاعراف میں موجود ہے۔ یہاں پر تو واقعات کا پے بہ پے تذکرہ کیا جا رہا ہے' جیسے کسی ملزم پر فردِ قراردادِ جرم عائد کی جاتی ہے تو اُس میں سب کچھ گنوایا جاتا ہے کہ تم نے یہ کیا' یہ کیا اور یہ کیا۔

آیت ۴۹ ﴿وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ﴾ ''اور ذرا یاد کرو جب کہ ہم نے تمہیں نجات دی تھی فرعون کی قوم سے''

﴿یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ﴾ ''وہ تمہیں بدترین عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھے''

﴿یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ﴾ ''تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔''

فرعون نے حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی لڑکا پیدا ہو اُس کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے تاکہ ان سے خدمت لی جا سکے اور انہیں لونڈیاں بنایا جا سکے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ یہ معاملہ دو مواقع پر ہوا ہے۔ اس کی تفصیل اِن شاء اللہ بعد میں آئے گی۔

﴿وَفِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور اس میں تمہارے ربّ کی طرف سے تمہارے لیے بڑی آزمائش تھی۔''

آیت ۵۰ ﴿وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِکُمُ الۡبَحۡرَ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ہم نے تمہاری خاطر سمندر کو (یا دریا کو) پھاڑ دیا''

یہ ایک مختلف فیہ بات ہے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے جزیرہ نمائے سینا آنے کے لیے کس سمندر یا دریا کو عبور کیا تھا۔ ایک رائے یہ ہے کہ دریائے نیل کو عبور کر کے گئے تھے' لیکن یہ بات اس اعتبار سے غلط ہے کہ دریائے نیل تو مصر کے اندر بہتا ہے' وہ کبھی بھی مصر کی حد نہیں بنا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو عبور کیا تھا۔ بحیرۂ قلزم (Red Sea) اوپر جا کر دو کھاڑیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے' مشرق کی طرف خلیج عقبہ اور مغرب کی طرف خلیج سویز ہے اور ان کے درمیان جزیرہ نمائے سینا (Sinai Peninsula) ہے۔ یہ اسی طرح کی تکون ہے جیسے جزیرہ نمائے ہند (Indian Peninsula) ہے۔ خلیج سویز اور بحیرۂ روم کے درمیان کئی بڑی بڑی جھیلیں تھیں' جن کو باہم جوڑ جوڑ کر' درمیان میں حائل خشکی کو کاٹ کر نہر سویز بنائی گئی ہے' جو اَب ایک مسلسل رابطہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو عبور کیا تھا۔ مجھے خود بھی اسی رائے سے اتفاق ہے۔ اس لیے کہ کوہِ طور اس جزیرہ نمائے سینا کی نوک (tip) پر واقع ہے' جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن رات کے لیے بلایا گیا اور پھر انہیں تورات دی گئی۔ بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو اس طرح عبور کیا کہ حضرت موسیٰؑ کے عصا کی ایک ضرب سے سمندر پھٹ گیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝۶۳﴾ (الشّعراء) ''پس سمندر پھٹ گیا اور ہو گیا ہر حصہ جیسے بڑا پہاڑ''۔ سمندر کا پانی دونوں طرف پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا اور بنی اسرائیل اس کے درمیان میں سے نکل گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے جب فرعون اپنا لشکر لے کر آیا تو اُس نے سوچا کہ ہم بھی ایسے ہی نکل جائیں گے' لیکن وہ غرق ہو گئے۔ اس لیے کہ دونوں طرف کا پانی آپس میں مل گیا۔ یہ ایک معجزانہ کیفیت تھی اور یہ بات فطرت (nature) کے قوانین کے مطابق نہیں تھی۔

﴿فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۰﴾ ''پھر تمہیں تو نجات دے دی اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا جبکہ تم دیکھ رہے تھے۔''

تمہاری نگاہوں کے سامنے فرعون کے لاؤ لشکر کو غرق کر دیا۔ بنی اسرائیل خلیج سویز سے گزر چکے تھے اور دوسری جانب کھڑے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اِدھر سے فرعون اور اس کا لاؤ لشکر سمندر میں داخل ہوا تو پانی دونوں طرف سے آ کر مل گیا اور یہ سب غرق ہو گئے۔

آیت ۵۱ ﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰؑ سے چالیس رات کا''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمانے کے لیے چالیس دن رات کے لیے کوہِ طور پر بلایا۔

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ ''پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو (معبود) اُس کے بعد''

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں بچھڑے کی پرستش شروع کر دی اور اسے معبود بنا لیا۔

﴿وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۵۱﴾ ''اور تم ظالم تھے۔''

بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا تھا۔ الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ کے مصداق عظیم ترین ظلم جو ہے وہ شرک ہے' اور بنی اسرائیل نے شرکِ جلی کی یہ مکروہ ترین شکل اختیار کی کہ بچھڑے کی پرستش شروع کر دی!

آیت ۵۲ ﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ ''پھر ہم نے تمہیں اس کے بعد بھی معاف کیا'' —— یہ ہمارا کرم رہا ہے' ہماری رحمت رہی ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۲﴾ ''تاکہ تم شکر کرو۔''

آیت ۵۳ ﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۵۳﴾ ''اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان عطا فرمائی تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''

''فرقان'' سے مراد حق اور باطل کے درمیان فرق کر دینے والی چیز ہے اور کتاب کا لفظ عام طور پر شریعت کے لیے آتا ہے۔

آیت ۵۴ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ کہا تھا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے''

﴿يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! یقیناً تم نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے بچھڑے کو معبود بنا کر''

﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ﴾ ''پس اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی جناب میں''

﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ﴾ ''تو قتل کرو اپنے آپ کو۔''

یہ واقعہ تورات میں تفصیل سے آیا ہے' قرآن میں اس کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔ بہت سے واقعات جن کا قرآن میں اجمالاً ذکر ہے ان کی تفصیل کے لیے ہمیں تورات سے رجوع کرنا پڑتا ہے' ورنہ بعض آیات کا صحیح صحیح مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ﴾ ''مار ڈالو اپنی جانیں'' یا ''قتل کرو اپنے آپ کو''۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ دراصل قتلِ مرتد کی سزا ہے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ ہر قبیلے میں سے کچھ لوگوں نے یہ کفر اور شرک کیا کہ بچھڑے کو معبود بنا لیا' باقی لوگوں نے ایسا نہیں کیا۔ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ ہر قبیلے کے وہ لوگ جو اس شرک میں ملوث نہیں ہوئے اپنے اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو قتل کریں جو اس کفر و شرک کے مرتکب ہوئے۔ ''فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے قبیلے کے لوگوں کو قتل کرو۔ اس لیے کہ قبائلی زندگی بڑی حساس ہوتی ہے اور کسی دوسرے قبیلے کی مداخلت سے قبائلی عصبیت بھڑک اٹھنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم پر عمل درآمد کے نتیجے میں ستر ہزار یہودی قتل ہوئے۔ اس سے بڑی توبہ اور اس سے بڑی تطہیر (purge) ممکن نہیں ہے۔ کسی بھی نظریاتی جماعت کے اندر تزکیہ اور تطہیر کا عمل بہت ضروری ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایک نظریے کو قبول کر کے جماعت سے وابستہ ہو جاتے ہیں' لیکن رفتہ رفتہ نظریہ اوجھل ہو جاتا ہے اور اپنے مفادات اور چودھراہٹیں مقدم ہو جاتی ہیں۔ اسی سے جماعتیں خراب ہوتی ہیں اور غلط راستے پر پڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ نظریاتی جماعتوں میں یہ

عمل بہت ضروری ہوتا ہے کہ جو افراد نظریے سے منحرف ہو جائیں ان کو جماعت سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے۔

قرآن حکیم کے اس مقام سے قتل مرتد کی سزا ثابت ہوتی ہے' جبکہ قتل مرتد کا واضح حکم حدیثِ نبویؐ میں موجود ہے۔ ہمارے بعض جدید دانشور اسلام میں قتل مرتد کی حد کو تسلیم نہیں کرتے' لیکن میرے نزدیک یہ شریعت موسویؑ کا تسلسل ہے۔ شریعت موسویؑ کے جن احکام کے بارے میں صراحتاً یہ معلوم نہیں کہ انہیں تبدیل کر دیا گیا ہے وہ شریعت محمدیﷺ کا جزو بن گئے ہیں۔ شادی شدہ زانی پر حدِ رجم کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن مجید میں حدِرجم کی کوئی صریح آیت موجود نہیں ہے' لیکن احادیث میں یہ سزا موجود ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں مرتد کے قتل کی کوئی صریح آیت موجود نہیں ہے' لیکن یہ حدیث اور سنت سے ثابت ہے۔ البتہ ان دونوں سزاؤں کا منبع اور ماخذ دراصل تورات ہے۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کا یہ مقام بہت اہم ہے' لیکن اکثر لوگ یہاں سے بہت سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔

بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ جزیرہ نمائے سینا پہنچنے کے بعد ان کی تعداد مزید بڑھ گئی ہوگی۔ اُن میں سے ستّر ہزار افراد کو شرک کی پاداش میں قتل کیا گیا' اور ہر قبیلے نے جو اپنے مرتد تھے ان کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ﴾ "یہی تمہارے لیے تمہارے ربّ کے نزدیک بہتر بات ہے۔"

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ﴾ "تو (اللہ نے) تمہاری توبہ قبول کر لی۔"

بنی اسرائیل کی توبہ اس طرح قبول ہوئی کہ اُمت کا تزکیہ ہوا اور ان میں سے جن لوگوں نے اتنی بڑی غلط حرکت کی تھی ان کو ذبح کر کے' قتل کر کے اُمت سے کاٹ کر پھینک دیا گیا۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۵۴﴾ "یقیناً وہ تو ہے ہی توبہ کا بہت قبول فرمانے والا' بہت رحم فرمانے والا۔"

آیت ۵۵ ﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ "اور یاد کرو جبکہ تم نے کہا تھا اے موسٰیؑ! ہم تمہارا ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم اللہ کو سامنے نہ دیکھ لیں"

اٰمَنَ يُؤْمِنُ کے بعد "ب" کا صلہ ہو تو اس کے معنی ایمان لانے کے ہوتے ہیں' جبکہ "لِ" کے صلہ کے ساتھ اس کے معنی صرف تصدیق کے ہوتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم آپ کی بات کی تصدیق نہیں کریں گے جب تک ہم اپنی آنکھوں سے اللہ کو آپ سے کلام کرتے نہ دیکھ لیں۔ ہم کیسے یقین کر لیں کہ اللہ نے یہ کتاب آپ کو دی ہے؟ آپؑ تو ہمارے سامنے پتھر کی کچھ تختیاں لے کر آ گئے ہیں جن پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ ہمیں کیا پتا کہ یہ کس نے لکھا ہے؟ دیکھئے' ایک خواہش حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی تھی کہ ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ﴾ (الاعراف: ۱۴۳) "اے میرے ربّ! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھ کو دیکھوں"۔ وہ کچھ اور شے تھی' وہ ع "تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ!" کی کیفیت تھی' لیکن یہ تخریبی ذہن کی سوچ ہے کہ ہم بھی چاہتے ہیں کہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ہمیں معلوم ہو کہ واقعی اُس نے آپ کو یہ کتاب دی ہے۔

﴿فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۵﴾ "تو تمہیں آ پکڑا ایک بہت بڑی کڑک نے اور تم دیکھ رہے تھے"۔

تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک بہت بڑی کڑک نے تمہیں آ لیا اور تم سب کے سب مُردہ ہو گئے۔

آیت ۵۶ ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾ "پھر ہم نے تمہیں دوبارہ اٹھایا تمہاری موت کے بعد"

بعض لوگ اس کی ایک تاویل کرتے ہیں کہ یہ موت نہیں تھی' بلکہ زبردست کڑک کی وجہ سے سب کے سب بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے' لیکن میرے نزدیک یہاں تاویل کی ضرورت نہیں ہے' بعث بعد الموت اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾ کے الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صریح ہیں' انہیں خواہ مخواہ کوئی اور معنی پہنانا درست نہیں ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۶﴾ "تاکہ تم (اس احسان پر ہمارا) شکر کرو۔"

آیت ۵۷ ﴿وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ﴾ "اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا"

جزیرہ نمائے سینا کے لق و دق صحرا میں چھ لاکھ کا قافلہ چل رہا ہے' کوئی اوٹ نہیں' کوئی سایہ نہیں' دھوپ کی تپش سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں۔ ان حالات میں ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہوا کہ تمام دن ایک بادل ان پر سایہ کیے رہتا اور جہاں جہاں وہ جاتے وہ بادل ان کے ساتھ ساتھ ہوتا۔

﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ﴾ "اور اتارا تم پر مَنّ اور سلویٰ۔"

صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا تو ان کے لیے مَنّ و سلویٰ نازل کیے گئے۔ "مَنّ" رات کے وقت شبنم کے قطروں کی مانند اترتا تھا' جس میں شیرینی بھی ہوتی تھی' اور اس کے قطرے زمین پر آ کر جم جاتے تھے اور دانوں کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ یہ گویا ان کا اناج ہو گیا' جس سے کاربوہائیڈریٹس کی ضرورت پوری ہو گئی۔ "سلویٰ" ایک خاص قسم کا بٹیر کی شکل کا پرندہ تھا۔ شام کے وقت ان پرندوں کے بڑے بڑے جھنڈ آتے اور جہاں بنی اسرائیل ڈیرہ ڈالے ہوتے اس کے گرد اتر آتے تھے۔ رات کی تاریکی میں یہ اُن پرندوں کو آسانی سے پکڑ لیتے تھے اور بھون کر کھاتے تھے۔ چنانچہ اُن کی پروٹین کی ضرورت بھی پوری ہو رہی تھی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو مکمل غذا فراہم کر دی تھی۔

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ﴾ "(ہم نے کہا) کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں کو جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں۔"

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۵۷﴾ "اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا' بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھاتے رہے۔"

ہر قدم پر نافرمانی اور ناشکری بنی اسرائیل کا وطیرہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے "مَنّ و سلویٰ" جیسی نعمت کی قدر بھی نہ کی اور ناشکری کی روش اپنائے رکھی۔ اس کا ذکر اگلی آیات میں آ جائے گا۔

آیت ۵۸ ﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا﴾ "اور یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے کہا

تھا کہ داخل ہو جاؤ اس شہر میں اور پھر کھاؤ اس میں سے بافراغت جہاں سے چاہو جو چاہو"

﴿وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ﴾ "لیکن دیکھنا (بستی کے) دروازے میں داخل ہونا جھک کر اور کہتے رہنا مغفرت مغفرت' تو ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائیں گے۔"

﴿وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۵۸﴾ "اور محسنین کو ہم مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔"

بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں آنے اور تورات عطا کیے جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے زمانے میں انہیں جہاد اور قتال کا حکم ہوا' لیکن اس سے پوری قوم نے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ سزا مسلط کر دی کہ یہ چالیس برس تک اسی صحرا میں بھٹکتے پھریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ ابھی جہاد اور قتال کرتے تو ہم پورا فلسطین ان کے ہاتھ سے ابھی فتح کرا دیتے' لیکن چونکہ انہوں نے بزدلی دکھائی ہے لہٰذا اب ان کی سزا یہ ہے: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ (المائدۃ: ۲۶) یعنی ارضِ فلسطین جو ان کے لیے ارضِ موعود تھی وہ ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی ہے' اب یہ چالیس سال تک اسی صحرا میں بھٹکتے پھریں گے۔ صحرا نوردی کے اس عرصے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی انتقال ہو گیا اور حضرت ہارون علیہ السلام کا بھی۔ اس عرصے میں ایک نئی نسل پیدا ہوئی اور وہ نسل جو مصر سے غلامی کا داغ اٹھائے ہوئے آئی تھی وہ پوری کی پوری ختم ہو گئی۔ غلامی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ غلام قوم کے اندر اخلاق و کردار کی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ صحرا نوردی کے زمانے میں جو نسل پیدا ہوئی اور صحرا ہی میں پروان چڑھی وہ ایک آزاد نسل تھی جو اُن کمزوریوں سے پاک تھی اور ان میں ایک جذبہ تھا۔ بنی اسرائیل کی اس نئی نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ یوشع بن نون [تورات میں ان کا نام یشوع (Joshua) آیا ہے] کی قیادت میں قتال کیا اور پہلا شہر جو فتح ہوا وہ "اریحا" تھا۔ یہ شہر آج بھی جریکو (Jericho) کے نام سے موجود ہے۔

یہاں پر اس فتح کے بعد کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو جاؤ اور پھر جو کچھ نعمتیں یہاں ہیں ان سے متمتع ہو' خوب کھاؤ پیو' لیکن شہر کے دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔ مراد یہ ہے کہ جھک کر' سجدۂ شکر بجا لاتے ہوئے داخل ہونا۔ ایسا نہ ہو کہ تکبر کی وجہ سے تمہاری گردنیں اکڑ جائیں۔ اللہ کا احسان مانتے ہوئے گردنیں جھکا کر داخل ہونا۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ فتح تم نے بزورِ بازو حاصل کی ہے۔ اس کا نقشہ ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں نظر آتا ہے کہ جب فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو جس سواری پر آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے آپ ؐ کی پیشانی مبارک اس کی گردن کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ یہ وقت ہوتا ہے جبکہ ایک فاتح تکبر اور تعلّی کا مظاہرہ کرتا ہے' لیکن بندۂ مؤمن کے لیے یہی وقت تواضع کا اور جھکنے کا ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہیں حکم دیا گیا: ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ "اور کہتے جاؤ مغفرت مغفرت"۔ حِطَّۃٌ کا وزن فِعْلَۃٌ اور مادہ "ح ط ط" ہے۔ حَطَّ يَحُطُّ حَطًّا کے متعدد معنی ہیں' جن میں سے ایک "پتے جھاڑنا" ہے۔ مثلاً کہیں گے حَطَّ وَرَقَ الشَّجَرِ (اُس نے درخت کے پتے جھاڑ دیے)۔ حِطَّۃٌ کے معنی "استغفار' طلب مغفرت اور توبہ" کے کیے جاتے ہیں۔ گویا اس میں گناہوں کو جھاڑ دینے اور خطاؤں کو معاف کر دینے کا مفہوم ہے۔ چنانچہ "وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ" کا مفہوم یہ ہو گا کہ مفتوح بستی میں داخل ہوتے وقت جہاں تمہاری گردنیں عاجزی کے ساتھ جھکی ہونی چاہئیں وہیں تمہاری زبان پر بھی استغفار ہونا چاہیے کہ اے اللہ ہمارے گناہ جھاڑ دے' ہماری مغفرت فرما دے' ہماری خطاؤں کو بخش دے! اگر تم ہمارے اس حکم پر عمل کرو گے تو ہم تمہاری خطائیں معاف فرما دیں گے' اور تم میں جو محسن اور نیکوکار ہوں گے انہیں مزید فضل و کرم اور انعام و اکرام سے نوازیں گے۔

آیت ۵۹ ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ "پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس کے جو اُن سے کہہ دی گئی تھی"

ان میں سے جو ظالم تھے' بدکردار تھے انہوں نے ایک اور قول اختیار کر لیا اُس قول کی جگہ جو اُن سے کہا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ "حِطَّةٌ حِطَّةٌ" کہتے ہوئے داخل ہونا' لیکن انہوں نے اس کی بجائے "حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ" کہنا شروع کر دیا' یعنی ہمیں تو گیہوں چاہیے' گیہوں چاہیے! اگلے رکوع میں یہ بات آ جائے گی کہ مَنّ و سلویٰ کھاتے کھاتے بنی اسرائیل کی طبیعتیں بھر گئی تھیں' ایک ہی چیز کھا کھا کر وہ اُکتا گئے تھے اور اب وہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں زمین کی روئیدگی اور پیداوار میں سے کوئی چیز کھانے کو ملنی چاہیے۔ اس خواہش کا اظہار اُن کی زبانوں پر "حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ" کی صورت میں آ گیا۔ اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا استہزاء و تمسخر کیا جو انہیں "وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ" کے الفاظ میں دیا گیا تھا۔ اسی طرح شہر میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونے کی بجائے انہوں نے اپنے سرینوں پر پھسلنا شروع کیا۔

﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ﴾ "پھر ہم نے اتارا ظلم کرنے والوں پر ایک بڑا عذاب آسمان سے"

جن ظالموں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا استہزاء و تمسخر کیا تھا اُن پر آسمان سے ایک بہت بڑا عذاب نازل ہوا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اریحا شہر میں پہنچنے کے بعد انہیں طاعون کی وبا نے آ لیا اور جنہوں نے یہ حرکت کی تھی وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

﴿بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۵۹﴾ "بسبب اُس نافرمانی کے جو انہوں نے کی۔"

یہ اُن نافرمانیوں اور حکم عدولیوں کی سزا تھی جو وہ کر رہے تھے۔

آیات ۶۰ تا ۶۱

﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۶۰ وَاِذْ قُلْتُمْ

یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا
وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا
فَاِنَّ لَکُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ
کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اب یہاں پھر صحراءِ سینا کے واقعات بیان ہو رہے ہیں۔ ان واقعات میں ترتیبِ زمانی نہیں ہے۔ اریحا کی فتح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئی' جس کا ذکر گزشتہ آیات میں ہوا' لیکن اب یہاں پھر اُس دَور کے واقعات آ رہے ہیں جب بنی اسرائیل صحرائے تیہہ میں بھٹک رہے تھے۔

آیت ۶۰ ﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ ؕ﴾ ''اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے تو ہم نے کہا ضرب لگاؤ اپنے عصا سے چٹان پر۔''

صحرائے سینا میں چھ لاکھ سے زائد بنی اسرائیل پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور وہاں پانی نہیں تھا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی طلب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لیے پانی کی دُعا کی تو انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے عصا سے چٹان پر ضرب لگاؤ۔

﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ﴾ ''تو اُس سے بارہ چشمے پھوٹ بہے۔''

''فَجر'' کہتے ہیں کوئی چیز پھٹ کر اُس سے کسی چیز کا برآمد ہونا۔ فجر کے وقت کو فجر اسی لیے کہتے ہیں کہ اُس وقت رات کی تاریکی کا پردہ چاک ہوتا ہے اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے۔

﴿قَدْ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ﴾ ''ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ جان لیا (اور معین کر لیا)۔''

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے' اگر ان کے لیے علیحدہ علیحدہ گھاٹ نہ ہوتا تو ان میں باہم لڑائی جھگڑے کا معاملہ ہوتا۔ انہیں بارہ چشمے اسی لیے دیے گئے تھے کہ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ پانی تو بہت بڑی چیز ہے اور قبائلی زندگی میں اس کی بنیاد پر جنگ وجدل کا آغاز ہو سکتا ہے۔

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا — کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

تو اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ سہولت مہیا کی کہ بارہ چشمے پھوٹ بہے اور ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ معین کر لیا۔

﴿کُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ﴾ ''(گویا ان سے یہ کہہ دیا گیا کہ) کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے''

﴿وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۶۰﴾﴾ ''اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو۔''

صحرا میں ان کے لیے پینے کو پانی بھی مہیا کر دیا گیا اور کھانے کے لیے مَن وسلویٰ اتار دیا گیا' لیکن انہوں نے ناشکری کا معاملہ کیا' جس کا ذکر ملاحظہ ہو۔

آیت ۶۱ ﴿وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ ''اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا تھا اے موسیٰ! ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے''

مَن وسلویٰ کھا کھا کر اب ہم اُکتا گئے ہیں۔

﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ﴾ ''تو ذرا اپنے ربّ سے ہمارے لیے دعا کرو''

﴿یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ﴾ ''کہ نکالے ہمارے لیے اس سے کہ جو زمین اُگاتی ہے''

یعنی زمین کی پیداوار میں سے' نباتاتِ ارضی میں سے ہمیں رزق دیا جائے۔

﴿مِنْۢ بَقْلِهَا﴾ ''اُس کی ترکاریاں''

﴿وَقِثَّآئِهَا﴾ ''اور ککڑیاں''

یہ لفظ کھیرے اور ککڑی وغیرہ سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

﴿وَفُوْمِهَا﴾ ''اور لہسن''

فُوم کا ایک ترجمہ گیہوں کیا گیا ہے' لیکن میرے نزدیک زیادہ صحیح ترجمہ لہسن ہے۔ عربی میں اس کے لیے بالعموم لفظ ''ثُوم'' استعمال کیا جاتا ہے۔ لہسن کو فارسی میں توم اور پنجابی' سرائیکی اور سندھی میں ''تھوم'' کہتے ہیں اور یہ فُوم اور ثُوم ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے' اس لیے کہ عربوں کی آمد کے باعث اُن کی زبان کے بہت سے الفاظ سندھی اور سرائیکی زبان میں شامل ہو گئے' جو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کافی تعداد میں اب بھی موجود ہیں۔

﴿وَعَدَسِهَا﴾ ''اور مسور''

﴿وَبَصَلِهَا ؕ﴾ ''اور پیاز۔''

اب جو سالن کے چٹخارے اِن چیزوں سے بنتے ہیں اُن کی زبانیں وہ چٹخارے مانگ رہی تھیں۔ بنی اسرائیل صحرائے سینا میں ایک ہی طرح کی غذا ''مَنّ وسلویٰ'' کھاتے کھاتے اُکتا گئے تھے' لہٰذا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہمیں زمین سے اُگنے والی چٹخارے دار چیزیں چاہئیں۔

﴿قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ﴾ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا: تم وہ شے لینا چاہتے ہو جو کمتر ہے اُس کے بدلے میں جو بہتر ہے؟''

مَن وسلویٰ نباتاتِ ارضی سے کہیں بہتر ہے جو اللہ کی طرف سے تمہیں دیا گیا ہے۔ تو اس سے تمہارا جی بھر گیا ہے اور اس کو ہاتھ سے دے کر چاہتے ہو کہ یہ ادنیٰ چیزیں تمہیں ملیں؟

﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَکُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ﴾ ''اترو کسی شہر میں تو تم کو مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو۔''

لفظ ''اِھۡبِطُوۡا'' پر آیت ۳۸ کے ذیل میں بات ہو چکی ہے کہ اس کا معنی بلندی سے اترنے کا ہے۔ ظاہر بات ہے یہاں یہ لفظ آسمان سے زمین پر اترنے کے لیے نہیں آیا' بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ کسی بستی میں جا کر آباد ہو جاؤ! (settle down somewhere) اگر تمہیں زمین کی پیداوار میں سے یہ چیزیں چاہئیں تو کہیں آباد (settle) ہو جاؤ اور کاشت کاری کرو' یہ ساری چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔

﴿وَضُرِبَتۡ عَلَیۡھِمُ الذِّلَّۃُ وَالۡمَسۡکَنَۃُ ۚ﴾ ''اور ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی تھوپ دی گئی۔''

﴿وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔''

وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔

بنی اسرائیل وہ اُمت تھی جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ (البقرۃ) اسی اُمت کا پھر یہ حشر ہوا تو کیوں ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے! انہیں کتاب دی گئی تھی کہ اس کی پیروی کریں اور اسے قائم کریں۔ سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا:

﴿وَلَوۡ اَنَّھُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡھِمۡ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ لَاَکَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِھِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِھِمۡ ؕ﴾ (آیت ۶۶)

''اگر یہ (اہل کتاب) تورات اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کرتے جو اُن کی جانب ان کے ربّ کی طرف سے اتاری گئیں تو کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے۔''

یعنی ان کے سروں کے اوپر سے بھی نعمتوں کی بارش ہوتی اور زمین بھی ان کے لیے نعمتیں اُگلتی۔ لیکن انہوں نے اس کو چھوڑ کر اپنی خواہشات' اپنے نظریات' اپنے خیالات' اپنی عقل اور اپنی مصلحتوں کو مقدم کیا' اور اپنے تمرد' اپنی سرکشی اور اپنی حاکمیت کو بالاتر کیا۔ جو قوم دنیا میں اللہ کے قانون' اللہ کی ہدایت اور اللہ کی کتاب کی امین ہوتی ہے وہ اللہ کی نمائندہ (representative) ہوتی ہے' اور اگر وہ اپنے عمل سے غلط نمائندگی (misrepresent) کرے تو وہ اللہ کے نزدیک کافروں سے بڑھ کر مغضوب اور مبغوض ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ کافروں کو دین پہنچانا تو اِس مسلمان اُمت کے ذمہ تھا۔ اگر یہ خود ہی دین سے منحرف ہو گئے تو کسی اور کو کیا دین پہنچائیں گے؟ آج اس مقام پر موجودہ اُمتِ مسلمہ کھڑی ہے کہ تعداد میں سوا ارب یا ڈیڑھ ارب ہونے کے باوجود ان کے حصے میں عزت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ دُنیا کے سارے معاملات G-7 اور G-15 ممالک کے ہاتھ میں ہیں۔ سکیورٹی کونسل کے مستقل ارکان کو ویٹو کا حق حاصل ہے' لیکن کوئی مسلمان ملک نہ تو سکیورٹی کونسل کا مستقل رکن ہے اور نہ ہی G-7' G-9 یا G-15 میں شامل ہے۔ گویا ع ''کس نمی پُرسد کہ بھیا کیستی!'' ہماری اپنی پالیسیاں کہیں اور طے ہوتی ہیں' ہمارے اپنے بجٹ کہیں اور بنتے ہیں' ہماری صلح اور جنگ کسی اور کے اشارے سے ریموٹ کنٹرول انداز میں ہوتی ہیں۔ یہ ذلت اور مسکنت ہے جو آج ہم پر تھوپ دی گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کشمیر ہماری شہ رگ ہے' لیکن اس کے لیے جنگ کرنے کو ہم تیار نہیں ہیں۔ یہ خوف نہیں ہے تو کیا ہے؟ یہ مسکنت نہیں ہے تو کیا ہے؟ اگر اللہ پر یقین ہے اور اپنے حق پر ہونے کا یقین ہے تو اپنی شہ رگ دشمن کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے ہمت کرو۔ لیکن نہیں' ہم میں یہ ہمت موجود نہیں ہے۔ ہمارے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خبریں آتی رہیں گی کہ قابض بھارتی فوج نے ریاستی دہشت گردی کی کارروائیوں میں اتنے کشمیریوں کو شہید کر دیا' اتنی مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کر دی' لیکن ہم یہاں اپنے اپنے دھندوں میں' اپنے اپنے کاروبار میں' اپنی اپنی ملازمتوں میں اور اپنے اپنے کیریئرز میں مگن ہیں۔ بہرحال متذکرہ بالا الفاظ اگرچہ بنی اسرائیل کے لیے آئے ہیں کہ ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی مسلط کر دی گئی' لیکن اس میں آج کی اُمتِ مسلمہ کا نقشہ بھی موجود ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں　　گفتہ آید در حدیث دیگراں!

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے''

﴿وَیَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ﴾ ''اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے۔''

ہمارے ہاں بھی مجددین اُمت کو قتل بھی کیا گیا اور اُن میں سے کتنے ہیں جو جیلوں میں ڈالے گئے۔ متعدد صحابہ کرام ؓ اور سینکڑوں تابعین متبد حکمرانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ائمۂ دین کو ایسی ایسی مار پڑی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ہاتھی کو بھی ایسی مار پڑے تو وہ برداشت نہ کر سکے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ کیا کچھ ہوا! امام ابوحنیفہؒ نے جیل میں انتقال کیا اور وہاں سے اُن کا جنازہ اٹھا۔ امام دار الہجرت امام مالکؒ کے کندھے کھینچ دیے گئے اور منہ کالا کر کے انہیں اُونٹ پر بٹھا کر پھرایا گیا۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو پسِ دیوارِ زنداں ڈالا گیا۔ سید احمد بریلویؒ اور ان کے ساتھیوں کو خود مسلمانوں نے شہید کروا دیا۔ ہماری تاریخ ایسی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ اب نبی تو کوئی نہیں آئے گا۔ اُن کے ہاں نبی تھے' ہمارے ہاں مجددین ہیں' علماءِ حق ہیں۔ انہوں نے جو کچھ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا وہی ہم نے مجددین کے ساتھ کیا۔

﴿ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّکَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۶۱﴾﴾ ''اور یہ اس لیے ہوا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔''

ان کو یہ سزا اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے دی گئی۔ اللہ تعالیٰ تو ظالم نہیں ہے (نعوذ باللہ)' اللہ تعالیٰ نے تو انہیں اُونچا مقام دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی ''خیر اُمت'' قرار دیا۔ ہم نے بھی جب اپنا مشن چھوڑ دیا تو ذلت اور مسکنت ہمارا مقدر بن گئی۔ اللہ کا قانون اور اللہ کا عدل بے لاگ ہے۔ یہ سب کے لیے ایک ہے' ہر اُمت کے لیے الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ کی سنت بدلتی نہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کے سبب ان کا جو حشر ہوا آج وہ ہمارا ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں میری کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' کے نام سے موجود ہے' اُس کا مطالعہ کیجیے!

آیات ۶۲ تا ۶۶

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّاذۡکُرُوۡا مَا فِیۡهِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ ۚ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَکُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِیۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡکُمۡ فِی السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَهُمۡ کُوۡنُوۡا قِرَدَۃً خٰسِئِیۡنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلۡنٰهَا نَکَالًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا وَمَوۡعِظَۃً لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۶﴾﴾

اب وہ آیت آ رہی ہے کہ جس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ نجاتِ اُخروی کے لیے ایمان بالرسالت ضروری نہیں ہے۔

آیت ۶۲ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ ''یقیناً جو لوگ ایمان لائے''

اور اس سے مراد ہے جو ایمان لائے محمد رسول اللہ ﷺ پر۔

﴿وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی﴾ ''اور جو یہودی ہو گئے اور نصرانی''

﴿وَالصّٰبِئِیۡنَ﴾ ''اور صابی''

صابی وہ لوگ تھے جو عراق کے علاقے میں رہتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ہم دینِ ابراہیمی پر ہیں۔ لیکن اُن کے ہاں بھی بہت کچھ بگڑ گیا تھا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل بگاڑ کا شکار ہو گئی تھی اسی طرح وہ بھی بگڑ گئے تھے اور ان کے ہاں زیادہ تر ستارہ پرستی رواج پا گئی تھی۔

﴿مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ﴾ ''جو کوئی بھی ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور یومِ آخر پر''

﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ ''اور اُس نے اچھے عمل کیے''

﴿فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ﴾ ''تو اُن کے لیے (محفوظ) ہے اُن کا اجر اُن کے ربّ کے پاس''

﴿وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾﴾ ''اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

ان لوگوں کو نہ تو کوئی خوف دامن گیر ہوگا اور نہ ہی وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے دیکھیں تو یہاں ایمان بالرسالت کا ذکر نہیں ہے۔ اگر کوئی اس سے غلط استدلال کرتا ہے تو اس کا پہلا اصولی جواب تو یہ ہے کہ بعض احادیث میں ایسے الفاظ بھی موجود ہیں: ((مَنۡ قَالَ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الۡجَنَّـةَ)) تو کیا اس کے یہ معانی ہیں کہ صرف لا الٰہ الا اللہ کہنے سے جنت میں داخل ہو جائیں گے، کسی عمل کی ضرورت نہیں؟ بلکہ کسی حدیث کا مفہوم اخذ کرنے کے لیے پورے قرآن کو اور پورے ذخیرۂ احادیث کو سامنے رکھنا ہوگا۔ کسی ایک جگہ سے کوئی نتیجہ نکال لینا صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ چھٹے رکوع کے آغاز میں یہ اصولی بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ سورۃ البقرۃ کا پانچواں رکوع چھٹے رکوع سے شروع ہونے والے سارے مضامین سے ضرب کھا رہا ہے، جس میں محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ پر نازل ہونے والے قرآن پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت بایں الفاظ موجود ہے:

﴿وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ وَلَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِهٖ﴾

''اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے، جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے اور تم ہی سب سے پہلے اس کا کفر کرنے والے نہ بن جاؤ۔''

اب فصاحت اور بلاغت کا یہ تقاضا ہے کہ ایک بات بار بار نہ دہرائی جائے۔ البتہ یہ بات ہر جگہ مقدر (understood) سمجھی جائے گی۔ اس لیے کہ ساری گفتگو اسی کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ اس حوالے سے اب یوں سمجھئے کہ آیتِ زیرِ مطالعہ میں ''فِیۡ اَیَّامِهِمۡ'' یا ''فِیۡ اَزۡمِنَتِهِمۡ'' (اپنے اپنے دَور میں) کے الفاظ محذوف مانے جائیں گے۔ گویا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا [فِیۡ اَیَّامِهِمۡ] فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾﴾

یعنی نجاتِ اُخروی کے لیے اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان کے ساتھ ساتھ اپنے دَور کے نبی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں آئے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے جو بھی یہودی موجود تھے، جو اللہ پر ایمان رکھتے تھے، آخرت کو مانتے تھے اور نیک عمل کرتے تھے ان کی نجات ہو جائے گی۔ لیکن جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد انؑ کو نہیں مانا تو اب وہ کافر قرار پائے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام رسولوں پر ایمان نجاتِ اُخروی کے لیے کافی تھا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آپؐ پر ایمان نہ لانے والے کافر قرار پائیں گے۔

آیتِ زیرِ مطالعہ میں اصل زور اس بات پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ کسی گروہ میں شامل ہونے سے نجات پا جاؤ گے، نجات کسی گروہ میں شامل ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ نجات کی بنیاد ایمان اور عملِ صالح ہے۔ اپنے دَور کے رسول پر ایمان لانا تو لازم ہے، لیکن اس کے ساتھ اگر عملِ صالح نہیں ہے تو نجات نہیں ہوگی۔ قرآن مجید کے ایک مقام پر آیا ہے: ﴿وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ۚ﴾ (الاعراف: ۳۴) ''اور ہر اُمت کے لیے ایک خاص معین مدّت ہے''۔ ہر اُمت اس معینہ مدّت ہی کی مکلّف ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے ان پر تو آپ ﷺ پر ایمان لانے کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ بعثتِ نبویؐ سے قبل ایسے موحدین مکہ مکرمہ میں موجود تھے جو کعبہ کے پردے پکڑ پکڑ کر یہ کہتے تھے کہ اے اللہ! ہم صرف تیری بندگی کرنا چاہتے ہیں، لیکن جانتے نہیں کہ کیسے کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی اور فاطمہؓ بنت خطاب کے شوہر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کے والد زید کا یہی معاملہ تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے دنیا سے چلے گئے کہ: ''اے اللہ! میں صرف تیری بندگی کرنا چاہتا ہوں، مگر نہیں جانتا کہ کیسے کروں۔''

سورۃ الفاتحہ کے مطالعہ کے دوران میں نے کہا تھا کہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان توحید تک پہنچ جاتا ہے،

آخرت کو پہچان لیتا ہے‘ لیکن آگے وہ نہیں جانتا کہ اب کیا کرے۔ احکامِ شریعت کی تفصیل کے لیے وہ ’’رَبِّ الْعٰلَمِیْن ‘‘اور ’’مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ‘‘کے حضور دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہے کہ: ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۝﴾ اُسی صراط مستقیم کی دعا کا جواب یہ قرآن حکیم ہے‘ اور اس میں سورۃ البقرۃ ہی سے احکامِ شریعت کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے کہ یہ کرو‘ یہ نہ کرو‘ یہ فرض ہے‘ یہ تم پر لازم کیا گیا ہے اور یہ چیزیں حرام کی گئی ہیں۔

آیت ۶۳ ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ط﴾ ’’اور ذرا یاد کرو جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا اور تمہارے اوپر اٹھا دیا کوہِ طور کو۔‘‘

بنی اسرائیل کو جب تورات دی گئی تو اُس وقت ان کے دلوں میں اللہ اور اس کی کتاب کی ہیبت ڈالنے اور خشیت پیدا کرنے کے لیے معجزانہ طور پر ایک ایسی کیفیت پیدا کی گئی کہ اُن کے اوپر کوہِ طور اٹھا کر معلق کر دیا گیا۔ اُس وقت ان سے کہا گیا:

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ﴾ ’’پکڑو اس کو مضبوطی کے ساتھ جو ہم نے تم کو دیا ہے۔‘‘

اس کتاب تورات کو اور اس میں بیان کردہ احکامِ شریعت کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔

﴿وَّاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ﴾ ’’اور یاد رکھو اسے جو کچھ کہ اس میں ہے‘‘

﴿لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۝۶۳﴾ ’’تاکہ تم بچ سکو۔‘‘

آیت ۶۴ ﴿ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ ج﴾ ’’پھر تم نے روگردانی کی اُس کے بعد۔‘‘

یعنی جو میثاقِ شریعت تم سے لیا گیا تھا اُس کو توڑ ڈالا۔

﴿فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ لَکُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ۝۶۴﴾ ’’پھر اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو تم (اُسی وقت) خسارہ پانے والے ہو جاتے۔‘‘

اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تمہارے شاملِ حال نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہاری دستگیری نہ کرتی رہتی‘ تمہیں بار بار معاف نہ کیا جاتا اور تمہیں بار بار مہلت نہ دی جاتی تو تم اُسی وقت تباہ ہو جاتے۔

آیت ۶۵ ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْکُمْ فِی السَّبْتِ﴾ ’’اور تم انہیں خوب جان چکے ہو جنہوں نے تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں‘‘

تمہیں خوب معلوم ہے کہ تم میں سے وہ کون لوگ تھے جنہوں نے سبت کے قانون کو توڑا تھا اور حد سے تجاوز کیا تھا۔ یہود کی شریعت میں ہفتہ کا روز عبادت کے لیے معین کر دیا گیا تھا اور اس روز دنیاوی کام کاج کی اجازت نہیں تھی۔ آج بھی جو مذہبی یہودی (Practicing Jews) ہیں وہ اس کی پابندی بڑی شدت سے کرتے ہیں۔ لیکن ایک زمانے میں ان کے ایک خاص قبیلے نے ایک شرعی حیلہ ایجاد کر کے اس قانون کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ اس واقعہ کی تفصیل سورۃ الاعراف میں آئے گی۔

﴿فَقُلْنَا لَھُمْ کُوْنُوْا قِرَدَۃً خٰسِئِیْنَ۝۶۵﴾ ’’تو ہم نے کہہ دیا اُن سے کہ ہو جاؤ ذلیل بندر۔‘‘

ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ تین دن کے بعد یہ سب مر گئے۔

آیت ۶۶ ﴿فَجَعَلْنٰھَا نَکَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْھَا وَمَا خَلْفَھَا﴾ ’’پھر ہم نے اس (واقعہ کو یا اس بستی) کو عبرت کا سامان بنا دیا ان کے لیے بھی جو سامنے موجود تھے (اس زمانے کے لوگ) اور ان کے لیے بھی جو بعد میں آنے والے تھے‘‘

﴿وَمَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ۝۶۶﴾ ’’اور ایک نصیحت (اور سبق آموزی کی بات) بنا دیا اہلِ تقویٰ کے لیے۔‘‘

آیات ۶۷ تا ۷۴

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ط قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا ط قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ۝۶۷ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ ط قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ ط عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِکَ ط فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ۝۶۸ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُھَا ط قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ لا فَاقِعٌ لَّوْنُھَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ۝۶۹ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ لا اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَہَ عَلَیْنَا ط وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ لَمُھْتَدُوْنَ۝۷۰ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ ج مُسَلَّمَۃٌ لَّا شِیَۃَ فِیْھَا ط قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ط فَذَبَحُوْھَا وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ۝۷۱ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْھَا ط وَاللّٰہُ مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ۝۷۲ فَقُلْنَا اضْرِبُوْہُ بِبَعْضِھَا ط کَذٰلِکَ یُحْیِ اللّٰہُ الْمَوْتٰی لا وَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ۝۷۳ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً ط وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَۃِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْہُ الْاَنْھٰرُ ط وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْہُ الْمَآءُ ط وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ط وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝۷۴﴾

ان آیات کے مطالعے سے قبل ان کا پس منظر جان لیجیے۔ بنی اسرائیل میں عامیل نامی ایک شخص قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا مردہ شخص کے جسم پر مارو تو وہ جی اُٹھے گا اور بتا دے گا کہ میرا قاتل کون ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ میں ہمیں معجزات کا عمل دخل بہت زیادہ ملتا ہے۔ یہ بھی انہی معجزات میں سے ایک معجزہ تھا۔ گائے کو ذبح کرانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کے قلوب و اذہان میں گائے کا جو تقدس راسخ ہو چکا تھا اُس پر تلوار چلائی جائے۔ اور پھر انہیں یہ بھی دکھا دیا گیا کہ ایک مردہ آدمی زندہ بھی ہو سکتا ہے‘ اس طرح بعث بعد الموت کا ایک نقشہ انہیں اس دنیا میں دکھا دیا گیا۔ بنی اسرائیل کو جب گائے ذبح کرنے کا حکم ملا تو ان کے دلوں میں جو بچھڑے کی محبت اور گائے کی تقدیس جڑ

پکڑ چکی تھی اس کے باعث انہوں نے اس حکم سے کسی طرح سے بچ نکلنے کے لیے مین میخ نکالنی شروع کی اور طرح طرح کے سوال کرنے لگے کہ وہ کیسی گائے ہو؟ اس کا کیا رنگ ہو؟ کس طرح کی ہو؟ کس عمر کی ہو؟ بالآخر جب ہر طرف سے اُن کا گھیراؤ ہو گیا اور سب چیزیں ان کے سامنے واضح کر دی گئیں تب انہوں نے چار و ناچار بادلِ نخواستہ اس حکم پر عمل کیا۔ اب ہم ان آیات کا ایک رواں ترجمہ کر لیتے ہیں۔

آیت ۶۷ ﴿وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖۤ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَۃً ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب موسٰیؑ نے کہا اپنی قوم سے کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے کو ذبح کرو۔''

﴿قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا ہُزُوًا ؕ﴾ ''انہوں نے کہا: کیا آپؑ ہم سے کچھ ٹھٹھا کر رہے ہیں؟''

کیا آپؑ یہ بات ہنسی مذاق میں کہہ رہے ہیں؟

﴿قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''فرمایا: میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔''

ہنسی مذاق اور تمسخر و استہزا تو جاہلوں کا کام ہے اور اللہ کے نبی سے یہ بعید ہے کہ وہ دین کے معاملات کے اندر ان چیزوں کو شامل کرلے۔

آیت ۶۸ ﴿قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنۡ لَّنَا مَا ہِیَ ؕ﴾ ''انہوں نے کہا (اچھا ایسی ہی بات ہے تو) ہمارے لیے ذرا اپنے ربّ سے دعا کیجیے کہ وہ ہم پر واضح کر دے کہ وہ کیسی ہو۔''

﴿قَالَ اِنَّہٗ یَقُوۡلُ اِنَّہَا بَقَرَۃٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِکۡرٌ ؕ﴾ ''(حضرت موسٰیؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بالکل بچھیا۔''

﴿عَوَانٌۢ بَیۡنَ ذٰلِکَ ؕ﴾ ''بڑھاپے اور نوجوانی کے بین بین ہو۔''

﴿فَافۡعَلُوۡا مَا تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۸﴾﴾ ''تو اب کر گزرو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔''

آیت ۶۹ ﴿قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنۡ لَّنَا مَا لَوۡنُہَا ؕ﴾ ''اب انہوں نے کہا (ذرا ایک دفعہ پھر) ہمارے لیے دعا کیجیے اپنے ربّ سے کہ وہ ہمیں بتا دے کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔''

﴿قَالَ اِنَّہٗ یَقُوۡلُ اِنَّہَا بَقَرَۃٌ صَفۡرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوۡنُہَا تَسُرُّ النّٰظِرِیۡنَ ﴿۶۹﴾﴾ ''فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ گائے ہونی چاہیے زرد رنگ کی، جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کو خوب اچھی لگے۔''

یہ خوبیاں اُس گائے کی تھیں جو اُن کے ہاں زیادہ سے زیادہ مقدس سمجھی جاتی تھی۔ اگر پہلے ہی حکم پر وہ عمل پیرا ہو جاتے تو کسی بھی گائے کو ذبح کر سکتے تھے۔ لیکن یکے بعد دیگرے سوالات کے باعث رفتہ رفتہ اُن کا گھیراؤ ہوتا گیا کہ جس گائے کے تقدس کا تأثر ان کے ذہن میں زیادہ سے زیادہ تھا اُسی کو focus کر دیا گیا۔

آیت ۷۰ ﴿قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنۡ لَّنَا مَا ہِیَ ۙ﴾ ''انہوں نے کہا (ذرا پھر) اللہ سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہم پر واضح کر دے کہ وہ گائے کیسی ہو''

﴿اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَہَ عَلَیۡنَا ؕ﴾ ''کیونکہ گائے کا معاملہ یقیناً ہم پر کچھ مشتبہ ہو گیا ہے۔''

ہمیں گائے کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔

﴿وَ اِنَّاۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ لَمُہۡتَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾﴾ ''اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پالیں گے۔''

آیت ۷۱ ﴿قَالَ اِنَّہٗ یَقُوۡلُ اِنَّہَا بَقَرَۃٌ لَّا ذَلُوۡلٌ تُثِیۡرُ الۡاَرۡضَ وَ لَا تَسۡقِی الۡحَرۡثَ ۚ﴾ ''فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے وہ ایک ایسی گائے ہونی چاہیے کہ جس سے کوئی مشقت نہ لی جاتی ہو، نہ وہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو۔''

﴿مُسَلَّمَۃٌ لَّا شِیَۃَ فِیۡہَا ؕ﴾ ''وہ صحیح سالم یک رنگ ہونی چاہیے، اُس میں (کسی دوسرے رنگ کا) کوئی داغ تک نہ ہو۔''

﴿قَالُوا الۡـٰٔنَ جِئۡتَ بِالۡحَقِّ ؕ﴾ ''انہوں نے کہا اب آپ لائے ہیں ٹھیک بات۔''

اب تو آپؑ نے بات پوری طرح واضح کر دی ہے۔

﴿فَذَبَحُوۡہَا وَ مَا کَادُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۱﴾﴾ ''تب انہوں نے اُس کو ذبح کیا اور وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کر لیں گے۔''

اب وہ کیا کرتے، پے بہ پے سوالات کرتے کرتے وہ گھیراؤ میں آ چکے تھے، لہٰذا بادلِ نخواستہ وہ اپنی مقدس سنہری گائے کو ذبح کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہاں واقعہ کی ترتیب تورات سے مختلف ہے اور ذبح بقرہ کا جو سبب تھا وہ بعد میں بیان ہو رہا ہے، جبکہ تورات میں ترتیب دوسری ہے۔

آیت ۷۲ ﴿وَ اِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِیۡہَا ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، اور اُس کا الزام تم ایک دوسرے پر لگا رہے تھے۔''

چنانچہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ قاتل کون ہے۔

﴿وَ اللّٰہُ مُخۡرِجٌ مَّا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۷۲﴾﴾ ''اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو کچھ تم چھپاتے تھے۔''

اللہ تعالیٰ فیصلہ کر چکا تھا کہ جو کچھ تم چھپا رہے ہو اسے نکال کر رہے گا اور واضح کر دے گا۔

آیت ۷۳ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ﴾ ''تو ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اُس گائے کے ایک ٹکڑے سے ضرب لگاؤ۔''

اس طرح وہ مُردہ شخص بحکم الٰہی تھوڑی دیر کے لیے زندہ ہو گیا اور اُس نے اپنے قاتل کا نام بتا دیا۔

﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ﴾ ''دیکھو! اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کر دے گا''

﴿وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٣﴾﴾ ''اور وہ تمہیں اپنی نشانیاں (اپنی قدرت کے نمونے) دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔''

اب جو الفاظ آگے آ رہے ہیں بہت سخت ہیں۔ لیکن ان کو پڑھتے ہوئے دروں بینی ضرور کیجیے گا' اپنے اندر ضرور جھانکئے گا۔

آیت ۷۴ ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد''

جب دین میں حیلے بہانے نکالے جانے لگیں اور حیلوں بہانوں سے شریعت کے احکام سے بچنے اور اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے تو اُس کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ دل کی سختی ہے۔

﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ﴾ ''پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں' بلکہ سختی میں ان سے بھی زیادہ شدید ہیں۔''

یہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی قرآن حکیم کا ایک بڑا اعمدہ مقام ہے۔

﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ﴾ ''اور پتھروں میں سے تو یقیناً ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں۔''

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ﴾ ''اور ان (پتھروں اور چٹانوں) میں سے بے شک ایسے بھی ہوتے ہیں جو شق ہو جاتے ہیں اور ان میں سے پانی برآمد ہو جاتا ہے۔''

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور ان میں سے یقیناً وہ بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔''

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٤﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اُس سے کہ جو تم کر رہے ہو۔''

قساوتِ قلبی کی یہ کیفیت اُس اُمت کے افراد کی بیان کی جا رہی ہے جسے کبھی اہل عالم پر فضیلت عطا کی گئی تھی۔ اس اُمت پر چودہ سو برس ایسے گزرے کہ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا کہ ان کے ہاں کوئی نبی موجود نہ ہو۔ انہیں تین کتابیں دی گئیں۔ لیکن یہ اپنی بدعملی کے باعث قعرِ مذلت میں جا گری۔ عقائد میں ملاوٹ' اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں مین میخ نکال کر اپنے آپ کو بچانے کے راستے نکالنے اور اعمال میں بھی ''کتاب الحیل'' کے ذریعے سے اپنے آپ کو ذمہ داریوں سے مبرا کر لینے کی روش کا نتیجہ پھر یہی نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس انجام بد سے بچائے۔ آمین! "

آیات ۷۵ تا ۸۲

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاۗجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٦﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٧﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِىَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۤ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٠﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗــــــَٔــتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨٢﴾﴾

اب تک ہم نے سورۃ البقرۃ کے آٹھ رکوع اور ان پر مستزاد تین آیات کا مطالعہ مکمل کیا ہے۔ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ خطاب کا سلسلہ سورۃ البقرۃ کے دس رکوعوں پر محیط ہے۔ یہ سلسلہ پانچویں رکوع سے شروع ہوا تھا اور پندرہویں رکوع کے آغاز تک چلے گا۔ اس سلسلۂ خطاب کے بارے میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس میں سے پہلا رکوع دعوت پر مشتمل ہے اور وہ بہت فیصلہ کن ہے' جبکہ اگلے رکوع سے اسلوبِ کلام تبدیل ہو گیا ہے اور تہدید اور دھمکی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ پانچواں رکوع اس پورے سلسلۂ خطاب میں بمنزلہ فاتحہ بہت اہم ہے اور جو بقیہ نو (۹) رکوع ہیں ان کے آغاز و اختتام پر بریکٹ کا انداز ہے کہ دو آیتوں سے بریکٹ شروع ہوتی ہے اور انہی دو آیتوں پر بریکٹ ختم ہوتی ہے' جبکہ پانچویں رکوع کے مضامین اس پورے سلسلۂ خطاب سے ضرب کھا رہے ہیں۔ ان رکوعوں میں بنی اسرائیل کے خلاف ایک مفصل فردِ قرار دادِ جرم عائد کی گئی ہے' جس کے نتیجے میں وہ اُس منصب جلیلہ سے معزول کر دیے گئے جس پر دو ہزار برس سے فائز تھے اور ان کی جگہ پر اب نئی اُمتِ مسلمہ یعنی اُمتِ محمد (ﷺ) کا اس منصب پر تقرر عمل میں آیا اور اس مسند نشینی کی تقریب (Installation Ceremony) کے طور پر تحویلِ قبلہ کا معاملہ ہوا۔ یہ ربطِ کلام اگر سامنے نہ رہے تو انسان قرآن مجید کی طویل سورتوں کو پڑھتے ہوئے کھو جاتا ہے کہ بات کہاں سے چلی تھی اور اب کدھر جا رہی ہے۔

ان نو رکوعوں کے مضامین میں کچھ تو تاریخ بنی اسرائیل کے واقعات بیان ہوئے ہیں کہ تم نے یہ کیا' تم نے یہ کیا! لیکن ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے بعض ایسے عظیم ابدی حقائق اور Universal Truths بیان ہوئے ہیں کہ اُن کا تعلق کسی وقت

سے' کسی قوم سے یا کسی خاص گروہ سے نہیں ہے۔ وہ تو ایسے اصول ہیں جنہیں ہم سنّتُ اللہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کائنات میں ایک تو قوانین طبیعیہ (Physical Laws) ہیں' جبکہ ایک Moral Laws ہیں جو اللہ کی طرف سے اس دنیا میں کارفرما ہیں۔ سورۃ البقرۃ کے زیر مطالعہ نو رکوعوں میں تاریخ بنی اسرائیل کے واقعات کے بیان کے دوران تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایسی آیات آتی ہیں جو اس سلسلۂ کلام کے اندر انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ اُن میں درحقیقت موجودہ اُمتِ مسلمہ کے لیے راہنمائی پوشیدہ ہے۔ مثال کے طور پر اس سلسلۂ خطاب کے دوران آیت ۶۱ میں وارد شدہ یہ الفاظ یاد کیجیے: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے''۔ معلوم ہوا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان اُمت جس پر اللہ کے بڑے فضل ہوئے ہوں' اسے بڑے انعام واکرام سے نوازا گیا ہو' اور پھر وہ اپنی بے عملی یا بدعملی کے باعث اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہو جائے اور ذلتّ و مسکنت اُس پر تھوپ دی جائے۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جو اِن الفاظ میں بیان ہوگئی۔ اُمتِ مسلمہ کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے کہ کیا آج ہم تو اُس مقام پر نہیں پہنچ گئے؟

دوسرا اسی طرح کا مقام گزشتہ آیت (۷۴) میں گزرا ہے' جہاں ایک عظیم ابدی حقیقت بیان ہوئی ہے: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہوگئے اس سب کے بعد' پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں' بلکہ سختی میں ان سے بھی شدید تر ہیں''۔ گویا اسی اُمتِ مسلمہ کا یہ حال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے دل اتنے سخت ہو جائیں کہ سختی میں پتھروں اور چٹانوں کو مات دے جائیں۔ حالانکہ یہ وہی اُمت ہے جس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۴۷﴾ ع ''ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!'' البتہ یہاں ایک بات واضح رہے کہ اس قساوتِ قلبی میں پوری اُمت مبتلا نہیں ہوا کرتی' بلکہ اس کیفیت میں اُمت کے قائدین مبتلا ہو جاتے ہیں اور اُمت مسلمہ کے قائدین اُس کے علماء ہوتے ہیں۔ چنانچہ سب سے زیادہ شدت کے ساتھ یہ خرابی اُن میں در آتی ہے۔ اس لیے کہ باقی لوگ تو پیروکار ہیں' ان کے پیچھے چلتے ہیں' ان پر اعتماد کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب کے پڑھنے والے اور اس کے جاننے والے ہیں۔ لیکن جو لوگ جان بوجھ کر اللہ کی کتاب میں تحریف کر رہے ہوں اور جانتے بوجھتے حق کو پہچان کر اُس کا انکار کر رہے ہوں انہیں تو پتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں! درحقیقت یہ سزا اُن پر آتی ہے۔ یہ بات ان آیات میں جو آج ہم پڑھنے چلے ہیں' بہت زیادہ واضح ہو جائے گی (اِن شاء اللہ)۔ فرمایا:

آیت ۷۵ ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ﴾ ''تو کیا (اے مسلمانو!) تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری بات مان لیں گے؟''

عام مسلمانوں کو یہ توقع تھی کہ یہود دینِ اسلام کی مخالفت نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ مشرکین مکہ تو دینِ توحید سے بہت دُور تھے' رسالت کا ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں تھا' کوئی کتاب ان کے پاس تھی ہی نہیں۔ جبکہ یہود تو اہل کتاب تھے' حاملین تورات تھے' موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے' توحید کے علمبردار تھے اور آخرت کا بھی اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ انہیں تو محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کی دعوت کو جھٹ پٹ مان لینا چاہیے۔ تو مسلمانوں کے دلوں میں یہود کے بارے میں جو حسنِ ظن تھا' یہاں اس کا پردہ چاک کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں بڑی طمع ہے' تمہاری یہ خواہش ہے' آرزو ہے' تمنا ہے' تمہیں توقع ہے کہ یہ تمہاری بات مان لیں گے۔

﴿وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۷۵﴾ ''جبکہ حال یہ ہے کہ ان میں ایک گروہ وہ بھی تھا کہ جو اللہ کا کلام سنتا تھا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کرتا تھا۔''

ظاہر بات ہے وہ گروہ ان کے علماء ہی کا تھا۔ عام آدمی تو اللہ کی کتاب میں تحریف نہیں کر سکتا۔

اب اگلی آیت میں بڑی عجیب بات سامنے آ رہی ہے۔ جس طرح مسلمانوں کے درمیان منافقین موجود تھے اسی طرح یہود میں بھی منافقین تھے۔ یہود میں سے کچھ لوگ ایسے تھے کہ جب ان پر حق منکشف ہو گیا تو اب وہ اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے لیے اپنے خاندان کو' گھر بار کو' اپنے کاروبار کو اور اپنے قبیلے کو چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا' جبکہ قبیلوں کی سرداری اُن کے علماء کے پاس تھی۔ ایسے لوگوں کے دل کچھ کچھ اہل ایمان کے قریب آ چکے تھے۔ ایسے لوگ جب اہل ایمان سے ملتے تھے تو کبھی کبھی وہ باتیں بھی بتا جاتے تھے جو انہوں نے علماءِ یہود سے نبی آخر الزماں ﷺ اور ان کی تعلیمات کے بارے میں سن رکھی تھیں کہ تورات ان کی گواہی دیتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ اپنے ''شیاطین'' یعنی علماء کے پاس جاتے تھے تو وہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے تھے کہ بیوقوفو! یہ کیا کر رہے ہو؟ تم انہیں یہ باتیں بتا رہے ہو تا کہ اللہ کے ہاں جا کر وہ تم پر حجت قائم کریں کہ انہیں پتا تھا اور پھر بھی انہوں نے نہیں مانا!

آیت ۷۶ ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ﴾ ''اور (ان میں سے کچھ لوگ ہیں کہ) جب ملتے ہیں اہل ایمان سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔''

﴿وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ ''اور جب وہ خلوت میں ہوتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ''

﴿قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو کہتے ہیں کیا تم بتا رہے ہو ان کو وہ باتیں جو اللہ نے کھولی ہیں تم پر؟''

﴿لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ﴾ ''تاکہ وہ ان کے ذریعے تم پر حجت قائم کریں تمہارے ربّ کے پاس!''

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۷۶﴾ ''کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟''

تم ذرا عقل سے کام لو اور یہ حقیقتیں جو تورات کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہیں' مسلمانوں کو مت بتاؤ۔ کیا تمہیں عقل نہیں ہے کہ ایسا بیوقوفی کا کام کر رہے ہو؟

ان کے اس مکالمے پر اللہ تعالیٰ کا تبصرہ یہ ہے:

آیت ۷۷ ﴿اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾﴾ ''اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ کو تو معلوم ہے وہ سب کچھ بھی جو وہ چھپاتے ہیں اور وہ سب کچھ بھی جسے وہ ظاہر کرتے ہیں۔''

تم چاہے یہ باتیں مسلمانوں کو بتاؤ یا نہ بتاؤ' اللہ کی طرف سے تو تمہارا محاسبہ ہو کر رہنا ہے۔ لہٰذا یہ بھی ان کی ناسمجھی کی دلیل ہے۔

آیت ۷۸ ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ﴾ ''اور ان میں بعض اَن پڑھ ہیں''

''اُمّی'' کا لفظ قرآن مجید میں اصلاً تو مشرکین عرب کے لیے آتا ہے۔ اس لیے کہ اُن کے اندر پڑھنے لکھنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ کوئی آسمانی کتاب بھی اُن کے پاس نہیں تھی۔ لیکن یہاں یہود کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ان میں سے بھی ایک طبقہ اَن پڑھ لوگوں پر مشتمل ہے۔ جیسے آج مسلمانوں کا حال ہے کہ اکثر و بیشتر جاہل ہیں' ان میں سے بعض اگرچہ پی ایچ ڈی ہوں گے' لیکن انہیں قرآن کی ''ا' ب' ت'' نہیں آتی' دین کے ''مبادی'' تک سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ آج پڑھے لکھے مسلمانوں کی بھی عظیم اکثریت ''پڑھے لکھے جاہلوں'' پر مشتمل ہے۔ جبکہ ہماری اکثریت ویسے ہی بغیر پڑھی لکھی ہے۔ تو اب انہیں دین کا کیا پتا؟ وہ تو سارا اعتماد کریں گے علماء پر! کوئی بریلوی ہے تو بریلوی علماء پر اعتماد کرے گا' کوئی دیوبندی ہے تو دیوبندی علماء پر اعتماد کرے گا' کوئی اہل حدیث ہے تو اہل حدیث علماء پر اعتماد کرے گا۔ اب اُمیوں کا سہارا کیا ہوتا ہے؟

﴿لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ﴾ ''وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے' سوائے بے بنیاد آرزوؤں کے''

ایسے لوگ کتاب سے تو واقف نہیں ہوتے' بس اپنی کچھ خواہشات اور آرزوؤں پر تکیہ کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان خواہشات کا ذکر آگے آ جائے گا۔ یہود کو یہ زعم تھا کہ ہم تو اسرائیلی ہیں' ہم اللہ کے محبوب ہیں اور اس کے بیٹوں کی مانند چہیتے ہیں' ہماری تو شفاعت ہو ہی جائے گی۔ ہمیں تو جہنم میں داخل کیا بھی گیا تو تھوڑے سے عرصے کے لیے کیا جائے گا' پھر ہمیں نکال لیا جائے گا۔ یہ ان کی ''اَمَانِیّ'' ہیں۔ ''اُمْنِیَّۃٌ'' کہتے ہیں بے بنیاد خواہش کو' اَمَانِیّ اس کی جمع ہے۔ اس کی صحیح تعبیر کے لیے انگریزی کا لفظ wishful thinkings ہے۔ یہ اپنی ان بے بنیاد خواہشات اور جھوٹی آرزوؤں کے سہارے جی رہے ہیں' کتاب کا علم ان کے پاس ہے ہی نہیں۔

﴿وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾﴾ ''اور وہ کچھ نہیں کر رہے مگر ظن و تخمین پر چلے جا رہے ہیں۔''

ان کے پاس محض وہم و گمان اور ان کے اپنے من گھڑت خیالات ہیں۔

آیت ۷۹ ﴿فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ۗ﴾ ''پس ہلاکت اور بربادی ہے ان کے لیے جو کتاب لکھتے ہیں اپنے ہاتھ سے۔''

''وَیْل'' کے بارے میں بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ جہنم کا وہ طبقہ ہے جس سے خود جہنم پناہ مانگتی ہے۔

﴿ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ''پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے''

﴿لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ﴾ ''تاکہ حاصل کر لیں اُس کے بدلے حقیر سی قیمت۔''

یعنی لوگ علماءِ یہود سے شرعی مسائل دریافت کرتے تو وہ اپنے پاس سے مسئلے گھڑ کر فتویٰ لکھ دیتے اور لوگوں کو باور کراتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے' یہی دین کا تقاضا ہے۔ اب اس فتویٰ نویسی میں کتنی کچھ واقعتاً انہوں نے صحیح بات کہی' کتنی ہٹ دھرمی سے کام لیا اور کس قدر کسی رشوت پر مبنی کوئی رائے دی' اللہ کے حضور سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ علامہ اقبال نے علماءِ سوء کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا ہے:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

علماءِ یہود کا کردار اسی طرح کا تھا۔

﴿فَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ﴾ ''تو ہلاکت اور بربادی ہے ان کے لیے اس چیز سے کہ جو اُن کے ہاتھوں نے لکھی''

﴿وَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾ ''اور اُن کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے اس کمائی سے جو وہ کر رہے ہیں۔''

یہ فتویٰ فروشی اور دین فروشی کا جو سارا دھندا ہے اس سے وہ اپنے لیے تباہی اور بربادی مول لے رہے ہیں' اس سے اُن کو اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ اب آگے ان کی بعض ''اَمَانِیّ'' کا تذکرہ ہے۔

آیت ۸۰ ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں ہمیں تو آگ ہرگز چھو نہیں سکتی' مگر گنتی کے چند دن۔''

گویا صرف دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ہمیں چند دن کی سزا دے دی جائے گی کہ کوئی اعتراض نہ کر دے کہ ''اے اللہ! ہمیں آگ میں پھینکا جا رہا ہے اور انہیں نہیں پھینکا جا رہا' جبکہ یہ کردار میں ہم سے بھی بدتر تھے''۔ چنانچہ اُن کا منہ بند کرنے کے لیے شاید ہمیں چند دن کے لیے آگ میں ڈال دیا جائے' پھر فوراً نکال لیا جائے گا۔

﴿قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا﴾ ''ان سے کہیے کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے؟'' کیا تمہارا اللہ سے کوئی قول و قرار ہو گیا ہے؟

﴿فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ﴾ ''کہ اب (تمہیں یہ یقین ہے کہ) اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا؟''

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾﴾ ''یا تم اللہ کے ذمے وہ باتیں لگا رہے ہو جنہیں تم نہیں جانتے؟''

حقیقت یہی ہے کہ تم اللہ کی طرف اس بات کی نسبت کر رہے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی فردِ قراردادِ جرم کے دوران گاہ بگاہ جو اہم ترین ابدی حقائق بیان ہو رہے ہیں' ان میں سے ایک عظیم حقیقت اگلی آیت میں آ رہی ہے۔فرمایا:

آیت ۸۱ ﴿بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً﴾ ''کیوں نہیں' جس شخص نے جان بوجھ کر ایک گناہ کمایا''

لیکن اس سے مراد کبیرہ گناہ ہے' صغیرہ نہیں۔سَیِّئَةً کی تنکیر 'تفخیم'' کا فائدہ بھی دے رہی ہے۔

﴿وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـئَتُهٗ﴾ ''اور اس کا گھیراؤ کر لیا اس کے گناہ نے''

مثلاً ایک شخص سودخوری سے باز نہیں آ رہا' باقی وہ نماز کا بھی پابند ہے اور تہجد کا بھی التزام کر رہا ہے تو اس ایک گناہ کی برائی اس کے گرد اس طرح چھا جائے گی کہ پھر اُس کی یہ ساری نیکیاں ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ ہمارے مفسرینؒ نے لکھا ہے کہ گناہ کے احاطہ کر لینے سے مراد یہ ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کر لیں کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو' حتیٰ کہ دل سے ایمان و تصدیق رخصت ہو جائے۔علماء کے ہاں یہ اصول مانا جاتا ہے کہ ''اَلْمَعَاصِیْ بَرِیْدُ الْکُفْرِ'' یعنی گناہ تو کفر کی ڈاک ہوتے ہیں۔گناہ پر مداومت کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ دل سے ایمان رخصت ہو جاتا ہے۔ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے' لیکن اندر سے ایمان ختم ہو چکا ہوتا ہے۔جس طرح کسی دروازے کی چوکھٹ کو دیمک چاٹ جاتی ہے اور اوپر لکڑی کا ایک باریک پرت (veneer) چھوڑ جاتی ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ﴾ ''پس یہی ہیں آگ والے''

﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔''

آیت ۸۲ ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور (اس کے برعکس) جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں''

اب نیک عمل کے بارے میں ہر شخص نے اپنا ایک تصوّر اور نظریہ بنا رکھا ہے۔جبکہ نیک عمل سے قرآن مجید کی مراد دین کے سارے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔محض کوئی خیراتی ادارہ یا کوئی یتیم خانہ کھول دینا یا بیواؤں کی فلاح و بہبود کا انتظام کر دینا اور خود سودی لین دین اور دھوکہ فریب پر مبنی کاروبار ترک نہ کرنا نیکی کا مسخ شدہ تصور ہے۔جبکہ نیکی کا جامع تصوّر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ تمام فرائض کی بجا آوری ہو' دین کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں' اپنے مال اور جان کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد اور مجاہدہ کیا جائے اور اس کے دین کو قائم اور سربلند کرنے کی جدوجہد کی جائے۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ﴾ ''یہی ہیں جنت والے''

﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''وہ اسی میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

آیات ۸۳ تا ۸۶

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ج وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾﴾

آیت ۸۳ ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم نہیں عبادت کرو گے کسی کی سوائے اللہ کے۔''

﴿وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ ''اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو گے''

اللہ کے حق کے فوراً بعد والدین کے حق کا ذکر قرآن مجید میں چار مقامات پر آیا ہے۔اُن میں سے ایک مقام یہ ہے۔

﴿وَّذِی الْقُرْبٰی﴾ ''اور قرابت داروں کے ساتھ بھی (نیک سلوک کرو گے)''

﴿وَالْیَتٰمٰی﴾ ''اور یتیموں کے ساتھ بھی''

﴿وَالْمَسٰكِیْنِ﴾ ''اور محتاجوں کے ساتھ بھی''

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ ''اور لوگوں سے اچھی بات کہو''

امر بالمعروف کرتے رہو۔نیکی کی دعوت دیتے رہو۔

﴿وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط﴾ ''اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو۔''

یہ بنی اسرائیل سے معاہدہ ہو رہا ہے۔

﴿ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ﴾ ''پھر تم (اس سے) پھر گئے سوائے تم میں سے تھوڑے سے لوگوں کے''

﴿وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾﴾ ''اور تم ہو ہی پھر جانے والے۔''

تمہاری یہ عادت گویا طبیعتِ ثانیہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے اس کے علاوہ ایک اور عہد بھی لیا تھا' جس کا ذکر بایں الفاظ کیا جا رہا ہے:

آیت ۸۴ ﴿وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ﴾ ''اور جب ہم نے تم سے یہ عہد بھی لیا تھا کہ''

﴿لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ﴾ ''تم اپنا خون نہیں بہاؤ گے''

یعنی آپس میں جنگ نہیں کرو گے' باہم خون ریزی نہیں کرو گے۔ تم بنی اسرائیل ایک وحدت بن کر رہو گے' تم سب بھائی بھائی بن کر رہو گے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ﴾ (الحُجُرٰت:۱۰)

﴿وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ﴾ ''اور نہ ہی تم نکالو گے اپنے لوگوں کو اُن کے گھروں سے''

﴿ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾﴾ ''پھر تم نے اس کا اقرار کیا تھا مانتے ہوئے۔''

یعنی تم نے اس قول وقرار کو پورے شعور کے ساتھ مانا تھا۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کو فتح کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلا شہر اریحا (Jericko) فتح کیا گیا۔ اس کے بعد جب سارا فلسطین فتح کر لیا تو انہوں نے ایک مرکزی حکومت قائم نہیں کی' بلکہ بارہ قبیلوں نے اپنی اپنی بارہ حکومتیں بنالیں۔ ان حکومتوں کی باہمی آویزش کے نتیجے میں ان کی آپس میں جنگیں ہوتی تھیں اور یہ ایک دوسرے پر حملہ کر کے وہاں کے لوگوں کو نکال باہر کرتے تھے' انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ لیکن اگر ان میں سے کچھ لوگ فرار ہو کر کسی کافر ملک میں چلے جاتے اور کفار انہیں غلام یا قیدی بنا لیتے اور یہ اس حالت میں ان کے سامنے لائے جاتے تو فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا اسرائیلی بھائی اگر کبھی اسیر ہو جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑا لو۔ یہ ان کا جزوی اطاعت کا طرزِ عمل تھا کہ ایک حکم کو تو مانا نہیں اور دوسرے پر عمل ہو رہا ہے۔ اصل حکم تو یہ تھا کہ آپس میں خونریزی مت کرو اور اپنے بھائی بندوں کو ان کے گھروں سے مت نکالو۔ اس حکم کی تو پروا نہیں کی اور اسے توڑ دیا' لیکن اس وجہ سے جو اسرائیلی غلام بن گئے یا اسیر ہو گئے اب ان کو بڑے متقیانہ انداز میں چھڑا رہے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے' شریعت کا حکم ہے۔ یہ ہے وہ تضاد جو مسلمان اُمتوں کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

آیت ۸۵ ﴿ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ ''پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے ہی لوگوں کو قتل بھی کرتے ہو''

﴿وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِیۡقًا مِّنۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِهِمۡ﴾ ''اور اپنے ہی لوگوں میں سے کچھ کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو''

﴿تَظٰهَرُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ﴾ ''اُن پر چڑھائی کرتے ہو گناہ اور ظلم وزیادتی کے ساتھ۔''

﴿وَاِنۡ یَّاۡتُوۡکُمۡ اُسٰرٰی تُفٰدُوۡهُمۡ﴾ ''اور اگر وہ قیدی بن کر تمہارے پاس آئیں تو تم فدیہ دے کر انہیں چھڑاتے ہو''

﴿وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیۡکُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ﴾ ''حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام کیا گیا تھا۔''

اب دیکھئے اس واقعہ سے جو اخلاقی سبق (moral lesson) دیا جا رہا ہے وہ ابدی ہے۔ اور جہاں بھی یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا تاویل عام کے اعتبار سے یہ آیت اس پر منطبق ہو گی۔

﴿اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَتَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ﴾ ''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟''

﴿فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ﴾ ''تو نہیں ہے کوئی سزا اس کی جو یہ حرکت کرے تم میں سے''

﴿اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا﴾ ''سوائے ذلت ورسوائی کے دنیا کی زندگی میں۔''

﴿وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ﴾ ''اور قیامت کے روز وہ لوٹا دیے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف۔''

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔''

یہ ایک بہت بڑی آفاقی سچائی (universal truth) بیان کر دی گئی ہے' جو آج اُمتِ مسلمہ پر صد فی صد منطبق ہو رہی ہے۔ آج ہمارا طرزِ عمل بھی یہی ہے کہ ہم پورے دین پر چلنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر گروہ نے کوئی ایک شے اپنے لیے حلال کر لی ہے۔ ملازمت پیشہ طبقہ رشوت کو اس بنیاد پر حلال سمجھے بیٹھا ہے کہ کیا کریں' اس کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ کاروباری طبقہ کے نزدیک سود حلال ہے کہ اس کے بغیر کاروبار نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ یہ جو طوائفیں ''بازارِ حسن'' سجا کر بیٹھی ہیں وہ بھی کہتی ہیں کہ کیا کریں' ہمارا یہ دھندا ہے' ہم بھی محنت کرتی ہیں' مشقت کرتی ہیں۔ ان کے ہاں بھی نیکی کا ایک تصور موجود ہے۔ چنانچہ محرم کے دنوں میں یہ اپنا دھندا بند کر دیتی ہیں' سیاہ کپڑے پہنتی ہیں اور ماتمی جلوسوں کے ساتھ بھی نکلتی ہیں۔ ان میں سے بعض مزاروں پر دھمال بھی ڈالتی ہیں۔ ان کے ہاں اس طرح کے کام نیکی شمار ہوتے ہیں اور جسم فروشی کو یہ اپنی کاروباری مجبوری سمجھتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں ہر طبقے میں نیکی اور بدی کا ایک امتزاج ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ کُلی اطاعت کا ہے' جزوی اطاعت اس کے ہاں قبول نہیں کی جاتی' بلکہ الٹا منہ پر دے ماری جاتی ہے۔ آج اُمتِ مسلمہ عالمی سطح پر جس ذلت ورسوائی کا شکار ہے اس کی وجہ یہی جزوی اطاعت ہے کہ دین کے ایک حصے کو مانا جاتا ہے اور ایک حصے کو پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے۔ اس طرزِ عمل کی پاداش میں آج ہم ''ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّۃُ وَالۡمَسۡکَنَۃُ'' کا مصداق بن گئے ہیں اور ذلت ومسکنت ہم پر تھوپ دی گئی ہے۔ باقی رہ گیا قیامت کا معاملہ تو وہاں شدید ترین عذاب کی وعید ہے۔ اپنے طرزِ عمل سے تو ہم اُس کے مستحق ہو گئے ہیں' تاہم اللہ تعالیٰ کی رحمت دست گیری فرمالے تو اُس کا اختیار ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''اور اللہ غافل نہیں ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔''

سیٹھ صاحب ہر سال عمرہ فرما کر آ رہے ہیں' لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ یہ عمرے حلال کمائی سے کیے جا رہے ہیں یا حرام سے! وہ تو سمجھتے ہیں کہ ہم نہا دھو کر آ گئے ہیں اور سال بھر جو بھی حرام کمائی کی تھی سب پاک ہو گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ تمہارے کرتوتوں سے ناواقف نہیں ہے۔ وہ تمہاری داڑھیوں سے' تمہارے عماموں سے اور تمہاری عبا اور قبا سے دھوکہ نہیں کھائے گا۔ وہ تمہارے اعمال کا احتساب کر کے رہے گا۔

آیت ۸۶ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا بِالۡاٰخِرَۃِ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی اختیار کر لی ہے

آخرت کو چھوڑ کر۔‘‘

﴿فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾﴾ ’’سو اب نہ تو اُن سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی اُن کی کوئی مدد کی جائے گی۔‘‘

آیات ۸۷ تا ۹۶

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ؗ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤی اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ ؗ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾

آیت ۸۷ ﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ﴾ ’’اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی‘‘ (یعنی تورات)

﴿وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ؗ﴾ ’’اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔‘‘

ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ یہاں لفظ ’’الرُّسُل‘‘ انبیاء کے معنی میں آیا ہے۔ نبی اور رسول میں کچھ فرق ہے‘ اسے اختصار کے ساتھ سمجھ لیجیے۔ قرآن مجید کی اصطلاحات کے تین جوڑے ایسے ہیں کہ وہ تینوں مترادف کے طور پر بھی استعمال ہو جاتے ہیں اور اپنا علیحدہ علیحدہ مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ ان کے ضمن میں علماء کرام نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ ’’اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا‘‘ یعنی جب (ایک جوڑے کے) دونوں لفظ اکٹھے استعمال ہوں گے تو دونوں کا مفہوم مختلف ہوگا‘ اور جب یہ دونوں الگ الگ استعمال ہوں گے تو ایک معنی میں استعمال ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک جوڑا ’’اسلام‘‘ اور ’’ایمان‘‘ یا ’’مسلم‘‘ اور ’’مؤمن‘‘ کا ہے۔ عام طور پر مسلم کی جگہ مؤمن اور مؤمن کی جگہ مسلم استعمال ہو جاتا ہے‘ لیکن سورۃ الحجرات میں یہ دونوں الفاظ اکٹھے استعمال ہوئے ہیں تو ان کا فرق واضح ہو گیا ہے۔ فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا......﴾ (آیت ۱۴) ’’بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو‘ البتہ یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے......‘‘ اسی طرح ’’جہاد‘‘ اور ’’قتال‘‘ کا معاملہ ہے۔ یہ دو مختلف الفاظ ہیں‘ جن کا مفہوم جدا بھی ہے لیکن ایک دوسرے کی جگہ بھی آ جاتے ہیں۔

اس ضمن میں تیسرا جوڑا ’’نبی‘‘ اور ’’رسول‘‘ کا ہے۔ یہ دونوں لفظ بھی اکثر ایک دوسرے کی جگہ آ جاتے ہیں‘ لیکن ان میں فرق بھی ہے۔ ہر نبی رسول نہیں ہوتا‘ البتہ ہر رسول لازماً نبی ہوتا ہے۔ یعنی نبی عام ہے رسول خاص ہے۔ نبی کو جب کسی خاص قوم کی طرف معین طور پر بھیج دیا جاتا ہے تب اس کی حیثیت رسول کی ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے اُس کی حیثیت انتہائی اعلیٰ مرتبہ پر فائز ایک ولی اللہ کی ہے‘ جس پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ عام ولی اللہ میں اور نبی میں فرق یہی ہے کہ نبی پر وحی آتی ہے‘ ولی پر وحی نہیں آتی۔ لیکن کسی نبی کو جب کسی معین قوم کی طرف مبعوث کر دیا جاتا تھا تو پھر وہ رسول ہوتا تھا۔ جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حکم دیا گیا: ﴿اِذْهَبَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾﴾ (طٰہٰ) ’’تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ‘ یقیناً وہ سرکشی پر اتر آیا ہے‘‘۔ اسی طرح دوسرے رسولوں کے بارے میں آیا ہے کہ وہ اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے۔ مثلاً ﴿وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا﴾ (الاعراف: ۸۵) ’’اور مدین کی طرف بھیجا ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو‘‘۔ یہ فرق ہے نبی اور رسول کا۔ محض سمجھانے کے لیے بطور مثال عرض کر رہا ہوں کہ جیسے آپ کے یہاں خصوصی تربیت یافتہ افراد پر مشتمل CSP cadre ہے‘ ان میں سے کوئی ڈپٹی کمشنر لگا دیا جاتا ہے‘ کسی کو جائنٹ سکریٹری کی ذمہ داری تفویض کی جاتی ہے‘ تو کوئی بطور O.S.D خدمات انجام دیتا ہے‘ لیکن اس کا کاڈر (CSP) برقرار رہتا ہے۔ اسی اعتبار سے ہر نبی ہر حال میں نبی ہوتا تھا‘ لیکن اُسے ’’رسول‘‘ کی حیثیت سے ایک اضافی ذمہ داری اور اضافی مرتبہ عطا کیا جاتا تھا۔

نبی اور رسول کے فرق کے ضمن میں ایک بات یہ نوٹ کر لیجیے کہ نبیوں کو قتل بھی کیا گیا ہے‘ جبکہ رسول قتل نہیں ہو سکتے۔ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ ﴿لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ﴾ (المُجادلۃ: ۲۱) ’’لازماً غالب رہیں گے میں اور میرے رسول‘‘۔ چنانچہ جب بھی کسی قوم نے کسی رسولؑ کی جان لینے کی کوشش کی تو اس قوم کو ہلاک کر دیا گیا اور رسولؑ اور اُس کے ساتھیوں کو بچا لیا گیا۔ لیکن یہ معاملہ نبیوں کے ساتھ نہیں ہوا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نبی تھے‘ قتل کر دیے گئے‘ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے‘ لہٰذا قتل نہیں کیے جا سکتے تھے‘ ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا‘ جو قیامت سے قبل دوبارہ زمین پر نزول فرمائیں گے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے راستے میں شہید ہونے کی شدید تمنا تھی۔ آپؐ نے اپنی اس تمنا اور آرزو کا اظہار اِن الفاظ میں فرمایا ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَاُقْتَلَ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ

اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ)) (۹)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میری بڑی خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں تو اس میں قتل کر دیا جاؤں' پھر میں زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر میں زندہ کیا جاؤں' پھر اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر میں زندہ کیا جاؤں' پھر اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں!''

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی یہ خواہش پوری نہیں کی۔ اس لیے کہ آپؐ اللہ کے رسول تھے۔ آیت زیر مطالعہ میں نوٹ کیجیے کہ اگرچہ یہاں لفظ رسول آ گیا ہے لیکن یہ نبی کے معنی میں آیا ہے: ﴿وَقَفَّیۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ بِالرُّسُلِ ۫﴾ ''اور ہم نے موسیٰؑ کے بعد لگاتار پیغمبر بھیجے''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں' درمیان میں جو پیغمبر (prophets) ہیں یہ سب انبیاء ہیں۔

﴿وَاٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ﴾ ''اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بڑی واضح نشانیاں دیں''

حسّی معجزات جس قدر حضرت مسیح علیہ السلام کو دیے گئے ویسے اور کسی نبی کو نہیں دیے گئے۔ ان کا تذکرہ آگے چل کر سورۂ آل عمران میں آئے گا۔

﴿وَاَیَّدۡنٰہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ﴾ ''اور ہم نے مدد کی ان کی روح القدس کے ساتھ۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت جبرائیلؑ کی خاص تائید ونصرت حاصل تھی۔ معجزات کا ظہور کسی نبی یا رسول کی اپنی طاقت سے نہیں ہوتا' اسی طرح کرامت کسی ولی اللہ کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی' یہ معاملہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کا ظہور فرشتوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

﴿اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ۚ﴾ ''پھر بھلا کیا جب بھی آیا تمہارے پاس کوئی رسول وہ چیز لے کر جو تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف تھی تو تم نے تکبر کیا۔''

انبیاء ورُسل علیہم السلام کے ساتھ یہود نے جو طرزِ عمل روا رکھا' خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ کیا' یہاں اس پر تبصرہ ہو رہا ہے کہ جب بھی کبھی تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر آیا تو تمہاری روش یہی رہی کہ تم نے استکبار کیا اور سرکشی کی' وہی استکبار اور سرکشی جس کے باعث عزازیل ابلیس بن گیا تھا۔

﴿فَفَرِیۡقًا کَذَّبۡتُمۡ ۫ وَفَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''پھر ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کر دیا۔''

اللہ کے رسول چونکہ قتل نہیں ہو سکتے لہٰذا یہاں نبیوں کا قتل مراد ہے۔ مزید برآں ایک رائے یہ بھی دی گئی ہے کہ یہاں ماضی کا صیغہ ''قَتَلۡتُمۡ'' نہیں آیا' بلکہ فعل مضارع ''تَقۡتُلُوۡنَ'' آیا ہے اور مضارع کے اندر فعل جاری رہنے کی خاصیت ہوتی ہے۔ گویا تم ان کو قتل کرنے کی کوشش کرتے رہے' بعض رسولوں کی تو جان کے در پے ہو گئے۔

آیت ۸۸ ﴿وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ﴾ ''اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل تو غلافوں میں بند ہیں۔''

ان کے اس جواب کو آیت ۷۵ کے ساتھ ملایئے جو ہم پڑھ آئے ہیں۔ وہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ﴾ ''تو اے مسلمانو! کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری بات مان لیں گے؟'' بعض مسلمانوں کی اس خواہش کے جواب میں یہود کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ہمارے دل تو غلافوں میں محفوظ ہیں' تمہاری بات ہم پر اثر نہیں کر سکتی۔ اس طرح کے الفاظ آپ کو آج بھی سننے کو مل جائیں گے کہ ہمارے دل بڑے محفوظ ہیں' بڑے مضبوط اور مستحکم ہیں' تمہاری بات ان میں گھر کر ہی نہیں سکتی۔

﴿بَلۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ﴾ ''بلکہ (حقیقت میں تو) اُن پر لعنت ہو چکی ہے اللہ کی طرف سے ان کے کفر کی وجہ سے''

یہ ان کے اس قول پر تبصرہ ہے کہ ہمارے دل محفوظ ہیں اور غلافوں میں بند ہیں۔

﴿فَقَلِیۡلًا مَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''پس اب کم ہی (ہوں گے ان میں سے جو) ایمان لائیں گے۔''

آیت ۸۹ ﴿وَلَمَّا جَآءَہُمۡ کِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ﴾ ''اور جب آ گئی ان کے پاس ایک کتاب (یعنی قرآن) اللہ کے پاس سے''

﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَہُمۡ ۙ﴾ ''جو اُس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اُن کے پاس (پہلے سے موجود) ہے''

یہ وضاحت قبل ازیں کی جا چکی ہے کہ قرآن کریم ایک طرف تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے اور دوسری طرف وہ تورات اور انجیل کی پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر آیا ہے۔

﴿وَکَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَی الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ۚ﴾ ''اور وہ پہلے سے کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔''

ان کا حال یہ تھا کہ وہ اس کی آمد سے پہلے اللہ کی آخری کتاب اور آخری نبی ﷺ کے حوالے اور واسطے سے اللہ تعالیٰ سے کافروں کے خلاف فتح ونصرت کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ یہود کے تین قبائل بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ مدینہ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ وہاں اوس اور خزرج کے قبائل بھی آباد تھے جو یمن سے آئے تھے اور اصل عرب قبائل تھے۔ پھر آس پاس کے قبائل بھی تھے۔ وہ سب ''اُمیین'' میں سے تھے' اُن کے پاس نہ کوئی کتاب تھی' نہ کوئی شریعت اور نہ وہ کسی نبوت سے آگاہ تھے۔ ان کی جب آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں تو یہودی چونکہ سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے بزدل تھے لہٰذا ہمیشہ مار کھاتے تھے۔ اس پر وہ کہا کرتے تھے کہ ابھی تو تم ہمیں مار لیتے ہو' دبا لیتے ہو' نبی آخر الزمان (ﷺ) کے آنے کا وقت آ چکا ہے جو نئی کتاب لے کر آئیں گے۔ جب وہ آئیں گے اور ہم ان کے ساتھ ہو کر جب تم سے جنگ کریں گے تو تم ہمیں شکست نہیں دے سکو گے' ہمیں فتح پر فتح حاصل ہو گی۔ وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس نبی آخر الزمان کا ظہور جلدی ہوتا کہ اُس کے واسطے سے اور اُس کے صدقے ہمیں فتح مل سکے۔

خزرج اور اوس کے قبائل نے یہود کی یہ دعائیں اور ان کی زبان سے نبی آخر الزمان ﷺ کی آمد کی پیشین گوئیاں سن رکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۱ نبوی کے حج کے موقع پر جب مدینہ سے جانے والے خزرج کے چھ افراد کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت پیش کی تو انہوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا کہ معلوم ہوتا ہے یہ وہی نبیؐ ہیں جن کا یہودی ذکر کرتے ہیں' تو

اس سے پہلے کہ یہود ان پر ایمان لائیں' تم ایمان لے آؤ! اس طرح وہ علم جو بالواسطہ طور پر ان تک پہنچا تھا ان کے لیے ایک عظیم سرمایہ اور ذریعۂ نجات بن گیا۔ مگر وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے' آپ ﷺ کی آمد پر اپنے تعصب اور تکبر کی وجہ سے آپؐ کے سب سے بڑھ کر مخالف بن گئے۔

﴿فَلَمَّا جَآءَ هُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ﴾ ''پھر جب ان کے پاس آ گئی وہ چیز جسے انہوں نے پہچان لیا تو وہ اس کے منکر ہو گئے۔''

﴿فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۸۹﴾﴾ ''پس اللہ کی لعنت ہے ان منکرین پر۔''

آیت ۹۰ ﴿بِئۡسَمَا اشۡتَرَوۡا بِهٖۤ اَنۡفُسَهُمۡ﴾ ''بہت بُری شے ہے جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو فروخت کر دیا''

یعنی دنیا کا حقیر سا فائدہ' یہاں کی حقیر سی منفعتیں' یہاں کی مسندیں اور چودھراہٹیں ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہیں اور وہ اپنی فلاح وسعادت اور نجات کی خاطر ان حقیر سی چیزوں کی قربانی دینے کو تیار نہیں ہیں۔

﴿اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ﴾ ''کہ وہ انکار کر رہے ہیں اُس ہدایت کا جو اللہ نے نازل کی ہے''

﴿بَغۡيًا اَنۡ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ﴾ ''صرف اس ضد کی بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نازل فرماتا ہے اپنے فضل (وحی ورسالت) میں سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔''

یہود اس امید میں تھے کہ آخری نبی بھی اسرائیلی ہی ہو گا' اس لیے کہ چودہ سو برس تک نبوت ہمارے پاس رہی ہے' یہ ''فترۃ'' کا زمانہ ہے' جسے چھ سو برس گزر گئے' اب آخری نبی آنے والے ہیں۔ ان کو یہ گمان تھا کہ وہ بنی اسرائیل ہی میں سے ہوں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت اور یہ فضل بنی اسماعیل پر ہو گیا۔ اس ضدم ضدا کی وجہ سے یہود عناد اور سرکشی پر اتر آئے۔ اس ''بَغۡيًا'' کے لفظ کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ دین میں جو اختلاف ہوتا ہے اس کا اصل سبب یہی ضدم ضدا والا رویہ ہوتا ہے' جسے قرآن مجید میں ''بَغۡيًا'' کہا گیا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں کئی بار آیا ہے۔

عہدِ حاضر میں علم نفسیات (Psychology) میں ایڈلر کے مکتبہ فکر کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کے جبلی افعال (instincts) اور محرکات (motives) میں ایک نہایت طاقتور محرک غالب ہونے کی طلب (Urge to dominate) ہے۔ چنانچہ کسی دوسرے کی بات ماننا نفسِ انسانی پر بہت گراں گزرتا ہے' وہ چاہتا ہے کہ میری بات مانی جائے! ''بَغۡيًا'' کے معنی بھی حد سے بڑھنے اور تجاوز کرنے کے ہیں۔ دوسروں پر غالب ہونے کی خواہش میں انسان اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ یہی معاملہ یہود کا تھا کہ انہوں نے دوسروں پر رعب گانٹھنے کے لیے ضدم ضدا کی روش اختیار کی' محض اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کے ایک شخص محمد عربی ﷺ کو اپنے فضل سے نواز دیا۔

﴿فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ ''تو وہ لوٹے غضب پر غضب لے کر۔''
یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے۔

﴿وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۹۰﴾﴾ ''اور ایسے کافروں کے لیے سخت ذلت آمیز عذاب ہے۔''

''مُهِيۡنٌ'' اہانت سے بنا ہے۔ ان کی اس روش کی وجہ سے ان کے لیے اہانت آمیز عذاب مقرر ہے۔

آیت ۹۱ ﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ اس پر جو اللہ نے نازل فرمایا ہے''

﴿قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا﴾ ''تو کہتے ہیں ہم ایمان رکھتے ہیں اُس پر جو ہم پر نازل ہوا''

﴿وَيَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ﴾ ''اور وہ کفر کر رہے ہیں اس کا جو اس کے پیچھے ہے۔''

چنانچہ انہوں نے پہلے انجیل کا کفر کیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو نہیں مانا' اور اب انہوں نے محمد ﷺ کا کفر کیا ہے اور قرآن کو نہیں مانا۔

﴿وَهُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ﴾ ''حالانکہ وہ حق ہے' تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے اس کی جو اُن کے پاس ہے۔''

﴿قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ﴾ ''(اے نبیؐ! ان سے) کہیے: تو پھر تم کیوں قتل کرتے رہے ہو اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے؟''

﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۱﴾﴾ ''اگر تم واقعتاً ایمان رکھنے والے ہو!''

اگر تم ایسے ہی حق پرست ہو اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان رکھنے والے ہو تو تم اُن پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے؟ تم نے زکریا علیہ السلام کو کیوں قتل کیا؟ یحییٰ علیہ السلام کو کیوں قتل کیا؟ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی پلاننگ کیوں کی؟ تمہارے تو ہاتھ نبیوں کے خون سے آلودہ ہیں اور تم دعوے دار ہو ایمان کے!

آیت ۹۲ ﴿وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ﴾ ''اور آ چکے تمہارے پاس موسیٰؑ صریح معجزے اور واضح تعلیمات لے کر''

﴿ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ﴾ ''پھر تم نے اُس کی غیر حاضری میں بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا''

﴿وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۹۲﴾﴾ ''اور تم ظالم ہو۔''

آیت ۹۳ ﴿وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور تمہارے اوپر کوہِ طور کو معلق کر دیا تھا۔''

﴿خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاسۡمَعُوۡا﴾ ''پکڑو اس کو جو ہم نے تم کو دیا ہے مضبوطی کے ساتھ اور سنو!''

ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔

﴿قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا﴾ ''انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔''

یعنی ہم نے سن تو لیا ہے' مگر مانیں گے نہیں! قومِ یہود کی یہ بھی ایک دیرینہ بیماری تھی کہ زبان کو ذرا سا مروڑ کر الفاظ کو اس طرح بدل دیتے تھے کہ بات کا مفہوم ہی یکسر بدل جائے۔ چنانچہ ''سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا'' کے بجائے ''سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا'' کہتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو منافقین تھے ان کا بھی یہی وطیرہ تھا۔ ان کی جب سرزنش کی جاتی تو کہتے تھے کہ ہم نے تو کہا تھا

''سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا'' آپ کی اپنی سماعت میں کوئی خلل ہوگا۔

﴿وَ اُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡعِجۡلَ بِکُفۡرِهِمۡ ؕ﴾ ''اور پلا دی گئی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت ان کے اس کفر کی پاداش میں۔''

﴿قُلۡ بِئۡسَمَا یَاۡمُرُکُمۡ بِهٖۤ اِیۡمَانُکُمۡ﴾ ''کہیے: بہت ہی بُری ہیں یہ باتیں جن کا حکم دے رہا ہے تمہیں تمہارا ایمان''

﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (۹۳)﴾ ''اگر تم مؤمن ہو!''

یہ عجیب ایمان ہے جو تمہیں ایسی بُری حرکات کا حکم دیتا ہے۔ کیا ایمان کے ساتھ ایسی حرکتیں ممکن ہوتی ہیں؟

آگے پھر ایک بہت اہم آفاقی سچائی (universal truth) کا بیان ہو رہا ہے' جس کو پڑھتے ہوئے خود دروں بینی (introspection) کی ضرورت ہے۔ یہود کو یہ زعم تھا کہ ہم تو اللہ کے بڑے چہیتے ہیں' لاڈلے ہیں' اس کے بیٹوں کی مانند ہیں' ہم اولیاء اللہ ہیں' ہم اس کے پسندیدہ اور چنیدہ لوگ ہیں' لٰہذا آخرت کا گھر ہمارے ہی لیے ہے۔ چنانچہ ان کے سامنے ایک لٹمس ٹیسٹ (litmus test) رکھا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ یہ ٹیسٹ میرے اور آپ کے لیے بھی ہے۔

آیت ۹۴ ﴿قُلۡ اِنۡ کَانَتۡ لَکُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ عِنۡدَ اللّٰهِ خَالِصَۃً مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ﴾ ''(اے نبیؐ! ان سے) کہیے: اگر تمہارے لیے آخرت کا گھر اللہ کے پاس خالص کر دیا گیا ہے دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر''

یعنی تمہارے لیے جنت مخصوص (reserve) ہو چکی ہے اور تم مرتے ہی جنت میں پہنچا دیے جاؤ گے۔

﴿فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (۹۴)﴾ ''تب تو تمہیں موت کی تمنا کرنی چاہیے اگر تم (اپنے اس خیال میں) سچے ہو۔''

اگر تمہیں جنت میں داخل ہونے کا اتنا ہی یقین ہے پھر تو دنیا میں رہنا تم پر گراں ہونا چاہیے۔ یہاں تو بہت سی کلفتیں ہیں' یہاں تو انسان کو بڑی مشقت اور شدید کوفت اٹھانی پڑ جاتی ہے۔ جس شخص کو یہ یقین ہو کہ اس دنیا کے بعد آخرت کی زندگی ہے اور وہاں میرا مقام جنت میں ہے تو اسے یہ زندگی اثاثہ (asset) نہیں' ذمہ داری (liability) معلوم ہونی چاہیے۔ اسے تو دنیا قید خانہ نظر آنی چاہیے' جیسے حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّنۡیَا سِجۡنُ الۡمُؤۡمِنِ وَجَنَّۃُ الۡکَافِرِ))[۱۰] ''دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے''۔ اگر کسی شخص کا آخرت پر ایمان ہے اور اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ خلوص پر مبنی ہے نہ کہ دھوکہ بازی پر تو اس کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ اسے دنیا میں زیادہ دیر تک زندہ رہنے کی آرزو تو نہ ہو۔ اس کا جائزہ ہر شخص خود لگا سکتا ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِهٖ بَصِیۡرَۃٌ (۱۴)﴾ (القیٰمۃ) ''بلکہ آدمی اپنے لیے آپ دلیل ہے''۔ ہر انسان کو خوب معلوم ہے کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ آپ کا دل آپ کو بتا دے گا کہ آپ اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں یا آپ کا معاملہ خلوص و اخلاص پر مبنی ہے۔ اگر واقعتاً خلوص اور اخلاص والا معاملہ ہے تو پھر تو یہ کیفیت ہونی چاہیے جس کا نقشہ اس حدیث نبویؐ میں کھینچا گیا ہے: ((کُنۡ فِی الدُّنۡیَا کَاَنَّکَ غَرِیۡبٌ اَوۡ عَابِرُ سَبِیۡلٍ))[۱۱] ''دنیا میں اس طرح رہو گویا تم اجنبی ہو یا مسافر ہو''۔ پھر تو یہ دنیا باغ نہیں قید خانہ نظر آنی چاہیے' جس میں انسان مجبوراً رہتا ہے۔ پھر زاویۂ نگاہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے' لٰہذا ایک معین مدت کے لیے یہاں رہنا ہے اور جو ذمہ داریاں اس کی طرف عائد کی گئی ہیں وہ ادا کرنی ہیں۔ لیکن اگر یہاں رہنے کی خواہش دل میں موجود ہے تو پھر یا تو آخرت پر ایمان نہیں یا اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ خلوص و اخلاص پر مبنی نہیں۔ یہ گویا لٹمس ٹیسٹ ہے۔

آیت ۹۵ ﴿وَلَنۡ یَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًا﴾ ''اور یہ ہرگز آرزو نہیں کریں گے موت کی''

﴿بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ ؕ﴾ ''بسبب اُن کرتوتوں کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہوئے ہیں۔''

ہر شخص کو خود معلوم ہے کہ میں نے کیا کمائی کی ہے' کیا آگے بھیجی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ (۹۵)﴾ ''اور اللہ ان ظالموں سے بخوبی واقف ہے۔''

آیت ۹۶ ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ ۚ﴾ ''اور تم انہیں پاؤ گے تمام انسانوں سے زیادہ حریص اس (دنیا کی) زندگی پر۔''

﴿وَمِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا ۚ﴾ ''حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی زیادہ حریص۔''

یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ مشرکین نے اہل ایمان کے ساتھ مقابلہ کیا تو کھل کر کیا' میدان میں آ کر ڈٹ کر کیا' اپنی جانیں اپنے باطل معبودوں کے لیے قربان کیں' جبکہ یہودیوں میں یہ ہمت و جرأت قطعاً نہیں تھی کہ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ سکیں۔ ان کے بارے میں سورۃ الحشر میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لَا یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ جَمِیۡعًا اِلَّا فِیۡ قُرًی مُّحَصَّنَۃٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ (آیت ۱۴) ''یہ سب مل کر بھی تم سے جنگ نہ کر سکیں گے مگر قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی اوٹ سے''۔ چنانچہ یہود کبھی بھی سامنے آ کر مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ اس لیے کہ انہیں اپنی جانیں بہت عزیز تھیں۔

﴿یَوَدُّ اَحَدُهُمۡ لَوۡ یُعَمَّرُ اَلۡفَ سَنَۃٍ ۚ﴾ ''ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ کسی طرح اس کی عمر ہزار برس ہو جائے۔''

﴿وَمَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ یُّعَمَّرَ ؕ﴾ ''حالانکہ نہیں ہے اس کو بچانے والا عذاب سے اس قدر جینا۔''

اگر ان کو ان کی خواہش کے مطابق طویل زندگی دے بھی دی جائے تو یہ انہیں عذاب سے تو چھٹکارا نہیں دلا سکے گی۔ آخرت تو بالآخر آنی ہے اور انہیں ان کے کرتوتوں کی سزا مل کر رہنی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ (۹۶)﴾ ''اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔''

آیات ۹۷ تا ۱۰۳

﴿قُلۡ مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِیۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلۡبِکَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ وَهُدًی وَّبُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (۹۷) مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبۡرِیۡلَ وَمِیۡکٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ

لِّلْکٰفِرِیْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ ۢ بَیِّنٰتٍ ۚ وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَکُلَّمَا عٰھَدُوْا عَھْدًا نَّبَذَہٗ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ ۭ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ ڎ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَاۗءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ فَلَا تَکْفُرْ ۭ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ ۭ وَمَا ھُمْ بِضَاۗرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ۭ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىہُ مَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِہٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَۃٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ خَیْرٌ ۭ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾﴾

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے' محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت یہود کے لیے بہت بڑی آزمائش ثابت ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ آخری نبوت کا وقت قریب ہے اور یہ نبی بھی حسب سابق بنی اسرائیل میں سے مبعوث ہوگا۔ لیکن نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت بنی اسماعیل میں سے ہوگئی۔ یہود جس احساسِ برتری کا شکار تھے اس کی رو سے وہ بنی اسماعیل کو حقیر سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ اُمّی لوگ ہیں' اَن پڑھ ہیں' ان کے پاس نہ کوئی کتاب ہے نہ شریعت ہے اور نہ کوئی قانون اور ضابطہ ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن میں سے ایک شخص کو کیسے چن لیا؟ ان کا خیال تھا کہ یہ سب جبرائیل کی ''شرارت'' ہے کہ وہ وحی لے کر محمد عربی (ﷺ) کے پاس چلا گیا۔ لہٰذا وہ حضرت جبرائیل کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے اور انہیں گالیاں دیتے تھے۔

یہ بات شاید آپ کو بڑی عجیب لگے کہ اہل تشیع میں سے فرقہ ''غرابیہ'' کا عقیدہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنے مکاتیب میں اس فرقے کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کی ارواح ایک دوسرے کے بالکل ایسے مشابہ تھیں جیسے ایک غرابؔ (کوا) دوسرے غراب کے مشابہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت جبرائیلؑ دھوکہ کھا گئے۔ اللہ نے تو وحی بھیجی تھی حضرت علیؓ کے پاس' لیکن وہ لے گئے حضرت محمد ﷺ کے پاس۔ یہود کے ہاں یہ عقیدہ موجود تھا کہ اللہ نے تو جبرائیل (علیہ السلام) کو بنی اسرائیل میں سے کسی کے پاس بھیجا تھا' لیکن وہ محمد (ﷺ) کے پاس چلے گئے' اور یہی مفروضہ ان کی حضرت جبرائیلؑ سے دشمنی کی بنیاد تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ((لَیَاْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ مَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَاءِیْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))[12] ''میری اُمت پر بھی وہ تمام احوال لازماً وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر وارد ہوئے تھے' جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے''۔ چنانچہ اُمتِ مسلمہ میں سے کسی فرقے کا اس طرح کے عقائد اپنا لینا کچھ بعید نہیں ہے۔ اس سے اس حدیث کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔

آیت ۹۷ ﴿قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ﴾ ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے جو کوئی بھی دشمن ہو جبرائیلؑ کا''

﴿فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ ''تو (وہ یہ جان لے کہ) اُس نے تو نازل کیا ہے اس قرآن کو آپؐ کے دل پر اللہ کے حکم سے''۔

اس معاملے میں جبرائیلؑ کو تو کچھ اختیار حاصل نہیں۔ فرشتے جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے حکم سے کرتے ہیں' اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرتے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ﴾ ''یہ تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے اُس کلام کی جو اس کے سامنے موجود ہے''

﴿وَھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۷﴾﴾ ''اور ہدایت اور بشارت ہے اہل ایمان کے لیے''۔

اس کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ' اس کے رسولؐ اور اُس کے ملائکہ سب ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) کی حیثیت رکھتے ہیں' یہ ایک جماعت ہیں' ان میں کوئی اختلاف یا افتراق نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی جبرائیلؑ کا دشمن ہے تو وہ اللہ کا دشمن ہے' اور اگر کوئی اللہ کے سچے رسولؐ کا دشمن ہے تو وہ اللہ کا بھی دشمن ہے اور جبرائیلؑ کا بھی دشمن ہے۔

آیت ۹۸ ﴿مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ وَمَلٰۗىِٕکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکٰىلَ فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لِّلْکٰفِرِیْنَ ﴿۹۸﴾﴾ ''(تو کان کھول کر سن لو) جو کوئی بھی دشمن ہے اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبرائیل اور میکائیل کا تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اعلان ہے کہ) اللہ ایسے کافروں کا دشمن ہے''۔

آیت ۹۹ ﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ ۢ بَیِّنٰتٍ ۚ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپؐ کی طرف نازل کر دی ہیں روشن آیات''۔

﴿وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾﴾ ''اور انکار نہیں کرتے ان کا مگر وہی جو سرکش ہیں''۔

یاد کیجیے سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع میں یہ الفاظ آئے تھے: ﴿وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''اور وہ گمراہ نہیں کرتا اس کے ذریعے سے مگر فاسقوں کو''۔

آیت ۱۰۰ ﴿اَوَکُلَّمَا عٰھَدُوْا عَھْدًا﴾ ''تو کیا (ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا ہے کہ) جب کبھی بھی انہوں نے کوئی عہد کیا'' اللہ سے کوئی میثاق کیا یا اللہ کے رسولوں سے کوئی عہد کیا۔

﴿نَّبَذَہٗ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ ۭ﴾ ''ان میں سے ایک گروہ نے اسے اٹھا کر پھینک دیا''۔

﴿بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾ ''بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو یقین نہیں رکھتے''۔

ان کی اکثریت ایمان و یقین کی دولت سے تہی دامن ہے۔

یہی حال آج اُمتِ مسلمہ کا ہے کہ مسلمان تو سب ہیں' لیکن ایمانِ حقیقی' ایمانِ قلبی یعنی یقین والا ایمان کتنے لوگوں کو حاصل ہے؟ ع ''ڈھونڈ اب ان کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر!''

آیت ۱۰۱ ﴿وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ﴾ ''اور جب آیا اُن کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول (یعنی

محمد ﷺ)''

﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ ''تصدیق کرنے والا اُس کتاب کی جو ان کے پاس موجود ہے''

﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ ''تو اہل کتاب میں سے ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا''

﴿كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں۔''

علماءِ یہود نے نبی آخر الزمان ﷺ کی آمد کی پیشین گوئیاں چھپانے کی خاطر خود تورات کو پس پشت ڈال دیا اور بالکل انجانے سے ہو کر رہ گئے۔ ان کے عوام پوچھتے ہوں گے کہ کیا یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر تم کیا کرتے تھے؟ لیکن یہ جواب میں کہتے کہ یقین سے نہیں کہہ سکتے‘ ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو! انہوں نے ایسا رویہ اپنا لیا جیسے انہیں کچھ علم نہیں ہے۔

اب ایک اور حقیقت نوٹ کیجیے۔ جب کسی مسلمان اُمت میں دین کی اصل حقیقت اور اصل تعلیمات سے بُعد پیدا ہوتا ہے تو لوگوں کا رجحان جادو‘ ٹونے‘ ٹوٹکے‘ تعویذ اور عملیات وغیرہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اللہ کی کتاب تو ہدایت کا سرچشمہ بن کر اُتری تھی‘ لیکن یہ اُس کو اپنی دُنیوی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بناتے ہیں۔ چنانچہ دشمن کو زیر کرنے اور محبوب کو قدموں میں گرانے کے لیے ''عملیاتِ قرآنی'' کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ دھندے ہمارے ہاں بھی خوب چل رہے ہیں اور شاید سب سے زیادہ منفعت بخش کاروبار یہی ہے‘ جس میں نہ تو کوئی محنت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی سرمایہ کاری کی۔ بنی اسرائیل کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دین کی اصل حقیقت کو چھوڑ کر جادو کے پیچھے چل پڑے تھے۔ فرمایا:

آیت ۱۰۲ ﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ﴾ ''انہوں نے پیروی کی اُس علم کی جو شیاطین پڑھا کرتے تھے سلیمانؑ کی بادشاہت کے وقت''

اللہ تعالیٰ نے جنات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا تھا۔ اُس وقت چونکہ ان کا انسانوں کے ساتھ زیادہ میل جول رہتا تھا‘ لہٰذا یہ انسانوں کو جادو وغیرہ سکھاتے رہتے تھے۔

﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''اور سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا‘ بلکہ یہ تو شیاطین تھے جو کفر کرتے تھے''

﴿يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ﴾ ''وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔''

جادو کفر ہے‘ لیکن آپ کو آج بھی ''نقشِ سلیمانی'' کی اصطلاح سننے کو ملے گی۔ اس طرح بعض مسلمان بھی ان چیزوں کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر رہے ہیں اور وہ ظلم اب بھی جاری ہے۔

﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ﴾ ''اور (وہ اُس علم کے پیچھے پڑے) جو نازل کیا گیا دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر بابل میں۔''

بابل (Babylonia) عراق کا پرانا نام تھا۔ یروشلم پر حملہ کرنے والا بخت نصر (Nebuchadnezzar) بھی یہیں کا بادشاہ تھا اور نمرود بھی بابل ہی کا بادشاہ تھا۔ نمرود عراق کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا‘ جس کی جمع ''نمارِدة'' ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دورِ حکومت میں جنات اور انسانوں کا باہم میل جول ہونے کی وجہ سے جنات لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی آخری آزمائش کے لیے دو فرشتوں کو زمین پر اتارا جو انسانی شکل وصورت میں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ وہ خود ہی یہ واضح کر دیتے تھے کہ دیکھو جادو کفر ہے‘ ہم سے نہ سیکھو۔ لیکن اس کے باوجود لوگ سیکھتے تھے۔ گویا اُن پر اتمامِ حجت ہو گیا کہ اب ان کے اندر خباثت پورے طریقے سے گھر کر چکی ہے۔

﴿وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ﴾ ''اور وہ نہیں سکھاتے تھے کسی کو بھی''

﴿حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ﴾ ''یہاں تک کہ وہ کہہ دیتے تھے کہ دیکھو ہم تو آزمائش کے لیے بھیجے گئے ہیں‘ پس تم کفر مت کرو۔''

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ﴾ ''پھر وہ سیکھتے تھے اُن دونوں سے وہ شے جن کے ذریعے سے آدمی اور اُس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالتے تھے۔''

شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ڈالنا اور لوگوں کے گھروں میں فساد ڈالنا‘ اس طرح کے کام اب بھی بعض عورتیں بڑی سرگرمی سے سرانجام دیتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے تعویذ‘ گنڈے‘ دھاگے اور نہ جانے کیا کچھ ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور نہیں تھے وہ ضرر پہنچانے والے اس کے ذریعے کسی کو بھی اللہ کے اِذن کے بغیر۔''

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بندۂ مؤمن کو یہ یقین ہو کہ اللہ کے اِذن کے بغیر نہ کوئی چیز فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ ہی نقصان۔ چاہے کوئی دوا ہو وہ بھی باذنِ ربّ کام کرے گی ورنہ نہیں۔ جو کوئی بھی اسبابِ طبیعیہ ہیں ان کے اثرات تبھی ظاہر ہوں گے اگر اللہ چاہے گا‘ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ جادو کا اثر بھی اگر ہوگا تو اللہ کے اِذن سے ہوگا۔ چنانچہ بندۂ مؤمن کو اللہ کے بھروسے پر ڈٹے رہنا چاہیے اور مصائب ومشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

﴿وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ﴾ ''اور وہ سیکھتے تھے وہ چیزیں جو خود اُن کو بھی ضرر پہنچانے والی تھیں اور انہیں نفع نہیں پہنچاتی تھیں۔''

﴿وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ﴾ ''حالانکہ وہ خوب جان چکے تھے کہ جو بھی اس چیز کا خریدار بنا (یعنی جادو سیکھا) اُس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔''

﴿وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ ''اور بہت ہی بُری تھی وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کر دیا۔''

﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''کاش انہیں علم ہوتا!''

آیت ۱۰۳ ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا﴾ ''اور اگر وہ ایمان رکھتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے''

﴿لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ط﴾ ''تو بدلہ پاتے اللہ کی طرف سے بہت ہی اچھا۔''
﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٣﴾﴾ ''کاش اُن کو معلوم ہوتا!''

آیات ۱۰۴ تا ۱۱۲

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ط وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ مَا يَوَدُّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ط وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ
بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿١٠٥﴾ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط
اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٦﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَمَا لَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٠٧﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ط وَمَنْ
يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١٠٨﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ج حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ج فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ
اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٩﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ
خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١٠﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ
نَصٰرٰى ط تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١١١﴾ بَلٰى ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ
مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ص وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿١١٢﴾﴾

آیت ۱۰۴ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ ''اے ایمان والو تم رَاعِنَا مت کہا کرو''
﴿وَقُوْلُوا انْظُرْنَا﴾ ''بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو''
﴿وَاسْمَعُوْا ط﴾ ''اور توجہ سے بات کو سنو!''

قبل ازیں منافقین بنی اسرائیل کا ذکر ہوا تھا' جن کا قول تھا: ''سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا'' ۔اب یہاں اُن منافقین کا طرزِ عمل بیان ہو رہا ہے جو مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے اور یہود کے زیر اثر تھے۔ یہودی اور ان کے زیر اثر منافقین جب رسول اللہ ﷺ کی محفل میں بیٹھتے تھے تو اگر آپؐ کی کوئی بات انہیں سنائی نہ دیتی یا سمجھ میں نہ آتی تو وہ رَاعِنَا کہتے تھے' جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضور (ﷺ!) ذرا ہماری رعایت کیجیے' بات کو دوبارہ دہرا دیجیے' ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اہل ایمان بھی یہ لفظ استعمال کرنے لگے تھے۔ لیکن یہود اور منافقین اپنے خبثِ باطن کا اظہار اس طرح کرتے کہ اس لفظ کو زبان دبا کر کہتے تو ''رَاعِيْنَا'' ہو

جاتا (یعنی اے ہمارے چرواہے!) اس پر دل ہی دل میں خوش ہوتے اور اس طرح اپنی خباثتِ نفس کو غذا مہیا کرتے۔ اگر کوئی ان کو ٹوک دیتا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو تو جواب میں کہتے ہم نے تو رَاعِنَا کہا تھا' معلوم ہوتا ہے آپ کی سماعت میں کوئی خلل پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم اس لفظ ہی کو چھوڑ دو' اس کی جگہ کہا کرو: اُنْظُرْنَا۔ یعنی اے نبیؐ ہماری طرف توجہ فرمایئے! یا ہمیں مہلت دیجیے کہ ہم بات کو سمجھ لیں۔ اور دوسرے یہ کہ توجہ سے بات کو سنا کرو تاکہ دوبارہ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾﴾ ''اور ان کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۱۰۵ ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ط﴾ ''اور نہیں چاہتے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے اہل کتاب میں سے اور مشرکین میں سے کہ نازل ہو تم پر کوئی بھی خیر تمہارے ربّ کی طرف سے۔''

جن لوگوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے' خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکینِ مکہ میں سے' وہ اس بات پر حسد کی آگ میں جل رہے ہیں کہ یہ کلام پاک آپؐ پر کیوں نازل ہو گیا اور ''خاتم النبیین'' کا یہ منصب آپؐ کو کیوں مل گیا۔ وہ نہیں چاہتے کہ اللہ کی طرف سے کوئی بھی خیر آپ کو ملے۔

﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط﴾ ''اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے۔''
یہ تو اس کا اختیار اور اس کا فیصلہ ہے۔
﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿١٠٥﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔''

آیت ۱۰۶ ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ ''جو بھی ہم منسوخ کرتے ہیں کوئی آیت یا اسے بھلا دیتے ہیں''
ایک تو ہے نسخ یعنی کسی آیت کو منسوخ کر دینا اور ایک ہے حافظے سے ہی کسی شے کو محو کر دینا۔
﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط﴾ ''تو ہم (اُس کی جگہ پر) لے آتے ہیں اُس سے بہتر یا (کم از کم) ویسی ہی۔''
﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٦﴾﴾ ''کیا تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے؟'' اسے ہر شے کا اختیار حاصل ہے۔

اس آیت کا اصل مفہوم اور پس منظر سمجھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اللہ کا دین آدم علیہ السلام سے لے کر ایں دم تک ایک ہی ہے۔ نوح علیہ السلام کا دین' موسیٰ علیہ السلام کا دین' عیسیٰ علیہ السلام کا دین اور محمد رسول اللہ ﷺ کا دین ایک ہی ہے' جبکہ شریعتوں میں فرق رہا ہے۔ اس فرق کا اصل سبب یہ ہے کہ نوعِ انسانی مختلف اعتبارات سے ارتقاء کے مراحل طے کر رہی تھی۔ ذہنی پختگی' شعور کی پختگی اور پھر تمدنی ارتقاء (social evolution) مسلسل جاری تھا۔ لہٰذا اُس ارتقاء کے جس مرحلے میں رسول آئے اسی کی مناسبت سے ان کو تعلیمات دے دی گئیں۔ ان تعلیمات کے کچھ حصے ایسے تھے جو ابدی (eternal) ہیں' وہ ہمیشہ رہیں گے' جبکہ کچھ حصے زمانے کی مناسبت سے تھے۔ چنانچہ جب اگلا رسول آتا تو اُن میں سے کچھ چیزوں میں تغیر و تبدل ہو جاتا' کچھ

چیزیں نئی آ جاتیں اور کچھ پرانی ساقط ہو جاتیں۔ یہ معاملہ نسخ کہلاتا ہے۔ یا تو اللہ تعالیٰ تعین ّکے ساتھ کسی حکم کو منسوخ فرما دیتے ہیں اور اس کی جگہ نیا حکم بھیج دیتے ہیں' یا کسی شے کو سرے سے لوگوں کے ذہنوں سے خارج کر دیتے ہیں۔ یہودی یہ اعتراض کر رہے تھے کہ اگر یہ دین وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کا تھا تو پھر شریعت پوری وہی ہونی چاہیے۔ یہاں اس اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔

پھر ناسخ و منسوخ کا مسئلہ قرآن میں بھی ہے۔ قرآن میں بھی تدریج کے ساتھ شریعت کی تکمیل ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا' شریعت کا ابتدائی خاکہ (blue print) سورۃ البقرۃ میں مل جاتا ہے' لیکن شریعت کی تکمیل سورۃ المائدۃ میں ہوئی ہے۔ یہ جو تقریباً پانچ چھ سال کا عرصہ ہے اس میں کچھ احکام دیے گئے' پھر اُن میں ردّ و بدل کر کے نئے احکام دیے گئے اور پھر آخر میں یہ ارشاد فرما دیا گیا: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳) ''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا ہے''۔ تو یہ ناسخ و منسوخ کا مسئلہ صرف سابقہ شریعتوں اور شریعتِ محمدیؐ کے مابین ہی نہیں ہے' بلکہ خود شریعتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بھی زمانی اعتبار سے ارتقاء ہوا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے شراب کے بارے میں حکم دیا گیا کہ اس میں گناہ کا پہلو زیادہ ہے' اگرچہ کچھ فائدے بھی ہیں۔ اس کے بعد حکم آیا کہ اگر شراب کے نشے میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔ پھر سورۃ المائدۃ میں آخری حکم آ گیا اور اسے گندا شیطانی کام قرار دے کر فرمایا گیا: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾﴾ ''تو کیا اب بھی باز آتے ہو یا نہیں؟'' اس طرح تدریجاً احکام آئے اور آخری حکم میں شراب حرام کر دی گئی۔ یہاں فرمایا کہ اگر ہم کسی حکم کو منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اُس سے بہتر لے آتے ہیں یا کم از کم اُس جیسا دوسرا حکم لے آتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے' اُس کا اختیار کامل ہے' وہ مالک الملک ہے' دین اُس کا ہے' اس میں وہ جس طرح چاہے تبدیلی کر سکتا ہے۔

آیت ۱۰۷ ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں کی اور زمین کی؟''

﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾﴾ ''اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی بھی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔''

آیت ۱۰۸ ﴿اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ ''کیا تم مسلمان بھی یہ چاہتے ہو کہ سوالات (اور مطالبے) کرو اپنے رسولؐ سے اُسی طرح جیسے اس سے پہلے موسیٰؑ سے کیے جا چکے ہیں؟''

مثلاً اُن سے کہا گیا کہ ہم آپ کی بات نہیں مانیں گے جب تک کہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں۔ اسی طرح کے اور بہت سے مطالبے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے جاتے تھے۔ یہاں مسلمانوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اُس روش سے باز رہو' ایسی بات تمہارے اندر پیدا نہیں ہونی چاہیے۔

﴿وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۰۸﴾﴾ ''اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر لے لے گا وہ تو بھٹک چکا سیدھی راہ سے۔''

ظاہر ہے کہ جو منافقین اہلِ ایمان کی صفوں میں شامل تھے وہی ایسی حرکتیں کر رہے ہوں گے۔ اس لیے فرمایا کہ جو کوئی ایمان کو ہاتھ سے دے کر کفر کو اختیار کر لے گا وہ تو راہِ راست سے بھٹک گیا۔ منافق کا معاملہ دو طرفہ ہوتا ہے' چنانچہ قرآن حکیم میں منافقین کے لیے ''مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ اب اس کا بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ کفر کی طرف یکسو ہو جائے اور اس کا بھی امکان ہوتا ہے کہ بالآخر ایمان کی طرف یکسو ہو جائے۔ جو شخص ایمان اور کفر کے درمیان معلق ّ ہے اُس کے لیے یہ دونوں امکانات ہیں۔ جو کفر کی طرف جا کر مستقل طور پر اُدھر راغب ہو گیا یہاں اس کا ذکر ہے۔

آیت ۱۰۹ ﴿وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ﴾ ''اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں پھیر کر تمہارے ایمان کے بعد تمہیں پھر کافر بنا دیں۔''

یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی بلّی کی دُم کٹ جائے تو وہ یہ چاہے گی کہ ساری بلیوں کی دُمیں کٹ جائیں تاکہ وہ علیحدہ سے نمایاں نہ رہے۔ چنانچہ اہل کتاب یہ چاہتے تھے کہ اہل ایمان کو بھی واپس کفر میں لے آیا جائے۔

﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''بسبب ان کے دلی حسد کے''

ان کا یہ طرزِ عمل ان کے حسد کی وجہ سے ہے کہ یہ نعمت مسلمانوں کو کیوں دے دی گئی؟

﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ﴾ ''اس کے بعد کہ اُن پر حق بالکل واضح ہو چکا ہے۔''

وہ حق کو جان چکے ہیں اور پہچان چکے ہیں' کسی مغالطے یا غلط فہمی میں نہیں ہیں۔

﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ ''تو (اے مسلمانو!) تم معاف کرتے رہو اور صرفِ نظر سے کام لو''

یہ بہت اہم مقام ہے۔ مسلمانوں کو باور کرایا جا رہا ہے کہ ابھی تو مدنی دَور کا آغاز ہو رہا ہے' ابھی کشمکش' کشاکش اور مقابلہ و تصادم کے بڑے سخت مراحل آ رہے ہیں۔ چونکہ تمہارا سب سے پہلا محاذ کفارِ مکہ کے خلاف ہے اور وہی سب سے بڑھ کر تم پر حملے کریں گے اور ان سے تمہاری جنگیں ہوں گی' لہٰذا یہ جو آستین کے سانپ ہیں' یعنی یہود' ان کو ابھی مت چھیڑو۔ جب تک یہ خوابیدہ (dormant) پڑے رہیں انہیں پڑا رہنے دو۔ فی الحال ان کے طرزِ عمل کے بارے میں زیادہ توجہ نہ دو' بلکہ عفو و درگزر اور چشم پوشی سے کام لیتے رہو۔

﴿حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ﴾ ''یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے۔''

ایک وقت آئے گا جب اے مسلمانو تمہیں آخری غلبہ حاصل ہو جائے گا اور جب تم باہر کے دشمنوں سے نمٹ لو گے تو پھر اِن اندرونی دشمنوں کے خلاف بھی تمہیں آزادی دی جائے گی کہ ان کو بھی کیفرِ کردار تک پہنچا دو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰۹﴾﴾ ''یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۱۱۰ ﴿وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ﴾ ''اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔''

﴿وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اور جو بھلائی بھی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔''

جو مال تم اللہ کی راہ میں خرچ کر رہے ہو وہ اللہ کے بینک میں جمع (deposit) ہو جاتا ہے اور مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ لہٰذا اس کے بارے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۱۱۰﴾﴾ ''یقیناً جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت ۱۱۱ ﴿وَقَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ؕ﴾ ''اور یہ کہتے ہیں ہرگز داخل نہ ہوگا جنت میں مگر وہی جو یہودی ہو یا نصرانی ہو۔''

جب یہ نئی اُمتِ مسلمہ تشکیل پا رہی تھی تو یہودی اور نصرانی' جو ایک دوسرے کے دشمن تھے' مسلمانوں کے مقابلے میں جمع ہو گئے۔ انہوں نے مل کر یہ کہنا شروع کیا کہ جنت میں کوئی ہرگز نہیں داخل ہوگا سوائے اس کے جو یا تو یہودی ہو یا نصرانی ہو۔ اس طرح کی مذہبی جتھے بندیاں ہمارے ہاں بھی بن جاتی ہیں۔ مثلاً اہل حدیث کے مقابلے میں بریلوی اور دیوبندی جمع ہو جائیں گے' اگرچہ اُن کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بیر اپنی جگہ ہے۔ جب ایک مشترکہ دشمن نظر آتا ہے تو پھر وہ لوگ جن کے اپنے اندر بڑے اختلافات ہوتے ہیں وہ بھی ایک متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے اس مشترکہ بیان کے جواب میں فرمایا:

﴿تِلۡکَ اَمَانِیُّہُمۡ ؕ﴾ ''یہ ان کی تمنائیں ہیں۔''

یہ ان کی خواہشات ہیں' من گھڑت خیالات ہیں' خوش نما آرزوئیں (wishful thinkings) ہیں۔

﴿قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۱۱﴾﴾ ''اُن سے کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو۔''

کسی آسمانی کتاب سے دلیل لاؤ۔ کہیں تورات میں لکھا ہو یا انجیل میں لکھا ہو تو ہمیں دکھا دو! اب یہاں پر پھر ایک عالمگیر صداقت (universal truth) بیان ہو رہی ہے:

آیت ۱۱۲ ﴿بَلٰی ٭ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡہَہٗ لِلّٰہِ وَہُوَ مُحۡسِنٌ﴾ ''کیوں نہیں' ہر وہ شخص جو اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دے اور وہ محسن ہو''

اس کا سرِتسلیم خم کر دینے کا رویہ صدق و سچائی اور حسن کردار پر مبنی ہو۔ سر کا جھکانا منافقانہ انداز میں نہ ہو' اس کی اطاعت جزوی نہ ہو کہ کچھ مانا کچھ نہیں مانا۔

﴿فَلَہٗۤ اَجۡرُہٗ عِنۡدَ رَبِّہٖ ۪﴾ ''تو اُس کے لیے اُس کا اجر محفوظ ہے اُس کے ربّ کے پاس۔''

﴿وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ ''اور ایسے لوگوں کو نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ ہی وہ کسی حزن و ملال سے دوچار ہوں گے۔''

یہ دوسری آیت ہے کہ جس سے کچھ لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ نجاتِ اُخروی کے لیے ایمان بالرسالت ضروری نہیں ہے۔ اس کا جواب پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ مختصراً یہ کہ:

اوّلاً —— قرآن حکیم میں ہر مقام پر ساری چیزیں بیان نہیں کی جاتیں۔ کوئی شے ایک جگہ بیان کی گئی ہے تو کوئی کہیں دوسری جگہ بیان کی گئی ہے۔ اس سے ہدایت حاصل کرنی ہے تو اس کو پورے کا پورا ایک کتاب کی حیثیت سے لینا ہوگا۔

ثانیاً —— یہ سارا سلسلۂ کلام دو بریکٹوں کے درمیان آ رہا ہے اور اس سے پہلے یہ الفاظ واضح طور پر آ چکے ہیں: ﴿وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ وَلَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ ۪﴾ چنانچہ یہ عبارت ضرب کھا رہی ہے اس پورے کے پورے سلسلۂ مضامین سے جو اِن دو بریکٹوں کے درمیان آ رہا ہے۔

آیات ۱۱۳ تا ۱۲۳

﴿وَقَالَتِ الۡیَہُوۡدُ لَیۡسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیۡءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیۡسَتِ الۡیَہُوۡدُ عَلٰی شَیۡءٍ ۙ وَّہُمۡ
یَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِہِمۡ ۚ فَاللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا
فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ وَسَعٰی فِیۡ خَرَابِہَا ؕ اُولٰٓئِکَ مَا
کَانَ لَہُمۡ اَنۡ یَّدۡخُلُوۡہَاۤ اِلَّا خَآئِفِیۡنَ ؕ لَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّلَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰہِ
الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ٭ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۙ
سُبۡحٰنَہٗ ؕ بَلۡ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی
اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ لَوۡلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوۡ تَاۡتِیۡنَاۤ اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ
قَالَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِہِمۡ ؕ تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ
بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَہُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی
حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَہُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ ہُدَی اللّٰہِ ہُوَ الۡہُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَہۡوَآءَہُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ
الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ
بِہٖ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ
وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّلَا
تَنۡفَعُہَا شَفَاعَۃٌ وَّلَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾﴾

آیت ۱۱۳ ﴿وَقَالَتِ الۡیَهُوۡدُ لَیۡسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیۡءٍ ص﴾ ''یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں ہیں''
ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے' کوئی جڑ بنیاد نہیں ہے۔
﴿وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیۡسَتِ الۡیَهُوۡدُ عَلٰی شَیۡءٍ﴾ ''اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں ہیں''
اُن کی کوئی بنیاد نہیں ہے' یہ بے بنیاد لوگ ہیں' ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔
﴿وَّهُمۡ یَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ ط﴾ ''حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھ رہے ہیں۔''

عہد نامہ قدیم (Old Testament) یہودیوں اور عیسائیوں میں مشترک ہے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے اور امریکہ میں جدید عیسائیت کی صورت میں ایک بہت بڑی طاقت جو اُبھر رہی ہے وہ عیسائیت کو یہودیت کے رنگ میں رنگ رہی ہے۔ رومن کیتھولک مذہب نے تو بائبل سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا اور سارا اختیار پوپ کے ہاتھ میں آ گیا تھا' لیکن پروٹسٹنٹس (Protestants) نے پھر بائبل کو قبول کیا۔ اب اس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم پر بھی ان کی توجہ ہو رہی ہے اور وہ کہہ رہے ہیں کہ اسے بھی ہم اپنی کتاب مانتے ہیں اور اس میں جو کچھ لکھا ہے اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ امریکہ میں ہم نے ایک سیمینار منعقد کیا تھا' جس میں ایک یہودی عالم نے کہا تھا کہ اس وقت اسرائیل کو سب سے بڑی نصرت و حمایت امریکہ کے اُن عیسائیوں سے مل رہی ہے جو Evengelists کہلاتے ہیں اور وہاں پر ایک بڑا فرقہ بن کر اُبھر رہے ہیں۔ بہر حال یہ اُن کا طرزِ عمل بیان ہوا ہے۔

﴿کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ج﴾ ''اسی طرح کہی تھی اُن لوگوں نے جو کچھ بھی نہیں جانتے' ان ہی کی سی بات۔''

یہاں اشارہ ہے مشرکینِ مکہ کی طرف۔

﴿فَاللّٰهُ یَحۡکُمُ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾﴾ ''پس اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے گا ان کے مابین قیامت کے دن ان تمام باتوں کا جن میں یہ اختلاف کر رہے تھے۔''

اب دیکھئے' اس سلسلۂ کلام کی بقیہ آیات میں بھی اگرچہ خطاب تو بنی اسرائیل ہی سے ہے' لیکن اب یہاں پر اہل مکہ سے کچھ تعریض شروع ہو گئی ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ آئے گا' پھر تحویل قبلہ کا ذکر آئے گا۔ بیت اللہ چونکہ اُس وقت مشرکین مکہ کے قبضے میں تھا' لہٰذا اس حوالے سے کچھ متعلقہ مضامین آ رہے ہیں اور تحویل قبلہ کی تمہید باندھی جا رہی ہے۔ ''تحویلِ قبلہ'' دراصل اس بات کی علامت تھی کہ اب وہ سابقہ اُمت مسلمہ معزول کی جا رہی ہے اور اس مقام پر ایک نئی اُمت' اُمتِ محمد ﷺ کی تقرری عمل میں لائی جا رہی ہے۔ اسی حوالے سے ﴿کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ج﴾ کے الفاظ میں مشرکین مکہ کی طرف اشارہ کیا گیا۔

آیت ۱۱۴ ﴿وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡهَا اسۡمُهٗ﴾ ''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں سے (لوگوں کو) روکے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے؟''

مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو مسجد حرام میں حاضری سے محروم کر دیا تھا اور ان کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی۔ ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ عمرے کے ارادے سے مکہ کا سفر فرمایا' لیکن مشرکین نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اس موقع پر صلح حدیبیہ ہوئی اور آپ ﷺ کو عمرہ کیے بغیر واپس آنا پڑا۔ پھر اگلے برس ۷ ہجری میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ عمرہ ادا کیا۔ تو یہ سات برس محمد رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان پر بہت شاق گزرے ہیں۔ یہاں مشرکین مکہ کے اس ظلم کا ذکر ہو رہا ہے کہ انہوں نے اہل ایمان کو مسجد حرام سے روک رکھا ہے۔

﴿وَسَعٰی فِیۡ خَرَابِهَا ط﴾ ''اور وہ ان کی تخریب کے درپے ہو؟''

خراب اور تخریب کا مادۂ اصلی ایک ہی ہے۔ تخریب دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک ظاہری تخریب کہ مسجد کو گرا دینا' اور ایک باطنی اور معنوی تخریب کہ اللہ کے گھر کو توحید کی بجائے شرک کا اڈہ بنا دینا۔ مشرکین مکہ نے بیت اللہ کو بت کدہ بنا دیا تھا:

دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا!

خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھ دیے گئے تھے' جسے ابراہیم علیہ السلام نے توحید خالص کے لیے تعمیر کیا تھا۔ مساجد کے ساتھ لفظ ''خراب'' ایک حدیث میں بھی آیا ہے۔ یہ بڑی دلدوز حدیث ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے ذہن نشین کر لیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((یُوۡشِکُ اَنۡ یَاۡتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ)) ''اندیشہ ہے کہ لوگوں پر (یعنی میری اُمت پر) ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ'' ((لَا یَبۡقٰی مِنَ الۡاِسۡلَامِ اِلَّا اسۡمُهٗ)) ''اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ نہیں بچے گا'' ((وَلَا یَبۡقٰی مِنَ الۡقُرۡآنِ اِلَّا رَسۡمُهٗ)) ''اور قرآن میں سے اس کے رسم الخط (الفاظ اور حروف) کے سوا کچھ نہیں بچے گا''۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کی ضمانت دی ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ و حروف مِن وعن محفوظ رہیں گے۔ ((مَسَاجِدُهُمۡ عَامِرَةٌ وَهِیَ خَرَابٌ مِنَ الۡهُدٰی)) ''ان کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہو جائیں گی''۔ یہاں بھی لفظ ''خراب'' نوٹ کیجیے۔ گویا معنوی اعتبار سے یہ ویران ہو جائیں گی۔ ((عُلَمَاؤُهُمۡ شَرٌّ مَنۡ تَحۡتَ اَدِیۡمِ السَّمَاءِ)) ''ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے کے بدترین انسان ہوں گے''۔ ((مِنۡ عِنۡدِهِمۡ تَخۡرُجُ الۡفِتۡنَةُ وَفِیۡهِمۡ تَعُوۡدُ))[(۱۳)] ''فتنہ اُن ہی کے اندر سے برآمد ہو گا اور انہی میں گھس جائے گا''۔ یعنی ان کا کام ہی فتنہ انگیزی' مخالفت اور جنگ و جدال ہو گا۔ اپنے اپنے فرقے کے لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتے رہنا اور مسلمانوں کے اندر اختلافات کو ہوا دینا ہی اُن کا کام رہ جائے گا۔

آج جن کو ہم علماء کہتے ہیں ان کی عظیم اکثریت اس کیفیت سے دوچار ہو چکی ہے۔ جب مذہب اور دین پیشہ بن جائے تو اس میں کوئی خیر باقی نہیں رہتا۔ دین اور مذہب پیشہ نہیں تھا' لیکن اسے پیشہ بنا لیا گیا۔ اسلام میں کوئی پیشوائیت نہیں' کوئی پاپائیت نہیں' کوئی برہمنیت نہیں۔ اسلام تو ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ ہر شخص کتاب اللہ پڑھے' ہر شخص عربی سیکھے اور کتاب اللہ کو سمجھے۔ ہر شخص کو عبادات کے قابل ہونا چاہیے۔ ہر شخص اپنی بچی کا نکاح خود پڑھائے' اپنے والد کا جنازہ خود پڑھائے۔ ہم

نے خود اسے پیشہ بنادیا ہے اور عبادات کے معاملے میں ایک خاص طبقے کے محتاج ہو گئے ہیں۔ مرزا غالبؔ نے کہا تھا: ع

پیشے میں عیب نہیں' رکھیے نہ فرہاد کو نام!

ایک چیز جب پیشہ بن جاتی ہے تو اس میں پیشہ ورانہ چشمکیں اور رقابتیں در آتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات واضح رہے کہ دنیا کبھی علماءِ حق سے خالی نہیں ہو گی۔ چنانچہ یہاں علماءِ حق بھی ہیں اور علماءِ سو بھی ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت کا حال وہی ہو چکا ہے جو حدیث میں بیان ہوا ہے' ورنہ اُمت کا یوں بیڑہ غرق نہ ہوتا۔

﴿اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۭ﴾ ''ایسے لوگوں کو تو ان میں داخل ہی نہیں ہونا چاہیے مگر ڈرتے ہوئے۔''

ان لوگوں کو لائق نہیں ہے کہ اللہ کی مسجدوں میں داخل ہوں' یہ اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں۔

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ﴾ ''ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت و رسوائی ہے''

﴿وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴿۱۱۴﴾﴾ ''اور آخرت میں ان کے لیے عذابِ عظیم ہے۔''

اگلی آیت میں تحویل قبلہ کے لیے تمہید باندھی جا رہی ہے۔ قبلہ کی تبدیلی بڑا احساس معاملہ تھا۔ جن لوگوں کو یروشلم اور بیت المقدس کے ساتھ دلچسپی تھی ان کے دلوں میں اُس کی عقیدت جاگزیں تھی' جبکہ مکہ مکرمہ اور بیت اللہ کے ساتھ جن کو دلچسپی تھی ان کے دلوں میں اس کی محبت وعقیدت تھی۔ تو اس حوالے سے قبلہ کی تبدیلی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ہجرت کے بعد قبلہ دو دفعہ بدلا ہے۔ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ مدینے میں آ کر رسول اللہ ﷺ نے سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی اور پھر بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم آیا۔ اس طرح اہل ایمان کے کئی امتحان ہو گئے' ان کا ذکر آگے آ جائے گا۔ لیکن یہاں اس کی تمہید بیان ہو رہی ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۱۵ ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ﴾ ''اور مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔''

یعنی اگر ہم مغرب کی طرف رُخ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ مغرب میں ہے (معاذ اللہ)۔ اللہ تو جہت اور مقام سے ماورا ہے' وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ یہ تو یکسانیت پیدا کرنے کے لیے اور اجتماعی رنگ دینے کے لیے ایک چیز کو قبلہ بنادیا گیا ہے۔ یہ تو ایک علامت ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے: ؏

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں!

قبلہ ہمارا مسجود تو نہیں ہے!

﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ﴾ ''پس جدھر بھی تم رُخ کرو گے اُدھر ہی اللہ کا رُخ ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴿۱۱۵﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت وسعت والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

وہ بہت وسعت والا ہے' وہ کسی بھی سمت میں محدود نہیں ہے' اور ہر شے کا جاننے والا ہے۔

تحویل قبلہ کی تمہید کے طور پر ایک آیت کہہ کر اب پھر اصل سلسلۂ کلام جوڑا جا رہا ہے:

آیت ۱۱۶ ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ﴾ ''اور ان (میں وہ بھی ہیں جن) کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ وہ تو ان باتوں سے پاک ہے۔''

ظاہر بات ہے یہاں پھر اہل مکہ ہی کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جن کا یہ قول تھا کہ اللہ نے اپنے لیے اولاد اختیار کی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ نصاریٰ کہتے تھے کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں' اور یہود یوں کا بھی ایک گروہ ایسا تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتا تھا۔

﴿بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ ''بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُسی کی ملکیت ہے۔''

سب مخلوق اور مملوک ہیں' خالق اور مالک صرف وہ ہے۔

﴿كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴿۱۱۶﴾﴾ ''سب کے سب اسی کے مطیع فرمان ہیں۔''

بڑے سے بڑا رسول ہو یا بڑے سے بڑا ولی یا بڑے سے بڑا فرشتہ یا بڑے بڑے اَجرامِ سماویہ' سب اسی کے حکم کے پابند ہیں۔

آیت ۱۱۷ ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ ''وہ نیا پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔''

وہ بغیر کسی شے کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔ ''ابداع'' اور ''خلق'' میں فرق نوٹ کیجیے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کے پہلے باب میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بنیادی طور پر تین ہیں: ابداع' خلق اور تدبیر۔ ابداع سے مراد ہے عدمِ محض سے کسی چیز کو وجود میں لانا' جسے انگریزی میں ''creation ex nihilo'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبکہ خلق ایک چیز سے دوسری چیز کا بنانا ہے' جیسے اللہ تعالیٰ نے گارے سے انسان بنایا' آگ سے جنات بنائے اور نور سے فرشتے بنائے' یہ تخلیق ہے۔ تو ''بدیع'' وہ ذات ہے جس نے کسی مادۂ تخلیق کے بغیر ایک نئی کائنات پیدا فرما دی۔ ہمارے ہاں ''بدعت'' وہ شے کہلاتی ہے جو دین میں نہیں تھی اور خواہ مخواہ لا کر شامل کر دی گئی۔ جس بات کی جڑ بنیاد دین میں نہیں ہے وہ بدعت ہے۔

﴿وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴿۱۱۷﴾﴾ ''اور جب وہ کسی معاملے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے بس یہی کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔''

آیت ۱۱۸ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور کہا اُن لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے''

یہاں پر مشرکین مکہ کی طرف روئے سخن ہے۔

﴿لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ﴾ ''کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا کیوں نہیں آ جاتی ہمارے پاس کوئی نشانی؟''

مشرکین مکہ کا رسول اللہ ﷺ سے بڑی شدت کے ساتھ یہ مطالبہ تھا کہ آپ کوئی ایسے معجزات ہی دکھا دیں جیسے آپ کہتے

ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے دکھائے تھے یا موسیٰ علیہ السلام نے دکھائے تھے۔ اگر آپ ہمارے یہ مطالبے پورے کر دیں تو ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیں گے۔ یہ مضمون تفصیل کے ساتھ سورۃ الانعام میں اور پھر سورۂ بنی اسرائیل میں آئے گا۔

﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ﴾ ”اسی طرح کی باتیں جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی کہتے رہے ہیں۔“

﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ﴾ ”ان کے دل ایک دوسرے سے مشابہ ہو گئے ہیں۔“

﴿قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿١١٨﴾﴾ ”ہم تو اپنی آیات واضح کر چکے ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنا چاہیں۔“

آیت ۱۱۹ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ﴾ ”(اے نبیؐ!) بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر“

آپؐ کی بنیادی حیثیت یہ ہے کہ آپؐ اہلِ حق کو جنت اور اس کی تمام تر نعمتوں کی بشارت دیں، اور جو غلط راستے پر چل پڑیں، کفر کریں، منافقت میں مبتلا ہوں، ملحد ہوں اور بدعملی کریں اُن کو آپؐ خبردار کر دیں کہ ان کے لیے جہنم تیار کر دی گئی ہے۔ آپؐ کا کام دعوت، ابلاغ، تبلیغ اور نصیحت ہے۔

﴿وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿١١٩﴾﴾ ”اور آپؐ سے سوال نہیں کیا جائے گا جہنمیوں کے بارے میں۔“

جو لوگ اپنے طرزِ عمل کی بنا پر جہنم کے مستحق قرار پا گئے ہیں ان کے بارے میں آپؐ ذمہ دار نہیں ہیں۔ آپؐ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ کیوں جہنم میں پہنچ گئے؟ آپؐ کے ہوتے ہوئے یہ جہنمی کیوں ہو گئے؟ نہیں، یہ آپؐ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ کون جنت میں جانا چاہتا ہے اور کون جہنم میں، یہ آدمی کا اپنا فیصلہ ہے۔ آپؐ کا کام حق کو واضح کر دینا ہے، اس کی وضاحت میں کمی نہ رہ جائے، حق واضح ہو جائے، کوئی اشتباہ باقی نہ رہے، بس یہ ذمہ داری آپؐ کی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ انسان اگر اپنی اصل مسئولیت سے زیادہ ذمہ داری اپنے سر پر ڈال لے تو خواہ مخواہ مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی بہت سی جماعتیں اسی طرح کی غلطیوں کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئیں اور پوری کی پوری تحریکیں برباد ہو گئیں۔ رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ علماءِ یہود ایمان لے آئیں اور جہنم کا ایندھن نہ بنیں۔ ان کے لیے آپ ﷺ نے اللہ کے حضور دعائیں کی ہوں گی۔ جیسے مکی دور میں آپؐ دعائیں مانگتے تھے کہ اے اللہ! عمرو بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کو تو میری جھولی میں ڈال دے اور اس کے ذریعے سے اسلام کو قوت عطا فرما!

آیت ۱۲۰ ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾ ”اور (اے نبیؐ! آپ کسی مغالطے میں نہ رہیے) ہرگز راضی نہ ہوں گے آپؐ سے یہودی اور نہ نصرانی جب تک کہ آپؐ پیروی نہ کریں ان کی ملت کی۔“ "

لہٰذا آپ ان سے اُمید منقطع کر لیجیے۔ اس لیے کہ زیادہ اُمید ہو تو پھر مایوسی ہو جاتی ہے۔ اقبال نے بندۂ مؤمن کے بارے میں بہت خوب کہا ہے: ع

اس کی اُمیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل!

مقصد اونچا ہو، لیکن امید قلیل رہنی چاہیے۔ اللہ چاہے گا تو ہو جائے گا، نہیں چاہے گا تو نہیں ہوگا۔ بندۂ مؤمن کا کام اپنی حد تک اپنا فرض ادا کر دینا ہے۔ اس سے زیادہ کی خواہش اگر اپنے دل میں پال لیں گے تو کسی عجلت پسندی میں گرفتار ہو جائیں گے اور کسی راہِ تیسیر یا راہِ تقصیر (short cut) کے ذریعے منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں گے اور اپنے آپ کو بھی برباد کر لیں گے۔

﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ﴾ ”کہہ دیجیے ہدایت تو بس اللہ کی ہدایت ہے۔“

جو اللہ نے بتلایا ہے وہی سیدھا راستہ ہے۔

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ﴾ ”اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپؐ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اُس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے“

اگر بفرضِ محال آپؐ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی کہ چلو کچھ لو کچھ دو کا معاملہ کر لو، کچھ ان کی بات مانو کچھ اپنی بات منوا لو، تو یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہ ہوگا۔ مکہ میں قریش کی طرف سے اس طرح کی پیشکش کی جاتی تھی کہ کچھ اپنی بات منوا لیجیے، کچھ ہماری مان لیجیے، compromise کر لیجیے، اور اب مدینہ میں یہود کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ چنانچہ اس پر متنبہ کیا جا رہا ہے۔"

﴿مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٢٠﴾﴾ ”تو نہیں ہوگا اللہ کے مقابلے میں آپؐ کے لیے کوئی مددگار اور نہ حمایتی۔“ (معاذ اللہ!)

حق کی تلوار بالکل عریاں ہے۔ اللہ کا عدل ہر فرد کے لیے الگ نہیں ہے، یہ فرد سے فرد تک بدلتا نہیں ہے۔ ایسے ہی ہر قوم اور ہر اُمت کے لیے قانون تبدیل نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی ایک قوم سے کوئی ایک معاملہ ہو اور دوسری قوم سے کوئی دوسرا معاملہ۔ اللہ کے اُصول اور قوانین غیر مبدل ہیں۔ اس ضمن میں اس کی ایک سنت ہے جس کے بارے میں فرمایا: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾﴾ (فاطر) ”پس تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم اللہ کے طریقے کو ہرگز ٹلتا ہوا نہیں پاؤ گے۔“

آیت ۱۲۱ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ﴾ ”وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔“

اس پر میں نے اپنے کتابچے ”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ میں بحث کی ہے کہ تلاوت کا اصل حق کیا ہے۔ ایک بات جان لیجیے کہ تلاوت کا لفظ، جو قرآن نے اپنے لیے اختیار کیا ہے، بڑا جامع لفظ ہے۔ ”تَلَا يَتْلُوْ“ کا معنی پڑھنا بھی ہے اور ”تَلَا يَتْلُوْ“ کسی کے پیچھے پیچھے چلنے (to follow) کو بھی کہتے ہیں۔ سورۃ الشمس کی پہلی دو آیات ملاحظہ کیجیے: ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ﴿١﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ﴿٢﴾﴾ ”قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔ اور قسم ہے چاند کی جب وہ اس کے پیچھے آتا ہے“۔ جب آپ کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو آپ اس کے متن (text) کے پیچھے پیچھے چل رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ

بعض لوگ جو زیادہ ماہر نہیں ہوتے' کتاب پڑھتے ہوئے اپنی انگلی ساتھ ساتھ چلاتے ہیں تاکہ نگاہ اِدھر سے اُدھر نہ ہو جائے' ایک سطر سے دوسری سطر پر نہ پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب کی تلاوت کا اصل حق یہ ہوگا کہ آپ اس کتاب کو follow کریں' اسے اپنا امام بنائیں' اس کے پیچھے چلیں' اس کا اتباع کریں' اس کی پیروی کریں' جس کی ہم دعا کرتے ہیں: وَاجْعَلْهُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًی وَّرَحْمَةً ''اور اسے میرے لیے امام اور روشنی اور ہدایت اور رحمت بنا دے!'' اللہ تعالیٰ اس قرآن کو ہمارا امام اُسی وقت بنائے گا جب ہم فیصلہ کرلیں کہ ہم اس کتاب کے پیچھے چلیں گے۔

﴿اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ط﴾ ''وہی ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔''

یعنی جو اللہ کی کتاب کی تلاوت کا حق ادا کریں اور اُس کی پیروی بھی کریں۔ اور جو نہ تو تلاوت کا حق ادا کریں اور نہ کتاب کی پیروی کریں' لیکن وہ دعویٰ کریں کہ ہمارا ایمان ہے اس کتاب پر تو یہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ ازروئے حدیث نبویؐ: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ))(١٤) ''جس شخص نے قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو اپنے لیے حلال کرلیا اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں ہے''۔

﴿وَمَنْ یَّکْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٢١﴾﴾ ''اور جو اس کا کفر کرے گا تو وہی لوگ ہیں خسارے میں رہنے والے''

اب یہود کے ساتھ اس سلسلۂ کلام کا اختتام ہو رہا ہے جس کا آغاز چھٹے رکوع سے ہوا تھا۔ اس سلسلۂ کلام کے آغاز میں جو دو آیات آئی تھیں انہیں میں نے بریکٹ سے تعبیر کیا تھا۔ وہی دو آیات یہاں دوبارہ آ رہی ہیں اور اس طرح گویا بریکٹ بند ہو رہی ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۲۲ ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿١٢٢﴾﴾ ''اے اولادِ یعقوب! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا' اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت دی تھی اہل عالم پر۔''

یہ آیت بعینہٖ ان الفاظ میں چھٹے رکوع کے آغاز میں آ چکی ہے۔ (آیت ۴۷) دوسری آیت بھی جوں کی توں آ رہی ہے' صرف الفاظ کی ترتیب تھوڑی سی بدلی ہے۔ عبارت کے شروع اور آخر والی بریکٹس ایک دوسرے کا عکس ہوتی ہیں۔ ایک کی گولائی دائیں طرف ہوتی ہے تو دوسری کی بائیں طرف۔ اسی طرح یہاں دوسری آیت کی ترتیب درمیان سے تھوڑی سی بدل دی گئی ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۲۳ ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے گی''

﴿وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ ''اور نہ اُس سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا''

وہاں الفاظ تھے: ﴿وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ اُس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی'۔

﴿وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ اسے کوئی سفارش ہی فائدہ دے سکے گی''

یہاں عدل پہلے اور شفاعت بعد میں ہے' وہاں شفاعت پہلے ہے اور عدل بعد میں۔ بس یہی ایک تبدیلی ہے۔

﴿وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿١٢٣﴾﴾ ''اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

یہ ٹکڑا ابھی جوں کا توں وہی ہے جس پر چھٹے رکوع کی دوسری آیت ختم ہوئی تھی۔

آیات ۱۲۴ تا ۱۲۹

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ط قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ط قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿١٢٤﴾ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ط وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ﴿١٢٥﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط قَالَ وَمَنْ کَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿١٢٦﴾ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ ص وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ج اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ ط اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿١٢٩﴾﴾

سورۃ البقرۃ کے ابتدائی اٹھارہ رکوعوں میں روئے سخن مجموعی طور پر سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی جانب ہے۔ ابتدائی چار رکوع اگرچہ عمومی نوعیت کے حامل ہیں' لیکن ان میں بھی یہود کی طرف روئے سخن کے اشارے موجود ہیں۔ چوتھے رکوع کے آغاز سے پندرہویں رکوع کی ابتدائی دو آیات تک' ان دس رکوعوں میں ساری گفتگو صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل ہی سے ہے' اِلّا یہ کہ ایک جگہ اہل ایمان سے خطاب کیا گیا اور کچھ مشرکین مکہ کا بھی تعریض کے اسلوب میں تذکرہ ہو گیا۔

اس کے بعد اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دو شاخیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے' جو بڑے تھے' جبکہ دوسری بیوی حضرت سارہ سے اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام تھے' جن کا لقب اسرائیل تھا۔ ان کے بارہ بیٹوں سے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے وجود میں آئے۔ حضرت اسماعیلؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کے پاس' وادیٔ غیر ذی زرع میں آباد کیا تھا' جن سے ایک نسل بنی اسماعیل چلی۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد نبوت حضرت اسماعیلؑ کو تو ملی' لیکن اُس کے بعد تقریباً تین ہزار سال کا فصل ہے کہ اس شاخ میں کوئی نبوت نہیں آئی۔ نبوت کا سلسلہ دوسری شاخ میں چلا۔ حضرت اسحاق کے بیٹے حضرت یعقوب اور ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہم السلام سب نبی تھے۔ پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے شروع ہو کر حضرت عیسیٰ

اور حضرت یحییٰ علیہما السلام تک چودہ سو برس مسلسل ایسے ہیں کہ بنی اسرائیل میں نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ایک تیسری شاخ بنی قطورہ بھی تھی۔ یہ آپؑ کی تیسری اہلیہ قطورہ سے تھی۔ ان ہی میں سے بنی مدین (یا بنی مدیان) تھے' جن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی۔ اس طرح حضرت شعیبؑ بھی حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا' حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد بنی اسماعیل میں نبوت کا سلسلہ منقطع رہا۔ یہاں تک کہ تقریباً تین ہزار سال بعد محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آپؐ کی بعثت کے بعد امامت الناس سابقہ اُمتِ مسلمہ (بنی اسرائیل) سے موجودہ اُمتِ مسلمہ (اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو منتقل ہوگئی۔ اس انتقالِ امامت کے وقت بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے ان کے اور بنی اسماعیل کے مابین قدر مشترک کا تذکرہ کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے لیے بات کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے جد امجد بھی ابراہیم علیہ السلام ہی تھے اور یہ دوسری نسل بھی ابراہیم علیہ السلام ہی کی ہے۔ اس حوالے سے یہ سمجھ لیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی اور اب اسے اہل توحید کا مرکز بنایا جا رہا ہے' چنانچہ پندرہویں رکوع سے اٹھارہویں رکوع تک یہ ساری گفتگو جو ہو رہی ہے اس کا اصل مضمون ''تحویلِ قبلہ'' ہے۔

آیت ۱۲۴ ﴿وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ﴾ ''اور ذرا یاد کرو جب ابراہیمؑ کو آزمایا اُس کے رب نے بہت سی باتوں میں تو اس نے ان سب کو پورا کر دکھایا۔''

''عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی'' کے عنوان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت پر میرا ایک کتابچہ ہے جو میری ایک تقریر اور ایک تحریر پر مشتمل ہے۔ تحریر کا عنوان ہے: ''حج اور عید الاضحیٰ اور اُن کی اصل روح''۔ اپنی یہ تحریر مجھے بہت پسند ہے۔ اس میں مَیں نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے امتحانات اور آزمائشوں کا ذکر کیا ہے۔ آپؑ کے طویل سفر حیات کا خلاصہ اور لب لباب ہی ''امتحان و آزمائش'' ہے' جس کے لیے قرآن کی اصطلاح ''ابتلاء'' ہے۔ اس آیت مبارکہ میں ان کی پوری داستانِ ابتلا کو چند الفاظ میں سمو دیا گیا ہے' اور ''فَاَتَمَّہُنَّ'' کا لفظ ان تمام امتحانات کا نتیجہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ ان سب میں پورا اُترے' ان سب میں پاس ہو گئے' ہر امتحان میں نمایاں حیثیت سے کامیابی حاصل کی۔

﴿قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾ ''تب فرمایا: (اے ابراہیمؑ!) اب میں تمہیں نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں!''

﴿قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ﴾ ''انہوں نے کہا: اور میری اولاد میں سے بھی!''

یعنی میری نسل کے بارے میں بھی یہ وعدہ ہے یا نہیں؟

﴿قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾﴾ ''فرمایا: میرا یہ عہد ظالموں سے متعلق نہیں ہوگا۔''

یعنی تمہاری نسل میں سے جو صاحب ایمان ہوں گے' نیک ہوں گے' سیدھے راستے پر چلیں گے' اُن سے متعلق ہمارا یہ وعدہ ہے۔ لیکن یہ عہد نسلیت کی بنیاد پر نہیں ہے کہ جو بھی تمہاری نسل سے ہو وہ اس کا مصداق بن جائے۔

آیت ۱۲۵ ﴿وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر (بیت اللہ) کو قرار دے دیا لوگوں کے لیے اجتماع (اور زیارت) کی جگہ اور اُسے امن کا گھر قرار دے دیا۔''

﴿وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی ؕ﴾ ''اور (ہم نے حکم دیا کہ) مقامِ ابراہیمؑ کو اپنی نماز پڑھنے کی جگہ بنا لو۔''

دورِ جدید کے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ مقامِ ابراہیمؑ سے مراد کوئی خاص پتھر نہیں ہے' بلکہ اصل میں وہ پوری جگہ ہی ''مقامِ ابراہیم'' ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام آباد ہوئے تھے۔ لیکن صحیح بات وہی ہے جو ہمارے سلف سے چلی آ رہی ہے اور اس کے بارے میں پختہ روایات ہیں کہ جس طرح حجر اسود جنت سے آیا تھا ایسے ہی یہ بھی ایک پتھر تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جنت سے لایا گیا تھا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے دوران آپؑ اس پر کھڑے ہوتے تھے اور جیسے جیسے تعمیر اُوپر جا رہی تھی اُس کے لیے یہ پتھر خود بخود اُونچا ہوتا جاتا تھا۔ اس پتھر پر آپؑ کے قدموں کا نشان ہے۔ یہی پتھر ''مقامِ ابراہیم'' ہے جو اَب بھی محفوظ ہے۔ بیت اللہ کا طواف مکمل کر کے اس کے قریب دو رکعت نماز ادا کی جاتی ہے۔

﴿وَعَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡعٰکِفِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾﴾ ''اور ہم نے حکم کیا تھا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو کہ تم دونوں میرے اس گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں' اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔''

اس سے دونوں طرح کی تطہیر مراد ہے۔ ظاہری صفائی بھی ہو' گندگی نہ ہو' تاکہ زائرین آئیں تو ان کے دلوں میں کدورت پیدا نہ ہو' انہیں کوفت نہ ہو۔ اور تطہیر باطنی کا بھی اہتمام ہو کہ وہاں توحید کا چرچا ہو' کسی طرح کا کوئی کفر و شرک در نہ آنے پائے۔

آیت ۱۲۶ ﴿وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ہٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ نے دعا کی تھی: اے میرے پروردگار! اس گھر کو امن کی جگہ بنا دے''

﴿وَّارۡزُقۡ اَہۡلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡہُمۡ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ﴾ ''اور یہاں آباد ہونے والوں (یعنی بنی اسماعیلؑ) کو پھلوں کا رزق عطا کر' جو کوئی ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخر پر۔''

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود ہی احتیاط برتی اور اپنی ساری اولاد کے لیے یہ دعا نہیں کی' بلکہ صرف ان کے لیے جو اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ پہلی دعا میں ''وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ'' کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا: ﴿لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾﴾ لیکن یہاں معاملہ مختلف نظر آتا ہے۔

﴿قَالَ وَمَنۡ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیۡلًا﴾ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور (تمہاری اولاد میں سے) جو کفر کرے گا تو اُس کو بھی میں دُنیا کی چند روزہ زندگی کا ساز و سامان تو دوں گا''

جو لوگ ایمان سے محروم ہوں گے انہیں میں امامت میں شامل نہیں کروں گا' لیکن بہرحال دُنیوی زندگی کا مال و متاع تو میں اُن کو بھی دوں گا۔

﴿ثُمَّ اَضۡطَرُّہٗۤ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ؕ﴾ ''پھر اُسے کشاں کشاں لے آؤں گا جہنم کے عذاب کی طرف۔''

﴿وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۲۶﴾﴾ ''اور وہ بہت بری جگہ ہے لوٹنے کی۔''

آیت ۱۲۷ ﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ ہمارے گھر کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے۔''

باپ بیٹا دونوں بیت اللہ کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں لفظ ''قَوَاعِدَ'' جو آیا ہے اسے نوٹ کیجیے یہ ''قاعدۃ'' کی جمع ہے اور بنیادوں کو کہا جاتا ہے۔ اس لفظ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خانہ کعبہ کے اصل معمار اور بانی نہیں ہیں۔ کعبہ سب سے پہلے حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا تھا۔ سورۂ آل عمران (آیت ۹۶) میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ﴾ ''بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا یہی ہے جو مکہ میں ہے''۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے لے کر حضرت ابراہیمؑ تک' کم و بیش چار ہزار برس کے دوران' روئے ارضی پر کوئی مسجد تعمیر نہ ہوئی ہو؟ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا سب سے پہلا گھر یہی کعبہ تھا۔ امتدادِ زمانہ سے اس کی صرف بنیادیں باقی رہ گئی تھیں' اور چونکہ یہ وادی میں واقع تھا جو سیلاب کا راستہ تھا' لہٰذا سیلاب کی وجہ سے اس کی سب دیواریں بہہ گئی تھیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام نے ان بنیادوں کو پھر سے اٹھایا۔ سورۃ الحج میں یہ مضمون تفصیل سے آیا ہے۔

جب وہ ان بنیادوں کو اٹھا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے تھے:

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے۔''

ہماری اس کوشش اور ہماری اس محنت و مشقت کو قبول فرما! جس وقت حضرت ابراہیمؑ بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے اُس وقت حضرت اسماعیلؑ کی عمر لگ بھگ تیرہ برس تھی' آپؑ اس کام میں اپنے والدِ محترم کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

﴿اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾﴾ ''یقیناً تو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

آیت ۱۲۸ ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ﴾ ''اور اے ہمارے رب! ہمیں اپنا مطیع فرمان بنائے رکھ''

نوٹ کیجیے' یہ دعا ابراہیمؑ کر رہے ہیں۔ تو میں اور آپ اگر اپنے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ میری موت لازماً حق پر ہوگی' اسلام پر ہوگی تو یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ چنانچہ ڈرتے رہنا چاہیے اور اللہ کی پناہ طلب کرتے رہنا چاہیے۔

﴿وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ۪﴾ ''اور ہم دونوں کی نسل سے ایک اُمت اٹھائیو جو تیری فرماں بردار ہو۔''

﴿وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا﴾ ''اور ہمیں حج کرنے کے قاعدے بتلا دے۔''

اے پروردگار! تیرا یہ گھر تو ہم نے بنا دیا' اب اس کی زیارت سے متعلق جو رسومات ہیں' جو مناسکِ حج ہیں وہ ہمیں سکھا دے۔

﴿وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ﴾ ''اور ہم پر اپنی توجہ فرما''۔ ہم پر اپنی شفقت کی نظر فرما۔

﴿اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾﴾ ''یقیناً تو ہی ہے بہت زیادہ توبہ کا قبول فرمانے والا (اور شفقت کے ساتھ رجوع کرنے والا) اور رحم فرمانے والا۔''

آیت ۱۲۹ ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ﴾ ''اور اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں اٹھائیو ایک رسول خود انہی میں سے''

فِیْھِمْ سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی نسل یعنی بنی اسماعیل مراد ہے۔ وہ دونوں دعا کر رہے تھے کہ پروردگار! ہماری اس نسل میں ایک رسول مبعوث فرمانا جو انہی میں سے ہو' باہر کا نہ ہو' تاکہ ان کے اور اس کے درمیان مغائرت اور اجنبیت کا کوئی پردہ حائل نہ ہو۔

﴿یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ﴾ ''جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے''

﴿وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ﴾ ''اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے''

کتاب کا صرف پڑھ کر سنا دینا تو بہت آسان کام ہے۔ اس کے بعد کتاب اور اس میں موجود حکمت کی تعلیم دینا اور اسے دلوں میں بٹھانا اہم تر ہے۔

﴿وَیُزَکِّیْھِمْ ؕ﴾ ''اور ان کو پاک کرے۔''

اُن کا تزکیہ کرے اور اُن کے دلوں میں تیری محبت اور آخرت کی طلب کے سوا کوئی طلب باقی نہ رہنے دے۔

﴿اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۱۲۹﴾﴾ ''یقیناً تو ہی ہے زبردست اور کمال حکمت والا۔''

آیات ۱۳۰ تا ۱۴۱

﴿وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰھٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ
الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰی بِہَاۤ اِبْرٰھٖمُ بَنِیْہِ وَیَعْقُوْبُ ؕ
یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ کُنْتُمْ شُھَدَآءَ اِذْ حَضَرَ
یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْہِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰـھَکَ وَاِلٰہَ اٰبَآئِکَ اِبْرٰھٖمَ
وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰـھًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ
مَّا کَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوْا کُوْنُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَھْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّۃَ
اِبْرٰھٖمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤی اِبْرٰھٖمَ
وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَاۤ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّہِمْ ۚ لَا
نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ ۫ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِہٖ فَقَدِ اھْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا

فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۱۳۷) صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (۱۳۸) قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ (۱۳۹) اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۴۰) تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۴۱)﴾

آیت ۱۳۰ ﴿وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ﴾ ’’اور کون ہوگا جو ابراہیمؑ کے طریقے سے منہ موڑے؟‘‘

رغبت کا لفظ عربی زبان میں دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ ’’رَغِبَ اِلٰی ‘‘ کا مفہوم ہے کسی شے کی طرف رغبت ہونا‘ محبت ہونا‘ میلان ہونا‘ جبکہ ’’رَغِبَ عَنْ ‘‘ کا مطلب ہے کسی شے سے متنفّر ہونا‘ کسی شے سے اِباء کرنا‘ اس کو چھوڑ دینا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ((فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))[(۱۵)] ’’پس جسے میری سنت ناپسند ہو تو وہ مجھ سے نہیں ہے۔‘‘

﴿اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ﴾ ’’سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو حماقت ہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہو!‘‘

اس کے سوا اور کون ہوگا جو ابراہیم علیہ السلام کے طریقے سے منہ موڑے؟

﴿وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ﴾ ’’اور ہم نے تو انہیں دنیا میں بھی منتخب کرلیا تھا۔‘‘

﴿وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۱۳۰)﴾ ’’اور یقیناً آخرت میں بھی وہ ہمارے صالح بندوں میں سے ہوں گے۔‘‘

آیت ۱۳۱ ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۳۱)﴾ ’’جب بھی کہا اُس سے اُس کے پروردگار نے کہ مطیع فرمان ہو جا تو اُس نے کہا میں مطیع فرمان ہوں تمام جہانوں کے پروردگار کا۔‘‘

یہاں تک کہ اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم آیا تو اس پر بھی سرِ تسلیم خم کر دیا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلۂ امتحانات کا آخری امتحان تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کا سو برس کی عمر میں لیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ مانگ کر ستاسی برس کی عمر میں بیٹا (اسماعیلؑ) لیا تھا اور اب وہ تیرہ برس کا ہو چکا تھا‘ باپ کا دست و بازو بن گیا تھا۔ اُس وقت اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو آپؑ فوراً تیار ہو گئے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جب بھی ہم نے ابراہیمؑ سے کہا کہ ہمارا حکم مانو تو اُسے حکم برداری کے لیے سراپا تیار پایا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس طرزِ عمل کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آیت ۱۳۲ ﴿وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ﴾ ’’اور اسی کی وصیت کی تھی ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے بھی۔‘‘

آگے وہ نصیحت بیان ہو رہی ہے:

﴿یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ﴾ ’’اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند فرمایا ہے‘‘

﴿فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۳۲)﴾ ’’پس تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان!‘‘

دیکھنا تمہیں موت نہ آنے پائے‘ مگر فرماں برداری کی حالت میں! یہی بات سورۂ آلِ عمران میں مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمائی گئی: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۲)﴾ ’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے‘ مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ اور فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آیت ۱۹) ’’یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے‘‘۔ مزید فرمایا: ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ (آیت ۸۵) ’’اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔‘‘

آیت ۱۳۳ ﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ﴾ ’’کیا تم اُس وقت موجود تھے جب آ دھمکی یعقوب پر موت‘‘

یعنی جب یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا۔ اُس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے سب بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے ذریعے مصر میں پہنچ چکے تھے۔ یہ سارا واقعہ سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا انتقال مصر میں ہوا۔ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے اپنے بارہ کے بارہ بیٹوں کو جمع کیا۔

﴿اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ﴾ ’’جب کہا اپنے بیٹوں سے کہ تم کس کی عبادت کرو گے میرے بعد؟‘‘

کس کی پوجا کرو گے؟ کس کی پرستش کرو گے؟ یہ بات نہیں تھی کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ انہیں کس کی عبادت کرنی ہے‘ بلکہ آپؑ نے قول و قرار کو مزید پختہ کرنے کے لیے یہ انداز اختیار فرمایا۔

﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ﴾ ’’انہوں نے کہا ہم بندگی کریں گے آپ کے معبود کی اور آپ کے آباء ابراہیم‘ اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی‘‘

﴿اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ﴾ ’’وہی ایک معبود ہے‘‘

﴿وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۳)﴾ ’’اور ہم سب اُسی کے مطیع فرمان ہیں۔‘‘

ہم اسی کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور اُسی کی فرماں برداری کا اقرار کرتے ہیں۔

آیت ۱۳۴ ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ﴾ ’’یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔‘‘

یہ آیت اس رکوع میں دو مرتبہ آئی ہے۔ یہ انسانوں کا ایک گروہ تھا جو گزر گیا۔ ابراہیم‘ اسماعیل‘ اسحاق‘ یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد سب گزر چکے۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ﴾ ’’اُن کے لیے تھا جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لیے ہوگا جو تم کماؤ گے۔‘‘

یہاں ’’پدرم سلطان بود‘‘ کا دعویٰ کوئی مقام نہیں رکھتا۔ ہر شخص کے لیے اپنا ایمان‘ اپنا عمل اور اپنی کمائی ہی کام آئے گی۔

﴿وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۳۴)﴾ ’’تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے‘‘۔ تم سے تو یہی پوچھا

جائے گا کہ تم کیا کر کے لائے ہو؟ تمہارا باپ سلطان ہوگا' لیکن تم اپنی بات کرو کہ تم کیا ہو؟

اس پس منظر میں اب یہود کی خباثت کو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ ابراہیم اور یعقوب علیہم السلام کی وصیت تو یہ تھی' مگر اس وقت کے یہود و نصاریٰ کا کیا رویہ ہے۔ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف متحدہ محاذ بنا رکھا ہے۔

آیت ۱۳۵ ﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں یا تو یہودی ہو جاؤ یا نصرانی تو ہدایت پر ہو جاؤ گے۔''

﴿قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ﴾ ''کہہ دیجیے نہیں' بلکہ (ہم تو پیروی کریں گے) ابراہیم کے طریقے کی بالکل یکسو ہو کر۔''

مِلَّةَ سے قبل فعل نَتَّبِعُ محذوف ہے۔ گویا: ''بَلْ نَتَّبِعُ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ''۔

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۳۵﴾ ''اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔''

اب مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ جو کچھ کہتے ہیں اس کے جواب میں تم یہ کہو:

آیت ۱۳۶ ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ''کہو ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر''

﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ ''اور جو کچھ نازل کیا گیا ہماری جانب''

﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ ''اور جو کچھ نازل کیا گیا ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف''

﴿وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى﴾ ''اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو''

﴿وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ﴾ ''اور جو کچھ دیا گیا تمام نبیوں کو ان کے ربّ کی طرف سے۔''

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ﴾ ''ہم اُن میں سے کسی کے مابین تفریق نہیں کرتے۔''

ہم سب کو مانتے ہیں' کسی کا انکار نہیں کرتے۔ ایک بات سمجھ لیجیے کہ ایک ہے ''تفضیل''، یعنی کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ افضل سمجھنا' یہ اور بات ہے' اس کی نفی نہیں ہے۔ سورۃ البقرۃ ہی میں الفاظ آئے ہیں: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾ (آیت ۲۵۳) ''یہ سب رسول فضیلت دی ہم نے بعض کو بعض پر''۔ جبکہ تفریق یہ ہے کہ ایک کو مانا جائے اور ایک کا انکار کر دیا جائے۔ اور رسولوں میں سے کسی ایک کا انکار گویا سب کا انکار ہے۔

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۶﴾ ''اور ہم اُسی کے مطیع فرمان ہیں۔''

ہم نے تو اُسی کی فرماں برداری کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا ہے۔

آیت ۱۳۷ ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ﴾ ''پھر (اے مسلمانو!) اگر وہ (یہود و نصاریٰ) بھی اُسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو''

یعنی وہ ضد اور ہٹ دھرمی کی روش ترک کر دیں اور ٹھیک وہی دین اور وہی راستہ اختیار کریں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے تمہیں دیا گیا ہے۔

﴿فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ﴾ ''تب وہ ہدایت پر ہوں گے۔''

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ ''اور اگر وہ پیٹھ موڑ لیں''

﴿فَاِنَّمَا هُمْ فِىْ شِقَاقٍ ۚ﴾ ''تو پھر وہی ہیں ضد پر۔''

اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہٹ دھرمی اور ضدم ضدا میں مبتلا ہو چکے ہیں اور دشمنی اور مخالفت پر اَڑے ہوئے ہیں۔

﴿فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ کے لیے ان کے مقابلے میں اللہ کافی ہے۔''

آپ فکر نہ کریں' آپؐ مداہنت (compromise) کی کسی دعوت کی طرف توجہ ہی نہ کریں' کچھ دو کچھ لو کا معاملہ آپ بالکل بھی نہ سوچیں۔ آپ ان کی مخالفتوں سے مرعوب نہ ہوں اور ان کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہ لیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی حمایت کے لیے ان سب کے مقابلے میں کافی رہے گا۔

﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۳۷﴾ ''اور وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

ایسا نہیں ہے کہ اُسے معلوم نہ ہو کہ آپؐ اس وقت کن حالات میں ہیں' کیسی مشکلات میں ہیں' کس طرح کی نازک صورت حال ہے جو دن بدن شکل بدل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے حالات میں آپ کا محافظ اور مددگار ہے۔

[حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہادت کے وقت قرآن حکیم کے جس نسخے پر تلاوت فرما رہے تھے اُس میں ان الفاظ پر خون کا دھبہ آج بھی موجود ہے۔ باغیوں نے آپؓ کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے شہید کیا تھا۔ آپؓ کی زوجہ محترمہ نائلہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو بچانا چاہا تو اُن کی انگلیاں کٹ گئیں اور خون ان الفاظ پر پڑا۔]

آیت ۱۳۸ ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ﴾ ''ہم نے تو اختیار کر لیا ہے اللہ کے رنگ کو۔''

''مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ'' کی طرح ''صِبْغَةَ اللّٰهِ'' میں بھی مضاف کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ مرکب اضافی مفعول ہے اور اس کا فعل محذوف ہے۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ﴾ ''اور اللہ کے رنگ سے بہتر اور کس کا رنگ ہوگا؟''

﴿وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝۱۳۸﴾ ''اور ہم تو بس اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔''

آیت ۱۳۹ ﴿قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ﴾ ''(اے نبی ﷺ اِن سے) کہیے کیا تم ہم سے جھگڑ رہے ہو (دلیل بازی کر رہے ہو) اللہ کے بارے میں؟''

﴿وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ﴾ ''حالانکہ وہی ہمارا ربّ بھی ہے اور تمہارا ربّ بھی۔''

ربّ بھی ایک ہے اور اس کا دین بھی ایک ہے' ہاں شریعتوں میں فرق ضرور رہا ہے۔

﴿وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ﴾ ''اور ہمارے لیے ہوں گے ہمارے عمل اور تمہارے لیے ہوں گے تمہارے

عمل۔''

﴿وَنَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ ﴿۱۳۹﴾﴾ ''اور ہم تو خالص اسی کے ہیں۔''

ہم اُس کے لیے اپنے آپ کو اور اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔

یہاں پے در پے آنے والے تین الفاظ کو نوٹ کیجیے۔ یہ مقام میرے اور آپ کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ آیت ۱۳۶ ان الفاظ پر ختم ہوئی تھی: ﴿وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۶﴾﴾ ''ہم اُسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں''۔ ان میں تو ہم بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد آیت ۱۳۸ کے اختتام پر یہ الفاظ آئے: ﴿وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾﴾ ''اور ہم اس ہی کی بندگی کرتے ہیں''۔ صرف اسلام نہیں، عبادت یعنی پوری زندگی میں اُس کے ہر حکم کی پیروی اور اطاعت درکار ہے۔ اس سے آگے یہ بات آئی: ﴿وَنَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ ﴿۱۳۹﴾﴾ یہ عبادت اگر اخلاص کے ساتھ نہیں ہے تو منافقت ہے۔ اس عبادت سے کوئی دُنیوی منفعت پیش نظر نہ ہو۔ ع ''سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے!'' دین کو دنیا بنانے اور دنیا کمانے کا ذریعہ بنانے سے بڑھ کر گری ہوئی حرکت اور کوئی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنۡ صَلّٰی یُرَائِیۡ فَقَدۡ اَشۡرَکَ وَمَنۡ صَامَ یُرَائِیۡ فَقَدۡ اَشۡرَکَ وَمَنۡ تَصَدَّقَ یُرَائِیۡ فَقَدۡ اَشۡرَکَ))

(مسند احمد)

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ وخیرات کیا اس نے شرک کیا۔''

ان تینوں الفاظ کو حرزِ جان بنا لیجیے: نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ، نَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ، نَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ — اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ!!

آیت ۱۴۰ ﴿اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطَ کَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ؕ﴾ ''کیا تمہارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، اور یعقوب اور ان کی اولاد سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟''

تم جو کہتے ہو کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی تب ہدایت پاؤ گے، تو کیا ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے یا نصرانی؟ اور اسحاق، یعقوب، یوسف، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کون تھے؟ یہی بات آج مسلمانوں کو سوچنی چاہیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ دیوبندی تھے، بریلوی تھے، اہل حدیث تھے یا شیعہ تھے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ ان تقسیموں سے بالاتر رہا جائے۔ ٹھیک ہے ایک شخص کسی فقہی مسلک کی پیروی کر رہا ہے، لیکن اس مسلک کو اپنی شناخت بنا لینا، اسے دین پر مقدم رکھنا، اس مسلک ہی کے لیے ہے ساری محنت ومشقت اور بھاگ دوڑ کرنا، اور اُسی کی دعوت وتبلیغ کرنا، دین کی اصل حقیقت اور روح کے یکسر خلاف ہے۔

﴿قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ﴾ ''کہیے: تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟''

﴿وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَتَمَ شَهَادَةً عِنۡدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور (کان کھول کر سن لو) اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی تھی جسے اس نے چھپا لیا؟''

علماءِ یہود جانتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، جن کے وہ منتظر تھے۔ لیکن وہ اس گواہی کو چھپائے بیٹھے تھے۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۰﴾﴾ ''اور اللہ ہرگز غافل نہیں ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔''

آیت ۱۴۱ ﴿تِلۡکَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ﴾ ''وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔''

یہ اس مقدس جماعت کے گل سرسبد تھے جن کا تذکرہ ہوا۔

﴿لَهَا مَا کَسَبَتۡ وَلَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ ۚ﴾ ''ان کے لیے ہے جو کمائی انہوں نے کی اور تمہارے لیے ہے جو کمائی تم نے کی۔''

جو عمل انہوں نے کمائے وہ ان کے لیے ہیں، تمہارے لیے نہیں۔ تمہارے لیے وہی ہوگا جو تم کماؤ گے۔

﴿وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۱﴾﴾ ''اور تم سے اُن کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔''

تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا، تم سے تو یہ سوال ہوگا کہ تم نے کیا کیا!

آیات ۱۴۲ تا ۱۵۲

﴿سَیَقُوۡلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمۡ عَنۡ قِبۡلَتِهِمُ الَّتِیۡ کَانُوۡا عَلَیۡهَا ؕ قُلۡ لِّلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ؕ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَهِیۡدًا ؕ وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَةَ الَّتِیۡ کُنۡتَ عَلَیۡهَآ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡهِ ؕ وَاِنۡ کَانَتۡ لَکَبِیۡرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیۡنَ هَدَی اللّٰهُ ؕ وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِکَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَةً تَرۡضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجۡهَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَحَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ شَطۡرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ لَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنۡ اَتَیۡتَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوۡا قِبۡلَتَکَ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَهُمۡ ۚ وَمَا بَعۡضُهُمۡ بِتَابِعٍ قِبۡلَةَ بَعۡضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَهٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَاِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡهُمۡ لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۱۴۷﴾ وَلِکُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّیۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِکُمُ اللّٰهُ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ

وَحَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ شَطۡرَہٗ ۙ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡکُمۡ حُجَّۃٌ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡہُمۡ ٭ فَلَا
تَخۡشَوۡہُمۡ وَاخۡشَوۡنِیۡ ٭ وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکُمۡ وَلَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ یَتۡلُوۡا
عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ وَیُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمۡ مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ
اَذۡکُرۡکُمۡ وَاشۡکُرُوۡا لِیۡ وَلَا تَکۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾

دو رکوعوں پر مشتمل تمہید کے بعد اب تحویل قبلہ کا مضمون براہِ راست آ رہا ہے‘ جو پورے دو رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے۔ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ کون سی ایسی بڑی بات تھی جس کے لیے قرآن مجید میں اتنے شدومدّ کے ساتھ اور اس قدر تفصیل بلکہ تکرار کے ساتھ بات کی گئی ہے؟ اس کو یوں سمجھئے کہ ایک خاص مذہبی ذہنیت ہوتی ہے‘ جس کے حامل لوگوں کی توجہ اعمال کے ظاہر پر زیادہ مرکوز ہو جاتی ہے اور اعمال کی روح ان کی توجہ کا مرکز نہیں بنتی۔ عوام الناس کا معاملہ بالعموم یہی ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں اصل اہمیت دین کے ظواہر اور مراسمِ عبودیت کو حاصل ہو جاتی ہے اور جو اصل روحِ دین ہے‘ جو مقاصدِ دین ہیں‘ ان کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ نتیجتاً ظواہر میں ذرا سا فرق بھی انہیں بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کی مثال یوں سامنے آتی ہے کہ احناف کی مسجد میں اگر کسی نے رفع یدین کر لیا یا کسی نے آمین ذرا اونچی آواز میں کہہ دیا تو گویا قیامت آ گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہماری مسجد میں کوئی اور ہی آ گیا۔ اس مذہبی ذہنیت کے پس منظر میں یہ کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں تھا۔

اس کے علاوہ یہ مسئلہ قبائلی اور قومی پس منظر کے حوالے سے بھی سمجھنا چاہیے۔ مکہ مکرمہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے ظاہر ہے ان سب کو خانہ کعبہ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ خود نبی اکرم ﷺ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی تو آپؐ روتے ہوئے وہاں سے نکلے تھے اور آپؐ نے فرمایا تھا کہ اے کعبہ! مجھے تجھ سے بڑی محبت ہے‘ لیکن تیرے یہاں کے رہنے والے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک آپ مکہ میں تھے تو آپؐ کعبہ کی جنوبی دیوار کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوتے۔ یوں آپؐ کا رُخ شمال کی طرف ہوتا‘ کعبہ آپؐ کے سامنے ہوتا اور اس کی سیدھ میں بیت المقدس بھی آ جاتا۔ اس طرح ’’استقبال القبلتین‘‘ کا اہتمام ہو جاتا۔ لیکن مدینہ میں آ کر آپؐ نے رُخ بدل دیا اور بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ یہاں ’’استقبال القبلتین‘‘ ممکن نہ تھا‘ اس لیے کہ یروشلم مدینہ منورہ کے شمال میں ہے‘ جبکہ مکہ مکرمہ جنوب میں ہے۔ اب اگر خانہ کعبہ کی طرف رُخ کریں گے تو یروشلم کی طرف پیٹھ ہو گی اور یروشلم کی طرف رُخ کریں گے تو کعبہ کی طرف پیٹھ ہو گی۔ چنانچہ اب اہل ایمان کا امتحان ہو گیا کہ آیا وہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی پیروی کرتے ہیں یا اپنی پرانی عقیدتوں اور پرانی روایات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جو لوگ مکہ مکرمہ سے آئے تھے ان کی اتنی تربیت ہو چکی تھی کہ ان میں سے کسی کے لیے یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ بقول اقبال: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

حالانکہ قرآن مجید میں کہیں منقول نہیں ہے کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ حکم وحی خفی کے ذریعے سے دیا گیا ہو‘ تاہم وحی جلی میں یہ حکم کہیں نہیں ہے کہ اب یروشلم کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیے۔ یہ مسلمانوں کا اتباعِ رسولؐ کے حوالے سے ایک امتحان تھا جس میں وہ سرخرو ہوئے۔ پھر جب یہ حکم آیا کہ اپنے رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو تو یہ اب اُن مسلمانوں کا امتحان تھا جو مدینہ کے رہنے والے تھے۔ اس لیے کہ ان میں سے بعض یہودیت ترک کر کے ایمان لائے تھے۔ مثلاً عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ علماءِ یہود میں سے تھے‘ لیکن جو اور دوسرے لوگ تھے وہ بھی علماءِ یہود کے زیر اثر تھے اور ان کے دل میں بھی یروشلم کی عظمت تھی۔ اب جب انہیں بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تو یہ اُن کے ایمان کا امتحان ہو گیا۔

مزید برآں بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوا ہو گا کہ اگر اصل قبلہ بیت اللہ تھا تو ہم نے اب تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے جو نمازیں پڑھی ہیں ان کا کیا بنے گا؟ کیا وہ نمازیں ضائع ہو گئیں؟ نماز تو ایمان کا رکن رکین ہے! چنانچہ اس اعتبار سے بھی بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مسئلہ سیاسی اعتبار سے یہ پیدا ہوا کہ یہود اب تک یہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں اور محمد ﷺ نے ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے‘ تو یہ گویا ہمارے ہی پیروکار ہیں‘ لہٰذا ہمیں ان کی طرف سے کوئی خاص اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن اب جب تحویل قبلہ کا حکم آ گیا تو ان کے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ تو کوئی نئی ملّت ہے اور ایک نئی اُمت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ چنانچہ ان کی طرف سے مخالفت کے اندر شدت پیدا ہو گئی۔ یہ سارے مضامین یہاں پر زیر بحث آ رہے ہیں۔

آیت ۱۴۲ ﴿سَیَقُوۡلُ السُّفَہَآءُ مِنَ النَّاسِ﴾ ’’عنقریب کہیں گے لوگوں میں سے احمق اور بیوقوف لوگ‘‘

﴿مَا وَلّٰىہُمۡ عَنۡ قِبۡلَتِہِمُ الَّتِیۡ کَانُوۡا عَلَیۡہَا ؕ﴾ ’’کس چیز نے پھیر دیا انہیں اس قبلے سے جس پر یہ تھے؟‘‘

یعنی سولہ سترہ مہینے تک انہوں نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی ہے‘ اب انہیں بیت اللہ کی طرف کس چیز نے پھیر دیا؟

﴿قُلۡ لِّلّٰہِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ؕ﴾ ’’کہہ دیجیے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب!‘‘

یہ وہی الفاظ ہیں جو چودھویں رکوع میں تحویل قبلہ کی تمہید کے طور پر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کسی ایک سمت میں محدود نہیں ہے‘ بلکہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سب اُسی کے ہیں۔

﴿یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۴۲﴾﴾ ’’وہ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دیتا ہے۔‘‘

آیت ۱۴۳ ﴿وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا﴾ ’’اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے‘‘

اب یہ خاص بات کہی جا رہی ہے کہ اے مسلمانو! تم اس تحویل قبلہ کو معمولی بات نہ سمجھو‘ یہ علامت ہے اس بات کی کہ اب تمہیں وہ حیثیت حاصل ہو گئی ہے:

﴿لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا ؕ﴾ ’’تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ

ہو۔‘‘

اب یہ تمہارا فرضِ منصبی ہے کہ رسولؐ نے جس دین کی گواہی تم پر اپنے قول وعمل سے دی ہے اُسی دین کی گواہی تمہیں اپنے قول اور عمل سے پوری نوعِ انسانی پر دینی ہے۔ اب تم محمد رسول اللہ ﷺ اور نوعِ انسانی کے درمیان واسطہ (link) بن گئے ہو۔ اب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک نبی کی تعلیم ختم ہو جاتی یا اس میں تحریف ہو جاتی تو دوسرا نبی آ جاتا۔ اس طرح پے در پے انبیاء ورُسل علیہم السلام چلے آ رہے تھے اور ہر دَور میں یہ معاملہ تسلسل کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہو رہی ہے، لیکن نسلِ انسانی کا سلسلہ تو قیامت تک جاری رہنا ہے۔ لہٰذا اب آگے لوگوں کو تبلیغ کرنا، ان تک دین پہنچانا، ان پر حجت قائم کرنا اور شہادت علی الناس کا فریضہ سرانجام دینا کس کی ذمہ داری ہوگی؟ پہلے تو ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ اللہ کی طرف سے جبرائیلؑ وحی لائے اور نبی کے پاس آ گئے، نبی نے لوگوں کو سکھا دیا۔ اب یہ معاملہ اس طرح ہے کہ اللہ سے جبرائیلؑ وحی لائے محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس اور محمد ﷺ نے سکھایا تمہیں، اور اب تمہیں سکھانا ہے پوری نوعِ انسانی کو! تو اب تمہاری حیثیت درمیانی واسطے کی ہے۔ یہ مضمون سورۃ الحج کی آخری آیات میں زیادہ وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

وَکَذٰلِکَ (اسی طرح) سے مراد یہ ہے کہ تحویل قبلہ اس کا ایک مظہر ہے۔ اس سے اب تم اپنی ذمہ داریوں کا اندازہ کرو۔ صرف خوشیاں نہ مناؤ، بلکہ ایک بہت بڑی ذمہ داری کا جو بوجھ تم پر آ گیا ہے اس کا ادراک کرو۔ یہی بوجھ جب ہم نے اپنے بندے محمد ﷺ کے کاندھوں پر رکھا تھا تو ان سے بھی کہا تھا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ⑤﴾ (المزمل) ’’(اے نبیؐ!) ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں‘‘۔ وہی بھاری بات بہت بڑے پیمانے پر اب تمہارے کاندھوں پر آ گئی ہے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْھَآ﴾ ’’اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر (اے نبی!) آپ پہلے تھے‘‘

﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ط﴾ ’’مگر یہ جاننے کے لیے (یہ ظاہر کرنے کے لیے) کہ کون رسولؐ کا اتباع کرتا ہے اور کون پھر جاتا ہے اُلٹے پاؤں!‘‘

یہاں اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بعد وحی ٔخفی کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کو بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ آنحضور ﷺ کا اجتہاد ہو اور اسے اللہ نے قبول فرما لیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد پر اگر اللہ کی طرف سے نفی نہ آئے تو وہ گویا اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا جانا ایک امتحان قرار دیا گیا کہ کون اتباعِ رسولؐ کی روش پر گامزن رہتا ہے اور کون دین سے پھر جاتا ہے۔ اس آزمائش میں تمام مسلمان کامیاب رہے اور ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ٹھیک ہے، ہمارا قبلہ وہ تھا، اب آپ نے اپنا قبلہ بدل لیا ہے تو آپ کا راستہ اور ہے ہمارا راستہ اور!

﴿وَاِنْ کَانَتْ لَکَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰهُ ط﴾ ’’اور یقیناً یہ بہت بڑی بات تھی مگر ان کے لیے (دشوار نہ تھی) جن کو اللہ نے ہدایت دی۔‘‘

واقعہ یہ ہے کہ اتنی بڑی تبدیلی قبول کر لینا آسان بات نہیں ہوتی۔ یہ بڑا حساس مسئلہ ہوتا ہے۔

﴿وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ ط﴾ ’’اور اللہ ہرگز تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔‘‘

ایمان سے یہاں مراد نماز ہے جسے دین کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات اس تشویش کے جواب میں فرمائی گئی جو بعض مسلمانوں کو لاحق ہو گئی تھی کہ ہماری ان نمازوں کا کیا بنے گا جو ہم نے سولہ مہینے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھی ہیں؟ مسلمان تو رسول اللہ ﷺ کے حکم کا پابند ہے، اُس وقت رسول کا وہ حکم تھا، وہ اللہ کے ہاں مقبول ٹھہرا، اِس وقت یہ حکم ہے جو تمہیں رسول کی جانب سے مل رہا ہے، اب تم اس کی پیروی کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۱۴۳﴾ ’’یقیناً اللہ تعالیٰ انسانوں کے حق میں بہت ہی شفیق اور بہت ہی رحیم ہے۔‘‘

آیت ۱۴۴ ﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَآءِ ج﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) بلاشبہ ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھتے رہے ہیں۔‘‘

معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو تحویل قبلہ کے فیصلے کا انتظار تھا اور آپ ﷺ پر بھی یہ وقفہ شاق گزر رہا تھا جس میں نماز پڑھتے ہوئے بیت اللہ کی طرف پیٹھ ہو رہی تھی۔ چنانچہ آپ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں کہ کب جبریل امین تحویل قبلہ کا حکم لے کر نازل ہوں۔

﴿فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ص﴾ ’’سو ہم پھیرے دیتے ہیں آپ کو اُسی قبلے کی طرف جو آپ کو پسند ہے۔‘‘

اس آیت میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ کی طرف سے بڑی محبت، بڑی شفقت اور بڑی عنایت کا اظہار ہو رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کے ساتھ بڑی محبت تھی، اس کے ساتھ آپؐ کا ایک رشتۂ قلبی تھا۔

﴿فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط﴾ ’’تو بس اب پھیر دیجیے اپنے رُخ کو مسجد حرام کی طرف!‘‘

﴿وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ ط﴾ ’’اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں بھی تم ہو اَب اپنا چہرہ (نماز میں) اسی کی طرف پھیرو۔‘‘

﴿وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ط﴾ ’’اور یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی، جانتے ہیں کہ یہ (تحویل قبلہ کا حکم) حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے۔‘‘

تورات میں بھی یہ مذکور تھا کہ اصل قبلۂ ابراہیمیؑ بیت اللہ ہی تھا۔ بیت المقدس کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک ہزار سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، جسے ’’ہیکل سلیمانی‘‘ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اَنَّهٗ سے مراد یہاں بیت اللہ کا اس اُمت کے لیے قبلہ ہونا ہے۔ اس بات کا حق ہونا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا یہود پر واضح تھا اور اس کے اشارات وقرائن تورات میں موجود تھے، لیکن یہود اپنے حسد اور عناد کے سبب اس حقیقت کو بھی دوسرے بہت سے حقائق کی طرح جانتے بوجھتے چھپاتے تھے۔ اس موضوع کو سمجھنے کے لیے مولانا حمید الدین فراہی کا رسالہ ’’الرأی الصحیح فی من هو الذبیح‘‘ بہت اہم ہے۔

جس کا اردو ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ''ذبیح کون ہے؟'' کے عنوان سے کیا ہے۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ١٤٤﴾ ''اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔''

آیت ۱۴۵ ﴿وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ج﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپ ان اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں پیش کر دیں تب بھی یہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔''

﴿وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ج﴾ ''اور نہ ہی اب آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلے کی۔''

یہ تو ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ والا معاملہ ہو گیا۔

﴿وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ط﴾ ''اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں۔''

حد یہ ہے کہ یہ خود آپس میں ایک دوسرے کے قبلے کی پیروی نہیں کرتے۔ اگرچہ یہود و نصاریٰ سب کا قبلہ یروشلم ہے' لیکن عین یروشلم میں جا کر یہودی ہیکل سلیمانی کا مغربی گوشہ اختیار کرتے تھے اور مغرب کی طرف رُخ کرتے تھے' جبکہ نصاریٰ مشرق کی طرف رُخ کرتے تھے' اس لیے کہ حضرت مریم سلامٌ علیہا نے جس مکان میں اعتکاف کیا تھا اور جہاں فرشتہ اُن کے پاس آیا تھا وہ ہیکل کے مشرقی گوشے میں تھا' جس کے لیے قرآن حکیم میں ''مَكَانًا شَرْقِيًّا'' کا لفظ آیا ہے۔ عیسائیوں نے اسی مشرقی گھر کو اپنا قبلہ بنا لیا۔

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ﴾ ''اور (اے نبیؐ! بالفرض) اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی''

﴿مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لا﴾ ''اُس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے''

﴿اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ١٤٥﴾ ''تو بلاشبہ آپ بھی ظلم کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔'' (معاذ اللہ!)

آیت ۱۴۶ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ط﴾ ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔''

یہاں یہ نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ قرآن حکیم میں تورات اور انجیل کے ماننے والوں میں سے غلط کاروں کے لیے مجہول کا صیغہ آتا ہے ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ ''جنہیں کتاب دی گئی تھی'' اور جو اُن میں سے صالحین تھے' صحیح رُخ پر تھے' ان کے لیے معروف کا صیغہ آتا ہے' جیسے یہاں آیا ہے۔ يَعْرِفُوْنَهٗ میں ضمیر (ہٗ) کا مرجع قبلہ بھی ہے' قرآن بھی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ بھی ہیں۔

﴿وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ﴾ ''البتہ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے''

﴿لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ١٤٦﴾ ''جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے۔''

آیت ۱۴۷ ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ ''یہ حق ہے آپؐ کے ربّ کی طرف سے''

اس کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے: ''حق وہی ہے جو آپ کے ربّ کی طرف سے ہے۔''

﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ١٤٧﴾ ''تو آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ بنیں۔''

خطاب کا رُخ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے اور آپؐ کی وساطت سے دراصل ہر مسلمان سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اس بارے میں کوئی شک و شبہ اپنے پاس مت آنے دو کہ یہی تو حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے۔

آیت ۱۴۸ ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ ''ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتا ہے''

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ط﴾ ''تو (مسلمانو!) تم نیکیوں میں سبقت کرو۔''

ہم نے تمہارے لیے ایک رُخ معیّن کر دیا' یعنی بیت اللہ۔ اور ایک باطنی رُخ تمہیں یہ اختیار کرنا ہے کہ نیکیوں کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ جیسے نماز کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے باوضو ہو کر قبلے کی طرف رخ کر لیا اور ارکانِ نماز ادا کیے۔ جبکہ نماز کا باطن خشوع و خضوع' حضورِ قلب اور رقتّ ہے۔ انسان کو یہ احساس ہو کہ وہ پروردگارِ عالم کے روبرو حاضر ہو رہا ہے۔

﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ط﴾ ''جہاں کہیں بھی تم ہو گے اللہ تم سب کو جمع کر کے لے آئے گا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ١٤٨﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۱۴۹ ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط﴾ ''اور جہاں کہیں سے بھی آپؐ نکلیں تو (نماز کے وقت) آپ اپنا رُخ پھیر لیجیے مسجد حرام کی طرف۔''

﴿وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ط﴾ ''اور یقیناً یہ حق ہے آپؐ کے ربّ کی طرف سے۔''

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ١٤٩﴾ ''اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو تم کر رہے ہو۔''

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' یہاں کلام بظاہر آنحضور ﷺ سے ہے' مگر اصل میں آپؐ کی وساطت سے تمام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ دوبارہ فرمایا گیا:

آیت ۱۵۰ ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط﴾ ''اور جہاں کہیں سے بھی آپؐ نکلیں تو آپ اپنا رُخ (نماز کے وقت) مسجد حرام ہی کی طرف کیجیے۔''

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ لا﴾ ''اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں بھی تم ہو تو (نماز کے وقت) اپنے چہروں کو اسی کی جانب پھیر دو''

تم خواہ امریکہ میں ہو یا روس میں' نماز کے وقت تمہیں بیت اللہ ہی کی طرف رُخ کرنا ہو گا۔

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ لا﴾ ''تا کہ باقی نہ رہے لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل''

یعنی اہل کتاب بالخصوص یہود کے لیے تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے کا کوئی موقع باقی نہ رہ جائے۔ تورات میں مذکور تھا کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ خانہ کعبہ ہو گا۔ اگر آنحضور ﷺ یہ قبلہ اختیار نہ کرتے تو علماء یہود مسلمانوں پر حجت قائم کرتے۔ تو یہ گویا ان کے اوپر اتمامِ حجت بھی ہو رہا ہے اور قطع عذر بھی۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ق﴾ ''سوائے ان کے جو اُن میں سے ظالم ہیں۔''

شریر لوگ اس قطع حجت کے بعد بھی باز آنے والے نہیں اور وہ اعتراض کرنے کے لیے لاکھ حیلے بہانے بنائیں گے' ان

کی زبان کسی حال میں بند نہ ہو گی۔

﴿فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ﴾ ''تو (اے مسلمانو!) ان سے نہ ڈرو''

﴿وَاخۡشَوۡنِيۡ﴾ ''اور مجھ سے ڈرو۔''

﴿وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِيۡ عَلَيۡكُمۡ﴾ ''اور اس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت تمام کر دوں''

یہ جو تحویلِ قبلہ کا معاملہ ہوا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی بنیاد پر ایک نئی اُمت تشکیل دی جا رہی ہے' اسے امامت الناس سے سرفراز کیا جا رہا ہے اور وراثتِ ابراہیمیؑ اب اسے منتقل ہو گئی ہے' یہ اس لیے ہے تاکہ اے مسلمانو! میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں۔

﴿وَلَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ﴾ ''اور تاکہ تم ہدایت یافتہ بن جاؤ۔''

آیت ۱۵۱ ﴿كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ﴾ ''جیسے کہ ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے درمیان ایک رسول خود تم میں سے''

﴿يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا﴾ ''وہ تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات''

﴿وَيُزَكِّيۡكُمۡ﴾ ''اور تمہیں پاک کرتا ہے'' (تمہارا تزکیہ کرتا ہے)

﴿وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ﴾ ''اور تمہیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی''

﴿وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ ''اور تمہیں تعلیم دیتا ہے ان چیزوں کی جو تمہیں معلوم نہیں تھیں۔''

یہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا یاد کر لیجیے جو آیت ۱۲۹ میں مذکور ہوئی۔ اس دعا کا ظہور تین ہزار برس بعد بعثتِ محمدیؐ کی شکل میں ہو رہا ہے۔ یہاں ایک نکتہ بڑا اہم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا میں جو ترتیب تھی' یہاں اللہ نے اس کو بدل دیا ہے۔ دعا میں ترتیب یہ تھی: تلاوتِ آیات' تعلیم کتاب و حکمت' پھر تزکیہ۔ یہاں پہلے تلاوتِ آیات' پھر تزکیہ اور پھر تعلیم کتاب و حکمت آیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے جو بات کہی وہ بھی غلط تو نہیں ہو سکتی' لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تنفیذ شدہ (imposed) صورت یہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی۔ اس لیے کہ تزکیہ مقدم ہے' اگر نیت صحیح نہیں ہے تو تعلیم کتاب و حکمت مفید نہیں ہو گی' بلکہ گمراہی میں اضافہ ہو گا۔ نیت کج ہے تو گمراہی بڑھتی چلی جائے گی۔ تزکیہ کا حاصل اخلاص ہے' یعنی نیت درست ہو جائے۔ اگر یہ نہیں ہے تو کوئی جتنا بڑا عالم ہو گا وہ اتنا بڑا شیطان بھی بن سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑے بڑے فتنے عالموں نے ہی اٹھائے ہیں۔ ''دین اکبری'' یا ''دین الٰہی'' کی تدوین کا خیال تو اکبر کے باپ دادا کو بھی نہیں آ سکتا تھا' یہ تو ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء تھے جنہوں نے اسے یہ پٹی پڑھائی۔ اسی طرح غلام احمد قادیانی کو بھی الٹی پٹیاں پڑھانے والا حکیم نور الدین تھا' جو بہت بڑا اہل حدیث عالم تھا۔ تو درحقیقت کوئی جتنا بڑا عالم ہو گا اگر اس کی نیت کج ہو گئی تو وہ اتنا ہی بڑا فتنہ اٹھا دے گا۔ اس پہلو سے تزکیہ مقدم ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہی مضمون سورۂ آل عمران میں اور پھر سورۃ الجمعہ میں بھی آیا ہے' وہاں بھی ترتیب یہی ہے: (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیم کتاب و حکمت۔

آیت ۱۵۲ ﴿فَاذۡكُرُوۡنِيۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ﴾ ''پس تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا''

یہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان ایک بہت بڑا میثاق اور معاہدہ ہے۔ اس کی شرح ایک حدیث قدسی میں بایں الفاظ آئی ہے: ((اَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَكَرَنِيۡ' فَاِنۡ ذَكَرَنِيۡ فِيۡ نَفۡسِهٖ ذَكَرۡتُهٗ فِيۡ نَفۡسِيۡ' وَاِنۡ ذَكَرَنِيۡ فِيۡ مَلَاٍ ذَكَرۡتُهٗ فِيۡ مَلَاٍ خَيۡرٍ مِنۡهُمۡ)) (۱۶) ''میرا بندہ جب مجھے یاد کرتا ہے تو میں اُس کے پاس ہوتا ہوں' اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں' اور اگر وہ مجھے کسی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہت بہتر محفل میں یاد کرتا ہوں''۔ اُس کی محفل تو بہت بلند و بالا ہے' وہ ملأ اعلیٰ کی محفل ہے' ملائکہ مقربین کی محفل ہے۔ امیر خسروؔ معلوم نہیں کس عالم میں یہ شعر کہہ گئے تھے: ؎

خدا خود میر محفل بود اندر لامکاں خسروؔ
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم!

﴿وَاشۡكُرُوۡا لِيۡ وَلَا تَكۡفُرُوۡنِ﴾ ''اور میرا شکر کرو' میری ناشکری مت کرنا۔''

میری نعمتوں کا ادراک کرو' ان کا شعور حاصل کرو۔ زبان سے بھی میری نعمتوں کا شکر ادا کرو اور اپنے عمل سے بھی' اپنے اعضاء و جوارح سے بھی ان نعمتوں کا حق ادا کرو۔

یہاں اس سورۂ مبارکہ کا نصف اوّل مکمل ہو گیا ہے جو اٹھارہ رکوعوں پر مشتمل ہے۔

آیات ۱۵۳ تا ۱۶۳

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ
سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّلٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ
وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا
لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَرَحۡمَۃٌ ۟ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾
اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَۃَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ ۚ فَمَنۡ حَجَّ الۡبَیۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِ اَنۡ یَّطَّوَّفَ بِہِمَا ؕ وَمَنۡ
تَطَوَّعَ خَیۡرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالۡہُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا
بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَیَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَبَیَّنُوۡا
فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡہِمۡ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَہُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ
لَعۡنَۃُ اللّٰہِ وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ وَلَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾
وَاِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶۳﴾﴾

سورۃ البقرۃ کے انیسویں رکوع سے اب اُمتِ مسلمہ سے براہِ راست خطاب ہے۔ اس سے قبل اس اُمت کی غرضِ تاسیس بایں الفاظ بیان کی جا چکی ہے: ﴿لِتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا ؕ﴾ (آیت ۱۴۳) ''تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسولؐ تم پر گواہی دینے والا بنے''۔ گویا اب تم ہمیشہ ہمیش کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ اور نوعِ انسانی کے درمیان واسطہ ہو۔ ایک حدیث میں علماءِ حق کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ((اِنَّ الْعُلَمَاءَ ھُمْ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ))[17] ''یقیناً علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں''۔ اس لیے کہ اب نبوت تو ختم ہو گئی خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ پر' لیکن یہ آخری کتاب قیامت تک رہے گی' اس کو پہنچانا ہے' اس کو عام کرنا ہے' اور صرف تبلیغ سے نہیں عمل کر کے دکھانا ہے۔ وہ نظام عملاً قائم کر کے دکھانا ہے جو محمد عربی ﷺ نے قائم کیا تھا' تب حجت قائم ہو گی۔ اس کے لیے تمہیں قربانیاں دینی ہوں گی' مشکلات جھیلنی ہوں گی' جان و مال کا نقصان برداشت کرنا ہو گا۔ آرام سے گھر بیٹھے' ٹھنڈے پیٹوں حق نہیں آ جائے گا' کفر اس طرح جگہ نہیں چھوڑے گا۔ کفر کو ہٹانے کے لیے' باطل کو ختم کرنے کے لیے اور حق کو قائم کرنے کے لیے تمہیں تن من دھن لگانے ہوں گے۔ چنانچہ اب پکار آ رہی ہے:

آیت ۱۵۳ ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ﴾ ''اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو۔''

پانچویں رکوع کی سات آیات کو میں نے بنی اسرائیل سے خطاب کے ضمن میں بمنزلہ فاتحہ قرار دیا تھا۔ وہاں پر یہ الفاظ

آئے تھے: ﴿وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ وَاِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّہِمۡ وَاَنَّہُمۡ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور مدد چاہو صبر اور نماز سے' اور یقیناً یہ بھاری چیز ہے مگر ان لوگوں کے لیے جوڑنے والے ہیں' جو گمان رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ربّ سے ملاقات کرنے والے ہیں اور وہ اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔ اب یہی بات اہلِ ایمان سے کہی جا رہی ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾﴾ ''جان لو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی معیت سے کیا مراد ہے! ایک بات تو متفق علیہ ہے کہ اللہ کی مدد' اللہ کی تائید' اللہ کی نصرت ان کے شاملِ حال ہے۔ باقی یہ کہ جہاں کہیں بھی ہم ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی کیفیت ہم نہیں جانتے' لیکن خود اس کا فرمان ہے کہ ''ہم تو انسان سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ (ق:۱۶)

آیت ۱۵۴ ﴿وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ؕ﴾ ''اور مت کہو اُن کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں کہ وہ مُردہ ہیں۔''

اب پہلے ہی قدم پر اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی بات آ گئی ع ''شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!'' ایمان کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ جانیں دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

﴿بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّلٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾﴾ ''(وہ مُردہ نہیں ہیں) بلکہ زندہ ہیں' لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔''

جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں ان کو جنت میں داخلہ کے لیے یومِ آخرت تک انتظار نہیں کرنا ہو گا' شہداء کو تو اُسی وقت براہِ راست جنت میں داخلہ ملتا ہے' لہٰذا وہ تو زندہ ہیں۔ یہی مضمون سورۂ آلِ عمران میں اور زیادہ نکھر کر سامنے آئے گا۔

آیت ۱۵۵ ﴿وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ﴾ ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے''

دیکھ لو' جس راہ میں تم نے قدم رکھا ہے یہاں اب آزمائشیں آئیں گی' تکلیفیں آئیں گی۔ رشتہ دار ناراض ہوں گے' شوہر اور بیوی کے درمیان تفریق ہو گی' اولاد والدین سے جدا ہو گی' فساد ہو گا' فتور ہو گا' تصادم ہو گا' جان و مال کا نقصان ہو گا۔ ہم خوف کی کیفیت سے بھی تمہاری آزمائش کریں گے اور بھوک سے بھی۔ چنانچہ صحابہ کرام ؓ نے کیسی کیسی سختیاں جھیلیں اور کئی کئی روز کے فاقے برداشت کیے۔ غزوۂ احزاب میں کیا حالات پیش آئے ہیں! اس کے بعد جیش العسرۃ (غزوۂ تبوک) میں کیا کچھ ہوا ہے!

﴿وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ ''اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے۔''

مالی اور جانی نقصان بھی ہوں گے اور ثمرات کا نقصان بھی ہو گا۔ ''ثمرات'' یہاں دو معنی دے رہا ہے۔ مدینہ والوں کی معیشت کا دارومدار زراعت اور باغبانی پر تھا۔ خاص طور پر کھجوران کی پیداوار تھی' جسے آج کی اصطلاح میں cash crop کہا

جائے گا۔ اب ایسا بھی ہوا کہ فصل پک کر تیار کھڑی ہے اور اگر اسے درختوں سے اتارا نہ گیا تو ضائع ہو جائے گی' اُدھر سے غزوۂ تبوک کا حکم آ گیا کہ نکلو اللہ کی راہ میں! تو یہ امتحان ہے ثمرات کے نقصان کا۔ اس کے علاوہ ثمرات کا ایک اور مفہوم ہے۔ انسان بہت محنت کرتا ہے' جدوجہد کرتا ہے' ایک کیریئر اپناتا ہے اور اس میں اپنا ایک مقام بنا لیتا ہے۔ لیکن جب وہ دین کے راستے پر آتا ہے تو کچھ اور ہی شکل اختیار کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اپنی تجارت کے جمانے میں یا کسی پروفیشن میں اپنا مقام بنانے میں اُس نے جو محنت کی تھی وہ سب کی سب صفر ہو کر رہ جاتی ہے' اور اپنی محنت کے ثمرات سے بالکل تہی دامن ہو کر اسے اس وادی میں آنا پڑتا ہے۔

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾﴾ ''اور (اے نبیؐ) بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو۔''

آیت ۱۵۶ ﴿اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ﴾ ''وہ لوگ کہ جن کو جب بھی کوئی مصیبت آئے''

﴿قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾﴾ ''تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے۔''

آخر کار تو یہاں سے جانا ہے' اگر کل کی بجائے ہمیں آج ہی بلا لیا جائے تب بھی حاضر ہیں۔ بقول اقبال :

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

یعنی مردِ مؤمن کی تو نشانی ہی یہی ہے کہ جب موت آتی ہے تو مسرت کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ وہ دنیا سے مسکراتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ یہ ایمان کی علامت ہے اور بندۂ مؤمن اس دنیا میں زیادہ دیر تک رہنے کی خواہش نہیں کر سکتا۔ اسے معلوم ہے کہ وہ دنیا میں جو لمحہ بھی گزار رہا ہے اسے اس کا حساب دینا ہو گا۔ تو جتنی عمر بڑھ رہی ہے حساب بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ حدیث میں دنیا کو مؤمن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت قرار دیا گیا ہے: ((اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ)) (۱۸)

آیت ۱۵۷ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟﴾ ''یہی ہیں وہ لوگ کہ جن پر اُن کے ربّ کی عنایتیں ہیں اور رحمت۔''

ان پر ہر وقت اللہ کی عنایتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے اور رحمت کی بارش ہوتی رہتی ہے۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ ''اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے واقعتاً ہدایت کو اختیار کیا ہے۔ اور جو ایسے مرحلے پر ٹھٹک کر کھڑے رہ جائیں' پیچھے ہٹ کر بیٹھ جائیں' پیٹھ موڑ لیں تو گویا وہ ہدایت سے تہی دامن ہیں۔

آیت ۱۵۸ ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''یقیناً صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔''

یہ آیت اصل سلسلۂ بحث یعنی قبلہ کی بحث سے متعلق ہے۔ بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ حج کے مناسک میں یہ جو صفا اور مروہ کی سعی ہے تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ فرمایا کہ یہ بھی اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ شعائر' شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو شعور بخشے' جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان ہو۔ چنانچہ وہ مظاہر جن کے ساتھ اولوالعزم پیغمبروں یا اولوالعزم اولیاء اللہ کے حالات و واقعات کا کوئی ذہنی سلسلہ قائم ہوتا ہو اور جو اللہ اور رسولؐ کی طرف سے بطور ایک نشان اور علامت مقرر کیے گئے ہوں شعائر کہلاتے ہیں۔ وہ گویا بعض معنوی حقائق کا شعور دلانے والے اور ذہن کو اللہ کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے بیت اللہ' حجر اسود' جمرات اور صفا و مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں۔

﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ﴾ ''تو جو کوئی بھی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے کہ ان دونوں کا طواف بھی کرے۔''

صفا مروہ کے طواف سے مراد وہ سعی ہے جو ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات چکروں کی صورت میں کی جاتی ہے۔

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ﴾ ''اور جو شخص خوش دلی سے کوئی بھلائی کا کام کرتا ہے''

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۵۸﴾﴾ ''تو (جان لو کہ) اللہ بڑا قدردان ہے' جاننے والا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ''شاکر'' آیا ہے۔ لفظ شکر کی نسبت جب بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی شکر گزاری اور احسان مندی کے ہوتے ہیں' لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی قدردانی اور قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ ''شاکر'' کے ساتھ دوسری صفت ''علیم'' آئی ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ چاہے کسی اور کو پتا نہ لگے اسے تو خوب معلوم ہے۔ اگر تم نے اللہ کی رضاجوئی کے لیے کسی کو کوئی مالی مدد دی ہے' اس حال میں کہ داہنے ہاتھ نے جو کچھ دیا ہے اس کی بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہونے دی' کجا یہ کہ کسی اور انسان کے سامنے اس کا تذکرہ ہو' تو یہ اللہ کے تو علم میں ہے' چنانچہ اگر اللہ سے اجر و ثواب چاہتے ہو تو اپنی نیکیوں کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوئی ضرورت نہیں' لیکن اگر تم نے یہ سب کچھ لوگوں کو دکھانے کے لیے کیا تھا تو گویا وہ شرک ہو گیا۔

آیت ۱۵۹ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اُس شے کو جو ہم نے نازل کی بیّنات میں سے اور ہدایت میں سے''

﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ ۙ﴾ ''بعد اس کے کہ ہم نے اس کو واضح کر دیا ہے لوگوں کے لیے کتاب میں''

﴿اُولٰٓئِكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾﴾ ''تو وہی لوگ ہیں کہ جن پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں تمام لعنت کرنے والے۔''

اس آیت میں یہود کی طرف اشارہ ہے' جن کی معاندانہ روش کا ذکر پہلے گزر چکا۔ یہاں اب گویا آخری قطعی صفائی (mopping up operation) کے طور پر ان کے بارے میں چند باتوں کا مزید اضافہ کیا جا رہا ہے۔ یہاں بیّنات اور ہدیٰ سے خاص طور پر وہ نشانیاں مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں نبی آخر الزماں ﷺ کے بارے میں یہود کی راہنمائی کے لیے واضح فرمائی تھیں۔ لیکن یہود نے ان نشانیوں سے راہنمائی حاصل کرنے کے بجائے ان کو چھپانے کی کوشش کی۔ آیت ۱۴۰ میں

ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾ ''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی تھی جسے اُس نے چھپالیا''۔ یہاں اسی کی وضاحت ہو رہی ہے کہ تورات اور انجیل میں کیسی کیسی کھلی شہادتیں تھیں، اور ان کو یہ چھپائے پھر رہے ہیں!

آیت ۱۶۰ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا﴾ ''سوائے ان کے جو توبہ کریں اور اصلاح کرلیں اور (جو کچھ چھپاتے تھے اسے) واضح طور پر بیان کرنے لگیں''

﴿فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ﴾ ''تو ان کی توبہ میں قبول کروں گا۔''
میں اپنی نگاہِ التفات ان کی طرف متوجہ کردوں گا۔

﴿وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۱۶۰﴾ ''اور میں تو ہوں ہی توبہ کا قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا۔''

آیت ۱۶۱ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ ''یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ اسی حال میں مر گئے کہ کفر پر قائم تھے''

﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۶۱﴾ ''ان پر لعنت ہے اللہ کی بھی اور فرشتوں کی بھی اور تمام انسانوں کی بھی۔''

آیت ۱۶۲ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ﴾ ''اسی (لعنت کی کیفیت) میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ ''نہ ان پر سے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی''

﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝۱۶۲﴾ ''اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔''

عذاب کا تسلسل ہمیشہ قائم رہے گا۔ ایسا نہیں ہوگا کہ ذرا سی دیر کے لیے وقفہ ہوجائے یا سانس لینے کی مہلت ہی مل جائے۔

آیت ۱۶۳ ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ ''اور تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے۔''

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝۱۶۳﴾ ''اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے۔''
رحمٰن اور رحیم کی وضاحت سورۃ الفاتحہ میں گزر چکی ہے۔

آیات ۱۶۴ تا ۱۶۷

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ مَّاۗءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۶۴ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝۱۶۵ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝۱۶۶ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۝۱۶۷﴾

اب جو آیت آ رہی ہے اس کے مطالعہ سے پہلے ایک بات سمجھ لیجیے کہ سورۃ البقرۃ کا نصف ثانی جو بائیس رکوعوں پر مشتمل ہے اور جس کا آغاز انیسویں رکوع سے ہوا ہے، اس میں ترتیب کیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کے پہلے اٹھارہ رکوعوں کی تقسیم عمودی (verticle) ہے۔ یعنی چار رکوع اِدھر، دس درمیان میں، پھر چار اُدھر۔ لیکن انیسویں رکوع سے اب اُفقی (horizontal) تقسیم کا آغاز ہوگیا ہے۔ اس حصے میں چار مضامین تانے بانے کی طرح بنے ہوئے ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ چار لڑیاں ہیں جن کو بٹ کر رسّی بنا دیا گیا ہے۔ ان چار میں سے دو لڑیاں تو شریعت کی ہیں، جن میں سے ایک عبادات کی اور دوسری احکام و شرائع کی ہے کہ یہ واجب ہے، یہ کرنا ہے، یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ نماز فرض ہے، روزہ فرض ہے، وغیرہ وغیرہ۔ احکام و شرائع میں خاص طور پر شوہر اور بیوی کے تعلق کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس لیے کہ معاشرتِ انسانی کی بنیاد یہی ہے۔ لہٰذا اس سورت میں آپ دیکھیں گے کہ عائلی قوانین کے ضمن میں تفصیلی احکام آئیں گے۔ جبکہ دوسری دو لڑیاں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کی ہیں۔ جہاد بالنفس کی آخری انتہا قتال ہے جہاں انسان نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں حاضر ہو جاتا ہے۔

اب ان چاروں مضامین یا چاروں لڑیوں کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے۔ فرض کیجیے ایک سرخ لڑی ہے، ایک پیلی ہے، ایک نیلی ہے اور ایک سبز ہے، اور ان چاروں لڑیوں کو ایک رسّی کی صورت میں بٹ دیا گیا ہے۔ آپ اس رسّی کو دیکھیں گے تو چاروں رنگ کٹے پھٹے نظر آئیں گے۔ پہلے سرخ، پھر پیلا، پھر نیلا اور پھر سبز نظر آئے گا۔ لیکن اگر رسّی کے بل کھول دیں تو ہر لڑی مسلسل نظر آئے گی۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کے نصف آخر میں عبادات، احکامِ شریعت، جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کے چار مضامین چار لڑیوں کی مانند گتھے ہوئے ہیں۔ یہ چاروں لڑیاں تانے بانے کی طرح بنی ہوئی ہیں۔ لیکن اسی بیچ میں بہت بڑے بڑے پھول موجود ہیں۔ یہ پھول قرآن مجید کی عظیم ترین اور طویل آیات ہیں، جن کی نمایاں ترین مثال آیت الکرسی کی ہے۔ ان عظیم آیات میں سے ایک آیت یہاں بیسویں رکوع کے آغاز میں آ رہی ہے، جسے میں نے ''آیت الآیات'' کا عنوان دیا ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی کسی اور آیت میں اس قدر مظاہر فطرت (phenomena of nature) یکجا نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مظاہر فطرت کو اپنی آیات قرار دیتا ہے۔ آسمان اور زمین کی تخلیق، رات اور دن کا اُلٹ پھیر، آسمان کے ستارے اور زمین کی نباتات، یہ سب آیات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے، لیکن یہاں بہت سے مظاہر فطرت کو جس طرح

ایک آیت میں سمویا گیا ہے یہ حکمتِ قرآنی کا ایک بہت بڑا پھول ہے جو ان چار لڑیوں کی بُنتی کے اندر آ گیا ہے۔

آیت ۱۶۴ ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ﴾ ''یقیناً آسمان اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں''

﴿وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ﴾ ''اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں''

﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ﴾ ''اور اُس پانی میں کہ جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے''

﴿فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ ''پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد''

بے آب و گیاہ زمین پڑی تھی‘ بارش ہوئی تو اسی میں سے روئیدگی آ گئی۔

﴿وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ ''اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے۔''

﴿وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ﴾ ''اور ہواؤں کی گردش میں''

ہواؤں کی گردش کے مختلف انداز اور مختلف پہلو ہیں۔ کبھی شمالاً جنوباً چل رہی ہے‘ کبھی مشرق سے آ رہی ہے‘ کبھی مغرب سے آ رہی ہے۔ اس گردش میں بڑی حکمتیں کارفرما ہیں۔

﴿وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اور ان بادلوں میں جو معلّق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان''

﴿لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ ''یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

ان مظاہر فطرت کو دیکھو اور ان کے خالق اور مدبر کو پہچانو! ان آیاتِ آفاقی پر غور وفکر اور ان کے خالق کو پہچاننے کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے اور جس تک عام طور پر لوگ نہیں پہنچ پاتے اب اگلی آیت میں اس کا تذکرہ ہے۔ نتیجہ تو یہ نکلنا چاہیے کہ پھر محبوب اللہ ہی ہو‘ شکر اسی کا ہو‘ اطاعت اسی کی ہو‘ عبادت اسی کی ہو۔ جب سورج میں اپنا کچھ نہیں‘ اسے اللہ نے بنایا ہے اور اسے حرارت عطا کی ہے‘ چاند میں کچھ نہیں‘ ہوائیں چلانے والا بھی وہی ہے تو اور کسی شے کے لیے کوئی شکر نہیں‘ کوئی عبادت نہیں‘ کوئی ڈنڈوت نہیں‘ کوئی سجدہ نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہی مطلوب و مقصود بن جائے‘ وہی محبوب ہو۔ لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ‘ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ‘ لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ — جن لوگوں کی یہاں تک رسائی نہیں ہو پاتی وہ کسی اور شے کو اپنا محبوب و مطلوب بنا کر اس کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ خدا تک نہیں پہنچے تو ع ''اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں'' کے مصداق اپنے نفس ہی کو معبود بنا لیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی میں لگ گئے۔ کچھ لوگوں نے اپنی قوم کو معبود بنا لیا اور قوم کی برتری اور سربلندی کے لیے جانیں بھی دے رہے ہیں۔ بعض نے وطن کو معبود بنا لیا۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے سمجھا ہے کہ اس دَور کا سب سے بڑا بُت وطن ہے۔ ان کی نظم ''وطنیت'' ملاحظہ کیجیے: ؎

اِس دَور میں مَے اور ہے‘ جام اور ہے‘ جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

اگلی آیت میں تمام معبودانِ باطل کی نفی کر کے ایک اللہ کو اپنا محبوب اور مطلوب و مقصود بنانے کی دعوت دی گئی ہے۔

آیت ۱۶۵ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا﴾ ''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو اس کا ہمسر اور مدّمقابل بنا دیتے ہیں''

﴿یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ﴾ ''وہ ان سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے۔''

یہ دراصل ایک فلسفہ ہے کہ ہر باشعور انسان کسی شے کو اپنا آئیڈیل‘ نصب العین یا آدرش ٹھہراتا ہے اور پھر اس سے بھرپور محبت کرتا ہے‘ اس کے لیے جیتا ہے‘ اس کے لیے مرتا ہے‘ قربانیاں دیتا ہے‘ ایثار کرتا ہے۔ چنانچہ کوئی قوم کے لیے‘ کوئی وطن کے لیے اور کوئی خود اپنی ذات کے لیے قربانی دیتا ہے۔ لیکن بندۂ مؤمن یہ سارے کام اللہ کے لیے کرتا ہے۔ وہ اپنا مطلوب و مقصود اور محبوب صرف اللہ کو بناتا ہے۔ وہ اُسی کے لیے جیتا ہے‘ اُسی کے لیے مرتا ہے: ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ''بے شک میری نماز‘ میری قربانی‘ میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔ اس کے برعکس عام انسانوں کا معاملہ یہی ہوتا ہے کہ: ؎

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

انسان اپنے ذہن سے معبود تراشتا رہتا ہے‘ ان سے محبت کرتا ہے اور ان کے لیے قربانیاں دیتا ہے۔ یہ مضمون سورۃ الحج کے آخری رکوع میں زیادہ وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ ''اور جو لوگ واقعتا صاحبِ ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔''

ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' یہ گویا لٹمس ٹیسٹ ہے۔ کوئی شے اگر اللہ سے بڑھ کر محبوب ہو گئی تو وہ تمہاری معبود ہے۔ تم نے اللہ کو چھوڑ کر اُس کو اپنا معبود بنا لیا‘ چاہے وہ دولت ہی ہو۔ حدیث نبویؐ ہے: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) (۱۹) ''ہلاک اور برباد ہو جائے درہم و دینار کا بندہ''۔ نام خواہ عبدالرحمٰن ہو‘ حقیقت میں وہ عبدالدینار ہے۔ اس لیے کہ وہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ دینار آنا چاہیے‘ خواہ حرام سے آئے یا حلال سے‘ جائز ذرائع سے آئے یا ناجائز ذرائع سے۔ چنانچہ اس کا معبود اللہ نہیں‘ دینار ہے۔ ہندو نے لکشمی دیوی کی مورتی بنا کر اسے پوجنا شروع کر دیا کہ یہ لکشمی دیوی اگر ذرا مہربان ہو جائے گی تو دولت کی ریل پیل ہو جائے گی۔ ہم نے اس درمیانی واسطے کو بھی ہٹا کر براہِ راست ڈالر اور پیٹرو ڈالر کو

پوجنا شروع کر دیا اور اس کی خاطر اپنے وطن اور اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ یہاں کتنے ہی لوگ سسک سسک کر مر جاتے ہیں اور آخری لمحات میں ان کا بیٹا یا بیٹی ان کے پاس موجود نہیں ہوتا بلکہ دیارِ غیر میں ڈالر کی پوجا میں مصروف ہوتا ہے۔

﴿وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا ۙ﴾ ’’اور اگر یہ ظالم لوگ اُس وقت کو دیکھ لیں جب یہ دیکھیں گے عذاب کو‘ تو (ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ) قوت تو ساری کی ساری اللہ کے پاس ہے‘‘

یہاں ظلم شرک کے معنی میں آیا ہے اور ظالم سے مراد مشرک ہیں۔

﴿وَّاَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ (١٦٥)﴾ ’’اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔‘‘

اُس وقت آنکھ کھلے گی تو کیا فائدہ ہوگا؟ اب آنکھ کھلے تو فائدہ ہے۔

آیت ١٦٦ ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا﴾ ’’اُس وقت وہ لوگ جن کی (دنیا میں) پیروی کی گئی تھی اپنے پیروؤں سے اظہارِ براءت کریں گے‘‘

ہر انسانی معاشرے میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو دوسرے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں‘ چاہے اربابِ اقتدار ہوں‘ چاہے مذہبی مسندوں کے والی ہوں۔ لوگ انہیں اپنے پیشوا اور راہنما مان کر ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی ہر سچی جھوٹی بات پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ جب عذابِ آخرت ظاہر ہوگا تو یہ پیشوا اور راہنما اس عذاب سے بچانے میں اپنے پیروؤں کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور ان سے صاف صاف اظہارِ براءت اور اعلانِ لاتعلقی کر دیں گے۔

﴿وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِھِمُ الْاَسْبَابُ (١٦٦)﴾ ’’اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تمام تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔‘‘

جب جہنم ان کی نگاہوں کے سامنے آ جائے گی تو تمام رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ سورۂ عبس میں اس نفسا نفسی کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ (٣٤) وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ (٣٥) وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ (٣٦) لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ (٣٧)﴾ ’’اُس روز آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے‘ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے‘ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے۔ ان میں سے ہر شخص پر اُس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اُسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا‘‘۔ اسی طرح سورۃ المعارج میں فرمایا گیا ہے: ﴿یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍ ۢ بِبَنِیْہِ (١١) وَصَاحِبَتِہٖ وَاَخِیْہِ (١٢) وَفَصِیْلَتِہِ الَّتِیْ تُئْوِیْہِ (١٣) وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ ثُمَّ یُنْجِیْہِ (١٤)﴾ ’’مجرم چاہے گا کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو‘ اپنی بیوی کو‘ اپنے بھائی کو‘ اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا‘ اور روئے زمین کے سب انسانوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے‘‘۔ یہاں فرمایا: ﴿تَقَطَّعَتْ بِھِمُ الْاَسْبَابُ (١٦٦)﴾ ’’ان کے سارے رشتے منقطع ہو جائیں گے‘‘ یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ جن رشتوں کی وجہ سے ہم حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر رہے ہیں‘ جن کی دلجوئی کے لیے حرام کی کمائی کرتے ہیں اور جن کی ناراضی کے خوف سے دین کے راستے پر آگے نہیں بڑھ رہے ہیں‘ یہ سارے رشتے اسی دنیا تک محدود ہیں اور اُخروی زندگی میں یہ کچھ کام نہ آئیں گے۔

آیت ١٦٧ ﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً﴾ ’’اور جو اُن کے پیروکار تھے وہ کہیں گے کہ اگر کہیں ہمیں دنیا میں ایک بار لوٹنا نصیب ہو جائے‘‘

﴿فَنَتَبَرَّاَ مِنْھُمْ کَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ﴾ ’’تو ہم بھی ان سے اسی طرح اظہارِ براءت کریں گے جیسے آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں۔‘‘

﴿کَذٰلِکَ یُرِیْھِمُ اللّٰہُ اَعْمَالَھُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْھِمْ ؕ﴾ ’’اس طرح اللہ ان کو ان کے اعمال حسرتیں بنا کر دکھائے گا۔‘‘

وہ کہیں گے کاش ہم نے سمجھا ہوتا‘ کاش ہم نے ان کی پیروی نہ کی ہوتی‘ کاش ہم نے ان کو اپنا لیڈر اور اپنا ہادی و رہنما نہ مانا ہوتا!!

﴿وَمَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ (١٦٧)﴾ ’’لیکن وہ اب آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے‘‘۔ اب ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔

آیات ١٦٨تا١٧٦

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۡ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ
مُّبِیْنٌ (١٦٨) اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (١٦٩) وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا
مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ (١٧٠)
وَمَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا
یَعْقِلُوْنَ (١٧١) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ (١٧٢)
اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ
اِثْمَ عَلَیْہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (١٧٣) اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ
اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (١٧٤)
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَۃِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَھُمْ عَلَی النَّارِ (١٧٥) ذٰلِکَ بِاَنَّ
اللّٰہَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۢ بَعِیْدٍ (١٧٦)﴾

آیت ١٦٨ ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۡ﴾ ’’اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور طیّب ہے اسے کھاؤ‘‘

﴿وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ﴾ ''اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔''

﴿اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۶۸﴾﴾ ''یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

یہ بحث دراصل سورۃ الانعام میں زیادہ وضاحت سے آئے گی۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ بتوں کے نام پر کوئی جانور چھوڑ دیتے تھے' جس کو ذبح کرنا وہ حرام سمجھتے تھے۔ ایسی روایات ہندوؤں میں بھی تھیں جنہیں ہم نے بچپن میں دیکھا ہے۔ مثلاً کوئی سانڈ چھوڑ دیا' کسی کے کان چیر دیے کہ یہ فلاں بُت کے لیے یا فلاں دیوی کے لیے ہے۔ ایسے جانور جہاں چاہیں منہ ماریں' انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ظاہر ہے ان کا گوشت کیسے کھایا جا سکتا تھا! تو عرب میں بھی یہ رواج تھے اور ظہورِ اسلام کے بعد بھی ان کے کچھ نہ کچھ اثرات ابھی باقی تھے۔ آباء واَجداد کی رسمیں جو قرنوں سے چلی آ رہی ہوں وہ آسانی سے چھوٹتی نہیں ہیں' کچھ نہ کچھ اثرات رہتے ہیں۔ جیسے آج بھی ہمارے ہاں ہندوانہ اثرات موجود ہیں۔ تو ایسے لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ مشرکانہ توہمات کی بنیاد پر تمہارے مشرک باپ دادا نے اگر کچھ چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا تھا اور کچھ کو حلال قرار دے لیا تھا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ تم شیطان کی پیروی میں مشرکانہ توہمات کے تحت اللہ تعالیٰ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام مت ٹھہراؤ۔ جو چیز بھی اصلاً حلال اور پاکیزہ وطیب ہے اسے کھاؤ۔

آیت ۱۶۹ ﴿اِنَّمَا یَاۡمُرُکُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَالۡفَحۡشَآءِ﴾ ''وہ (شیطان) تو بس تمہیں بدی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے''

﴿وَاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾﴾ ''اور اس کا کہ تم اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔''

آیت ۱۷۰ ﴿وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس کی جو اللہ نے نازل کیا ہے''

﴿قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ؕ﴾ ''وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو پیروی کریں گے اُس طریقے کی جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے۔''

﴿اَوَلَوۡ کَانَ اٰبَآؤُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡئًا وَّلَا یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾﴾ ''اگرچہ ان کے آباء واَجداد نہ کسی بات کو سمجھ پائے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوئے ہوں (پھر بھی وہ اپنے آباء واَجداد ہی کی پیروی کرتے رہیں گے؟)''

سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کی پہلی آیت (جہاں نوعِ انسانی کو خطاب کر کے عبادتِ ربّ کی دعوت دی گئی) کے ضمن میں وضاحت کی گئی تھی کہ جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں وہ بھی تو مخلوق تھے جیسے تم مخلوق ہو' جیسے تم سے خطا ہو سکتی ہے ان سے بھی ہوئی' جیسے تم غلطی کر سکتے ہو انہوں نے بھی کی۔

آیت ۱۷۱ ﴿وَمَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا کَمَثَلِ الَّذِیۡ یَنۡعِقُ بِمَا لَا یَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ﴾ ''اور ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا' ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیز کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سمجھتی ہو۔''

جو لوگ محض باپ دادا کی تقلید میں اپنے کفر پر اَڑ گئے ہیں اُن کی تشبیہہ جانوروں سے دی گئی ہے جنہیں پکارا جائے تو وہ پکارنے والے کی پکار اور آواز تو سنتے ہیں' لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ تمثیل سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ اس دعوت پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہیں۔

﴿صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾﴾ ''وہ بہرے بھی ہیں' گونگے بھی ہیں' اندھے بھی ہیں' پس وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔''

آیت ۱۷۲ ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ﴾ ''اے اہلِ ایمان! کھاؤ اُن تمام پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں''

﴿وَاشۡکُرُوۡا لِلّٰہِ﴾ ''اور اللہ کا شکر ادا کرو''

﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾﴾ ''اگر تم واقعتاً اُسی کی عبادت کرنے والے ہو۔''

جیسا کہ میں نے عرض کیا سورۃ الانعام میں یہ ساری چیزیں تفصیل سے آئیں گی۔

آیت ۱۷۳ ﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ وَالدَّمَ﴾ ''اُس نے تو تم پر یہی حرام کیا ہے مُردار اور خون''

جو جانور اپنی موت آپ مر گیا' ذبح نہیں کیا گیا وہ حرام ہے اور خون حرام ہے' نجس ہے۔ اسی لیے اہلِ اسلام کا ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صرف گردن کو کاٹا جائے' تاکہ اس میں شریانیں وغیرہ کٹ جائیں اور جسم کا اکثر خون نکل جائے۔ لیکن اگر جھٹکا کیا جائے' یعنی تیز دھار آلے کے ایک ہی وار سے جانور کی گردن الگ کر دی جائے' جیسے سکھ کرتے ہیں یا جیسے یورپ وغیرہ میں ہوتا ہے' تو پھر خون جسم کے اندر رہ جاتا ہے۔ اس طریقے سے مارا گیا جانور حرام ہے۔

﴿وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ﴾ ''اور خنزیر کا گوشت''

﴿وَمَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ ۚ﴾ ''اور جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا گیا ہو۔''

یعنی کسی جانور کو ذبح کرتے ہوئے کسی بُت کا' کسی دیوی کا' کسی دیوتا کا' الغرض اللہ کے سوا کسی کا بھی نام لیا گیا تو وہ حرام ہو گیا' اس کا گوشت کھانا حرام مطلق ہے' لیکن اسی کے تابع یہ صورت بھی ہے کہ کسی بزرگ کا قرب حاصل کرنے کے لیے جانور کو اس کے مزار پر لے جا کر وہاں ذبح کیا جائے' اگرچہ دعویٰ یہ ہو کہ یہ صاحبِ مزار کے ایصالِ ثواب کی خاطر اللہ تعالیٰ کے لیے ذبح کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ ایصالِ ثواب کی خاطر تو یہ عمل گھر پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

وہ کھانے جو اہلِ عرب میں اُس وقت رائج تھے' اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر ان میں سے چار چیزوں کی حرمت کا قرآن حکیم میں بار بار اعلان کیا ہے۔ مکی سورتوں میں بھی ان چیزوں کی حرمت کا متعدد بار بیان ہوا ہے اور یہاں سورۃ البقرۃ میں بھی جو مدنی سورت ہے۔ اس کے بعد سورۃ المائدۃ میں یہ مضمون پھر آئے گا۔ ان چار چیزوں کی حرمت کے بیان سے حلال وحرام کی تفصیل پیش کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے' بلکہ مشرکین کی تردید ہے۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ﴾ ''پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اُس پر کوئی گناہ نہیں۔''

اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو گیا ہے' جان نکل رہی ہے اور کوئی شے کھانے کو نہیں ہے تو وہ جان بچانے کے لیے حرام کردہ چیز بھی کھا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں' ایک تو وہ اس حرام کی طرف رغبت اور میلان نہ رکھتا ہو اور دوسرے یہ کہ جان بچانے کے لیے جو ناگزیر مقدار ہے اس سے آگے نہ بڑھے۔ ان دو شرطوں کے ساتھ جان بچانے کے لیے حرام چیز بھی کھائی جا سکتی ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۷۳)﴾ ''یقیناً اللہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۱۷۴ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس کو جو اللہ نے نازل کیا ہے کتاب میں سے اور فروخت کرتے ہیں اسے بہت حقیر سی قیمت پر''

یعنی اس کے عوض دُنیوی فائدوں کی صورت میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ﴾ ''یہ لوگ نہیں بھر رہے اپنے پیٹوں میں مگر آگ''

﴿وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ ''اور اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا قیامت کے دن۔''

﴿وَلَا یُزَكِّیْهِمْ ۚ﴾ ''اور نہ انہیں پاک کرے گا۔''

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۷۴)﴾ ''اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۱۷۵ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خرید لی ہے''

﴿وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ﴾ ''اور (اللہ کی) مغفرت ہاتھ سے دے کر عذاب خرید لیا ہے۔''

﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۱۷۵)﴾ ''تو یہ کس قدر صبر کرنے والے ہیں دوزخ پر!''

ان کا کتنا حوصلہ ہے کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں! اس کے لیے کس طرح تیاری کر رہے ہیں!

آیت ۱۷۶ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''یہ اس لیے کہ اللہ نے تو کتاب نازل کی حق کے ساتھ۔''

﴿وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ (۱۷۶)﴾ ''اور یقیناً جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف ڈالا وہ ضد اور مخالفت میں بہت دور نکل گئے۔''

جن لوگوں نے اللہ کی کتاب اور شریعت میں اختلاف کی پگڈنڈیاں نکالیں وہ ضد' ہٹ دھرمی' شقاوت اور دشمنی میں مبتلا ہو گئے اور اس میں بہت دور نکل گئے۔ اعاذنَا اللّٰه مِنْ ذٰلِكَ!

آیات ۱۷۷ تا ۱۸۲

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۱۷۷) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۷۸) وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۹) كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَیْرَا ۚ ۖ الْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ (۱۸۰) فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۱۸۱) فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۸۲)﴾

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس سورۂ مبارکہ میں کئی ایسی عظیم آیات آئی ہیں جو حجم کے اعتبار سے بھی اور معنی و حکمت کے اعتبار سے بھی بہت عظیم ہیں' جیسے دو رکوع پہلے ''آیت الآیات'' گزر چکی ہے۔ اسی طرح سے اب یہ ''آیتُ البِرّ'' آ رہی ہے' جس میں نیکی کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں نیکی کے مختلف تصوّرات ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ وہ ہے جس کا نیکی کا تصور یہ ہے کہ بس سچ بولنا چاہیے' کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے' کسی کا حق نہیں مارنا چاہیے' یہ نیکی ہے' باقی کوئی نماز روزہ کی پابندی کرے یا نہ کرے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے! ایک طبقہ وہ ہے جس میں چور' اُچکے' گرہ کٹ' ڈاکو اور بدمعاش شامل ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یتیموں اور بیواؤں کی مدد بھی کرتے ہیں اور یہ کام ان کے ہاں نیکی شمار ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جسم فروش خواتین بھی اپنے ہاں نیکی کا ایک تصور رکھتی ہیں' وہ خیرات بھی کرتی ہیں اور مسجدیں بھی تعمیر کراتی ہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی طبقات میں ایک طبقہ وہ ہے جو مذہب کے ظاہر کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور وہ اس کی روح سے نا آشنا ہوتا ہے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ''مچھر چھانتے ہیں اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہیں''۔ ان کے اختلافات اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ رفع یدین کے بغیر نماز ہوئی یا نہیں؟ تراویح آٹھ ہیں یا بیس ہیں؟ باقی یہ کہ سودی کاروبار تم بھی کرو اور ہم بھی' اس سے کسی کی حنفیت یا اہل حدیثیت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ نیکی کے یہ سارے تصورات مسخ شدہ (perverted) ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اندھوں نے ایک ہاتھی کو دیکھ کر اندازہ کرنا چاہا تھا کہ وہ کیسا ہے۔ کسی نے اُس کے پیر کو ٹٹول کر کہا کہ یہ تو ستون کی مانند ہے' جس کا ہاتھ اُس کے کان پر پڑ گیا اُس نے کہا یہ چھاج کی طرح ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں نیکی کا تصور تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔

بقول اقبال: ؎

اڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

یہ آیت اس اعتبار سے قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے کہ نیکی کی حقیقت کیا ہے' اس کی جڑ بنیاد کیا ہے' اس کی روح کیا ہے' اس کے مظاہر کیا ہیں؟ پھر ان مظاہر میں اہم ترین کون سے ہیں اور ثانوی حیثیت کن کی ہے؟ چنانچہ اس ایک آیت کی روشنی میں قرآن کے علم الاخلاق پر ایک جامع کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے۔ گویا اخلاقیاتِ قرآنی (Quranic Ethics) کے لیے یہ آیت جڑ اور بنیاد ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ یہ آیت یہاں کیونکر آئی ہے۔ اس کے پس منظر میں بھی وہی تحویلِ قبلہ ہے۔ تحویلِ قبلہ کے بارے میں چار رکوع (۱۵ تا ۱۸) تو مسلسل ہیں۔ اس سے پہلے چودھویں رکوع میں آیت آئی ہے: ﴿وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۱۱۵) اِدھر بھی اٹھارہویں رکوع کے بعد اتنی آیتیں چھوڑ کر یہ آیت آ رہی ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۷۷ ﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو''

اس عمل کے نیکی ہونے کی نفی نہیں کی گئی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ کوئی نیکی ہی نہیں ہے۔ یہ بھی نیکی ہے۔ نیکی کا جو ظاہر ہے وہ بھی نیکی ہے' لیکن اصل شے اس کا باطن ہے۔ اگر باطن صحیح ہے تو حقیقت میں نیکی نیکی ہے' ورنہ نہیں۔

﴿وَلٰکِنَّ الْبِرَّ﴾ ''بلکہ نیکی تو اُس کی ہے''

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ﴾ ''جو ایمان لائے اللہ پر' یومِ آخرت پر' فرشتوں پر' کتاب پر اور نبیوں پر۔''

سب سے پہلے نیکی کی جڑ بنیاد بیان کر دی گئی کہ یہ ایمان ہے' تاکہ تصحیح نیت ہو جائے۔ ایمانیات میں سب سے پہلے اللہ پر ایمان ہے۔ یعنی جو نیکی کر رہا ہے وہ صرف اللہ سے اجر کا طالب ہے۔ پھر قیامت کے دن پر ایمان کا ذکر ہوا کہ اس نیکی کا اجر دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں مطلوب ہے۔ ورنہ تو یہ سوداگری ہوگئی۔ اور آدمی اگر سوداگری اور دکانداری کرے تو دنیا کی چیزیں بیچے' دین تو نہ بیچے۔ دین کا کام کر رہا ہے تو اس کے لیے سوائے اُخروی نجات کے اور اللہ کی رضا کے کوئی اور شے مقصود نہ ہو۔ یومِ آخرت کے بعد فرشتوں' کتابوں اور انبیاء (علیہم السلام) پر ایمان کا ذکر کیا گیا۔ یہ تینوں مل کر ایک یونٹ بنتے ہیں۔ فرشتہ وحی کی صورت میں کتاب لے کر آیا' جو انبیاءِ کرامؑ پر نازل ہوئی۔ ایمان بالرسالت کا تعلق نیکی کے ساتھ یہ ہے کہ نیکی کا ایک مجسمہ' ایک ماڈل' ایک آئیڈیل ''اُسوۂ رسولؐ'' کی صورت میں انسانوں کے سامنے رہے۔ ایسا نہ ہو کہ اونچ نیچ ہو جائے۔ نیکیوں کے معاملے میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی جذبات میں ایک طرف کو نکل گیا اور کوئی دوسری طرف کو نکل گیا۔ اس گمراہی سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے کہ ایک مکمل اُسوہ سامنے رہے' جس میں تمام چیزیں معتدل ہوں اور وہ اُسوہ ہمارے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہے۔ نیکی کے ظاہر کے لیے ہم آپؐ ہی کو معیار سمجھیں گے۔ جو شے جتنی آپؐ کی سیرت میں ہے' اُس سے زیادہ نہ ہو اور اُس سے کم نہ ہو۔ کوشش یہ ہو کہ انسان بالکل رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ کاملہ کی پیروی کرے۔

﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ﴾ ''اور وہ خرچ کرے مال اس کی محبت کے باوجود''

یعنی مال کی محبت کے علی الرغم۔ ''عَلٰی حُبِّہٖ'' میں ضمیر متصل اللہ کے لیے نہیں ہے بلکہ مال کے لیے ہے۔ مال اگرچہ محبوب ہے' پھر بھی وہ خرچ کر رہا ہے۔

﴿ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ﴾ ''قرابت داروں' یتیموں' محتاجوں' مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں۔''

گویا نیکی کے مظاہر میں اوّلین مظہر انسانی ہمدردی ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو نیکی کا وجود نہیں ہے۔ عبادات کے انبار لگے ہوں مگر دل میں شقاوت ہو' انسان کو حاجت میں دیکھ کر دل نہ پسیجے' کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تجوری کی طرف ہاتھ نہ بڑھے' حالانکہ تجوری میں مال موجود ہو' تو یہ طرزِ عمل دین کی روح سے بالکل خالی ہے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۹۲) میں الفاظ آئے ہیں: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ ''تم نیکی کے مقام کو پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ خرچ نہ کرو اس میں سے جو تمہیں محبوب ہے''۔ یہ نہیں کہ جس شے سے طبیعت اکتا گئی ہو' جو کپڑے بوسیدہ ہو گئے ہوں وہ کسی کو دے کر حاتم طائی کی قبر پر لات مار دی جائے۔ جو شے خود کو پسند ہو' عزیز ہو' اگر اس میں سے نہیں دیتے تو تم نیکی کو پہنچ ہی نہیں سکتے۔

﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ﴾ ''اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ۔''

حکمت دین ملاحظہ کیجیے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایمان اور انسانی ہمدردی کے بعد آیا ہے۔ اس لیے کہ روحِ دین ''ایمان'' ہے اور نیکی کے مظاہر میں سے مظہرِ اوّل انسانی ہمدردی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیجیے کہ یہاں ''زکوٰۃ'' کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے' جبکہ اس سے قبل ایتائے مال کا ذکر ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکَاۃِ)) (۲۰)

''یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔''

یعنی اگر کچھ لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس ہم نے اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکال دی تو پورا حق ادا ہو گیا' تو یہ ان کی خام خیالی ہے' مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ اور آپ ﷺ نے یہی مذکورہ بالا آیت پڑھی۔

ایمان اور انسانی ہمدردی کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ایمان کو تروتازہ رکھنے کے لیے نماز ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴿۱۴﴾﴾ (طٰہٰ) ''نماز قائم کرو میری یاد کے لیے''۔ اور انسانی ہمدردی میں مال خرچ کرنے کے جذبے کو پروان چڑھانے اور برقرار رکھنے کے لیے زکوٰۃ ہے کہ اتنا تو کم سے کم دینا ہوگا' تاکہ بوتل کا منہ تو کھلے۔ اگر بوتل کا کارک نکل جائے گا تو اُمید ہے کہ اس میں سے کوئی شربت اور بھی نکل آئے گا۔ چنانچہ اڑھائی فیصد تو فرض زکوٰۃ ہے۔ جو یہ بھی نہیں دیتا وہ مزید کیا دے گا؟

﴿وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ﴾ ''اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب کوئی عہد کر لیں ۔''

انسان نے سب سے بڑا عہد اپنے پروردگار سے کیا تھا جو ''عہد الست'' کہلاتا ہے' پھر شریعت کا عہد ہے جو ہم نے اللہ کے ساتھ کر رکھا ہے۔ پھر آپس میں جو بھی معاہدے ہوں ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ معاملاتِ انسانی سارے کے سارے معاہدات کی شکل میں ہیں۔ شادی بھی شوہر اور بیوی کے مابین ایک سماجی معاہدہ (social contract) ہے۔ شوہر کی بھی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں اور بیوی کی بھی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں۔ شوہر کے بیوی پر حقوق ہیں' بیوی کے شوہر پر حقوق ہیں۔ پھر آجر اور مستأجر کا جو باہمی تعلق ہے وہ بھی ایک معاہدہ ہے۔ تمام بڑے بڑے کاروبار معاہدوں پر ہی چلتے ہیں۔ پھر ہمارا جو سیاسی نظام ہے وہ بھی معاہدوں پر مبنی ہے۔ تو اگر لوگوں میں ایک چیز پیدا ہو جائے کہ جو عہد کر لیا ہے اسے پورا کرنا ہے تو تمام معاملات سدھر جائیں گے' ان کی stream lining ہو جائے گی۔

﴿وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ﴾ ''اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔''

یہ نیکی بدھ مت کے بھکشوؤں کی نیکی سے مختلف ہے۔ یہ نیکی باطل کو چیلنج کرتی ہے۔ یہ نیکی خانقاہوں تک محدود نہیں ہوتی' صرف انفرادی سطح تک محدود نہیں رہتی' بلکہ اللہ کو جو نیکی مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اب باطل کا سر کچلنے کے لیے میدان میں آؤ۔ اور جب باطل کا سر کچلنے کے لیے میدان میں آؤ گے تو خود بھی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ اس راہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں اور جانیں دینی پڑی ہیں۔ اللہ کا کلمہ سربلند کرنے کے لیے سینکڑوں صحابہ کرامؓ نے جامِ شہادت نوش کیا ہے۔ دنیا کے ہر نظامِ اخلاق میں ''خیر اعلیٰ'' (summum bonum) کا ایک تصور ہوتا ہے کہ سب سے اونچی نیکی کیا ہے! قرآن کی رو سے سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ حق کے غلبے کے لیے' صداقت' دیانت اور امانت کی بالادستی کے لیے اپنی گردن کٹا دی جائے۔ وہ آیت یاد کر لیجیے جو چند رکوع پہلے ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ يُّقۡتَلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ وَّلٰـكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾﴾ ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں (جام شہادت نوش کر لیں) انہیں مردہ مت کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور حاصل نہیں ہے۔''

﴿اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ؕ﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔''

راست بازی اور نیکوکاری کا دعویٰ تو بہت سوں کو ہے' لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

﴿وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۷﴾﴾ ''اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

ہمارے ذہنوں میں نیکی اور تقویٰ کے کچھ اور نقشے بیٹھے ہوئے ہیں کہ شاید تقویٰ کسی مخصوص لباس اور خاص وضع قطع کا نام ہے۔ یہاں قرآن حکیم نے نیکی اور تقویٰ کی حامل انسانی شخصیت کا ایک ہیولا اور اس کے کردار کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ اس کے باطن میں روحِ ایمان موجود ہے اور خارج میں اس ترتیب کے ساتھ دین کے یہ تقاضے اور نیکی کے یہ مظاہر موجود ہیں۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ' اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ (آمین یا ربّ العالمین)

اس کے بعد وہی جو انسانی معاملات ہیں ان پر بحث چلے گی۔ سورۃ البقرۃ کے نصف ثانی کے مضامین کے بارے میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ یہ گویا چار لڑیوں پر مشتمل ہیں' جن میں سے دو لڑیاں عبادات اور احکام و شرائع کی ہیں۔

آیت ۱۷۸ ﴿يٰۤـاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِى الۡقَتۡلٰى ؕ﴾ ''اے اہل ایمان! تم پر لازم کر دیا گیا ہے مقتولوں کا بدلہ لینا۔''

قَتۡلٰی ''قَتِیۡلٌ'' کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں۔ ''کُتِبَ'' کے بعد ''عَلٰی'' فرضیت کے لیے آتا ہے' یعنی تم پر یہ فرض کر دیا گیا ہے' اس معاملے میں سہل انگاری صحیح نہیں ہے۔ جب کسی معاشرے میں انسان کا خون بہانا عام ہو جائے تو تمدن کی جڑ کٹ جائے گی' لہٰذا قصاص تم پر واجب ہے۔

﴿اَلۡحُرُّ بِالۡحُـرِّ﴾ ''آزاد آزاد کے بدلے''

اگر کسی آزاد آدمی نے قتل کیا ہے تو قصاص میں وہ آزاد ہی قتل ہو گا۔ یہ نہیں کہ وہ کہہ دے کہ میرا غلام لے جاؤ' یا میری جگہ میرے دو غلام لے جا کر قتل کر دو۔

﴿وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ﴾ ''اور غلام غلام کے بدلے''

اگر غلام قاتل ہے تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے گا۔

﴿وَالۡاُنۡثٰى بِالۡاُنۡثٰى ؕ﴾ ''اور عورت عورت کے بدلے۔''

اگر قتل کرنے والی عورت ہے تو وہ عورت ہی قتل ہو گی۔ قصاص و دیت کے معاملے میں اسلام سے پہلے عرب میں مختلف معیارات قائم تھے۔ مثلاً اگر اوسی خزرجی کو قتل کر دے تو تین گنا خون بہا وصول کیا جائے گا اور خزرجی اوسی کو قتل کرے تو ایک تہائی خون بہا ادا کیا جائے گا۔ یہ ان کا قانون تھا۔ اسی طرح آزاد اور غلام میں بھی فرق روا رکھا جاتا تھا۔ لیکن شریعتِ اسلامی نے اس ضمن میں کامل مساوات قائم کی اور زمانۂ جاہلیت کی ہر طرح کی عدمِ مساوات کا خاتمہ کر دیا۔ اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہی ہے کہ تمام مسلمان آپس میں ''کُفو'' (برابر) ہیں' لہٰذا قتل کے مقدمات میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

﴿فَمَنۡ عُفِىَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ﴾ ''پھر جس کو معاف کر دی جائے کوئی شے اس کے بھائی کی جانب سے''

یعنی مقتول کے ورثاء اگر قاتل کو کچھ رعایت دے دیں کہ ہم اس کی جان بخشی کرنے کو تیار ہیں' چاہے وہ خون بہا لے لیں' چاہے ویسے ہی معاف کر دیں' تو جو بھی خون بہا طے ہوا ہو اُس کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ ؕ﴾ ''تو (اس کی) پیروی کی جائے معروف طریقے پر اور ادائیگی کی جائے خوبصورتی کے ساتھ۔''

﴿ذٰلِكَ تَخۡفِيۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٌ ؕ﴾ ''یہ تمہارے ربّ کی طرف سے ایک تخفیف اور رحمت ہے۔''

اس کا رحمت ہونا بہت واضح ہے۔ اگر یہ شکل نہ ہو تو پھر قتل در قتل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن اگر قاتل کو لا کر مقتول کے

ورثاء کے سامنے کھڑا کر دیا جائے کہ اب تمہارے ہاتھ میں اس کی جان ہے‘ تم چاہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا‘ اور اگر تم احسان کرنا چاہو‘ اس کی جان بخشی کرنا چاہو تو تمہیں اختیار حاصل ہے۔ چاہو تو ویسے ہی بخش دو‘ چاہو تو خون بہا لے لو۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ دشمنیوں کا دائرہ سمٹ جاتا ہے‘ بڑھتا نہیں ہے۔ اس میں اللہ کی طرف سے بڑی رحمت ہے۔ اسلامی معاشرے میں قاتل کی گرفتاری اور قصاص کی تنفیذ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے‘ لیکن اس میں مدعی ریاست نہیں ہوتی۔ آج کل ہمارے نظام میں غلطی یہ ہے کہ ریاست ہی مدعی بن جاتی ہے‘ حالانکہ مدعی تو مقتول کے ورثاء ہیں۔ اسلامی نظام میں کسی صدر یا وزیر اعظم کو اختیار نہیں ہے کہ کسی قاتل کو معاف کر دے۔ قاتل کو معاف کرنے کا اختیار صرف مقتول کے ورثاء کو ہے۔ لیکن ہمارے ملکی دستور کی رو سے صدرِ مملکت کو سزائے موت معاف کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۸﴾﴾ ”تو اس کے بعد بھی جو حد سے تجاوز کرے گا تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

یعنی جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد ظلم و زیادتی کا وطیرہ اپنائیں گے ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

آیت ۱۷۹ ﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾﴾ ”اور اے ہوشمندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے‘ تاکہ تم بچ سکو۔“

معاشرتی زندگی میں عفو و درگزر اگرچہ ایک اچھی قدر ہے اور اسلام اس کی تعلیم دیتا ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾﴾ (التغابن) ”اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا‘ رحم کرنے والا ہے“۔ لیکن قتل کے مقدمات میں سہل انگاری اور چشم پوشی کو قصاص کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہیے‘ بلکہ شدت کے ساتھ پیروی ہونی چاہیے‘ تاکہ اس سے آگے قتل کا سلسلہ بند ہو۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ”تاکہ تم بچ سکو“۔ یعنی اللہ کی حدود کی خلاف ورزی اور ایک دوسرے پر ظلم و تعدی سے بچو۔

آیت ۱۸۰ ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا ۨ ۚ الْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ ”جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کر دیا گیا ہے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں انصاف کے ساتھ وصیت کرنا۔“

ابھی قانونِ وراثت نازل نہیں ہوا تھا‘ اس ضمن میں یہ ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔ دورِ جاہلیت میں وراثت کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی‘ جیسے آج بھی ہندوؤں میں ہوتی ہے‘ کہ مرنے والے کی ساری جائیداد کا مالک بڑا بیٹا بن جاتا تھا۔ اس کی بیوی‘ بیٹیاں‘ حتیٰ کہ دوسرے بیٹے بھی وراثت سے محروم رہتے۔ چنانچہ یہاں وراثت کے بارے میں پہلا حکم دیا گیا کہ مرنے والا والدین اور اقرباء کے بارے میں وصیت کر جائے تاکہ ان کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ پھر جب سورۃ النساء میں پورا قانونِ وراثت آ گیا تو اب یہ آیت منسوخ شمار ہوتی ہے۔ البتہ اس کے ایک جزو کو رسول اللہ ﷺ نے باقی رکھا ہے کہ مرنے والا اپنے ایک تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے‘ اس سے زیادہ نہیں‘ اور یہ کہ جس شخص کا وراثت میں حق مقرر ہو چکا ہے‘ اُس کے لیے وصیت نہیں ہوگی۔ وصیت غیر وارث کے لیے ہوگی۔ مرنے والا کسی یتیم کو‘ بیوہ کو‘ کسی یتیم خانہ کو یا کسی دینی ادارے کو اپنی وراثت میں سے کچھ دینا چاہے تو اسے حق حاصل ہے کہ ایک تہائی کی وصیت کر دے۔ باقی دو تہائی میں لازمی طور پر قانونی وراثت کی تنفیذ ہوگی۔

﴿حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۸۰﴾﴾ ”اللہ تعالیٰ کا تقویٰ رکھنے والوں پر یہ حق ہے۔“

ان پر واجب اور ضروری ہے کہ وہ وصیت کر جائیں کہ ہمارے والدین کو یہ مل جائے‘ فلاں رشتہ دار کو یہ مل جائے‘ باقی جو بھی ورثاء ہیں ان کے حصے میں یہ آ جائے۔

آیت ۱۸۱ ﴿فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ﴾ ”تو جس نے بدل دیا اس وصیت کو اس کے بعد کہ اس کو سنا تھا“

﴿فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَی الَّذِیْنَ یُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ﴾ ”تو اس کا گناہ ان ہی پر آئے گا جو اسے تبدیل کرتے ہیں۔“

وصیت کرنے والا ان کے اس گناہ سے بَری ہے‘ اُس نے تو صحیح وصیت کی تھی۔ اگر گواہوں نے بعد میں وصیت میں تحریف اور تبدیلی کی تو اُس کا وبال اور اس کا بوجھ ان ہی پر آئے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۸۱﴾﴾ ”یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔“

آیت ۱۸۲ ﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا﴾ ”پھر جس کو اندیشہ ہو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا“

اگر کسی کو یہ اندیشہ ہو اور دیانت داری کے ساتھ اس کی یہ رائے ہو کہ وصیت کرنے والے نے ٹھیک وصیت نہیں کی‘ بلکہ بے جا جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے یا کسی کی حق تلفی کر کے گناہ کمایا ہے۔

﴿فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ﴾ ”اور وہ ان کے مابین صلح کرا دے“

اس طرح کے اندیشے کے بعد کسی نے ورثاء کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ دیکھو‘ ان کی وصیت تو یہ تھی‘ لیکن اس میں یہ زیادتی والی بات ہے‘ اگر تم لوگ متفق ہو جاؤ تو اس میں اتنی تبدیلی کر دی جائے؟

﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ﴾ ”تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔“

یعنی ایسی بات نہیں ہے کہ اس وصیت کو ایسا تقدس حاصل ہو گیا کہ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی‘ بلکہ باہمی مشورے سے اور اصلاح کے جذبے سے وصیت میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۸۲﴾﴾ ”یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔“

آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا
مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ
مِسْکِیْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ
الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ
وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ۫
وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ
قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَکُمْ
لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ
اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ ۠ وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا
حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ ۚ وَلَا
تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰکِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ
لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا
مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾﴾

سورۃ البقرۃ کے نصفِ آخر کے مضامین کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ چار لڑیوں کی مانند ہیں جو آپس میں گتھی ہوئی ہیں۔ اب ان میں سے عبادات والی لڑی آ رہی ہے اور زیر مطالعہ رکوع میں ''صوم'' کی عبادت کا تذکرہ ہے۔ جہاں تک ''صلوٰۃ'' (نماز) کا تعلق ہے تو اس کا ذکر مکی سورتوں میں بے تحاشا آیا ہے' لیکن مکی دور میں ''صوم'' کا بطور عبادت کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

عربوں کے ہاں صوم یا صیام کے لفظ کا اطلاق اور مفہوم کیا تھا اور اس سے وہ کیا مراد لیتے تھے' اسے ذرا سمجھ لیجیے! عرب خود تو روزہ نہیں رکھتے تھے' البتہ اپنے گھوڑوں کو رکھواتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر عربوں کا پیشہ غارت گری اور لوٹ مار تھا۔ پھر مختلف قبائل کے مابین وقفہ وقفہ سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کاموں کے لیے ان کو گھوڑوں کی ضرورت تھی اور گھوڑا اس مقصد کے لیے نہایت موزوں جانور تھا کہ اس پر بیٹھ کر تیزی سے جائیں' لوٹ مار کریں' شب خون ماریں اور تیزی سے واپس آ جائیں۔ اونٹ تیز رفتار جانور نہیں ہے' پھر وہ گھوڑے کے مقابلے میں تیزی سے اپنا رُخ بھی نہیں پھیر سکتا۔ مگر گھوڑا جہاں تیز رفتار جانور ہے' وہاں تنک مزاج اور نازک مزاج بھی ہے۔ چنانچہ وہ تربیت کے لیے ان گھوڑوں سے یہ مشقت کراتے تھے کہ ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے اور ان کے مُنہ پر ایک ''توبڑا'' چڑھا دیتے تھے۔ اس عمل کو وہ ''صوم'' کہتے تھے اور جس گھوڑے پر یہ عمل کیا جائے اسے وہ ''صائم'' کہتے تھے' یعنی یہ روزہ سے ہے۔ اس طرح وہ گھوڑوں کو بھوک پیاس جھیلنے کا عادی بناتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مہم کے دوران گھوڑا بھوک پیاس برداشت نہ کر سکے اور جی ہار دے۔ اس طرح تو سوار کی جان شدید خطرے میں پڑ جائے گی اور اسے زندگی کے لالے پڑ جائیں گے! مزید یہ کہ عرب اس طور پر گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر موسم گرما اور لُو کی حالت میں انہیں لے کر میدان میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے سروں پر ڈھاٹے باندھ کر اور جسم پر کپڑے وغیرہ لپیٹ کر اُن گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار رہتے تھے اور ان گھوڑوں کا مُنہ سیدھا لُو اور بادِ صرصر کے تھپیڑوں کی طرف رکھتے تھے' تاکہ اُن کے اندر بھوک پیاس کے ساتھ ساتھ لُو کے ان تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی عادت بھی پڑ جائے' تاکہ کسی ڈاکے کی مہم یا قبائلی جنگ کے موقع پر گھوڑا اسوار کے قابو میں رہے اور بھوک پیاس یا بادِ صرصر کے تھپیڑوں کو برداشت کر کے سوار کی مرضی کے مطابق مطلوبہ رُخ برقرار رکھے اور اس سے منہ نہ پھیرے۔ تو عرب اپنے گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر جو مشقت کراتے تھے اس پر وہ ''صوم'' کے لفظ یعنی روزہ کا اطلاق کرتے تھے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہود کے ہاں روزہ رکھنے کا رواج تھا۔ وہ عاشورہ کا روزہ بھی رکھتے تھے' اس لیے کہ اس روز بنی اسرائیل کو فرعونیوں سے نجات ملی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ابتداءً ہر مہینے ''ایامِ بیض'' کے تین روزے رکھنے کا حکم دیا۔ اس رکوع کی ابتدائی دو آیات میں غالباً اسی کی توثیق ہے۔ اگر ابتدا ہی میں پورے مہینے کے روزے فرض کر دیے جاتے تو وہ یقیناً شاق گزرتے۔ ظاہر بات ہے کہ مہینے سخت گرم بھی ہو سکتے ہیں۔ اب اگر تیس کے تیس روزے ایک ہی مہینے میں فرض کر دیے گئے ہوتے اور وہ جون جولائی کے ہوتے تو جان ہی تو نکل جاتی۔ چنانچہ بہترین تدبیر یہ کی گئی کہ ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا اور یہ روزے مختلف موسموں میں آتے رہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد رمضان کے روزے فرض کیے گئے۔ ہر مہینے میں تین دن کے روزوں کا جو ابتدائی حکم تھا اس میں علی الاطلاق یہ اجازت تھی کہ جو شخص یہ روزہ نہ رکھے وہ اس کا فدیہ دے' اگرچہ وہ بیمار یا مسافر نہ ہو اور روزہ رکھنے کی طاقت بھی رکھتا ہو۔ جب رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم آ گیا تو اب یہ رخصت ختم کر دی گئی۔ البتہ رسول اللہ ﷺ نے فدیہ کی اس رخصت کو ایسے شخص کے لیے باقی رکھا جو بہت بوڑھا ہے' یا کسی ایسی سخت بیماری میں مبتلا ہے کہ روزہ رکھنے سے اس کے لیے جان کی ہلاکت کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یہ ہے ان آیات کی تاویل جس پر میں بہت عرصہ پہلے پہنچ گیا تھا' لیکن چونکہ اکثر مفسرینؒ نے یہ بات نہیں لکھی اس لیے میں اسے بیان کرنے سے جھجکتا رہا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی رائے یہی ہے تو مجھے اپنی رائے پر اعتماد ہو گیا۔ پھر مجھے اس کا ذکر تفسیر کبیر میں امام رازیؒ کے ہاں بھی مل گیا کہ متقدمین کے ہاں یہ رائے موجود ہے کہ روزے سے متعلق پہلی دو آیتیں (۱۸۳'۱۸۴) رمضان کے روزے سے متعلق نہیں ہیں' بلکہ وہ ایامِ بیض کے روزوں سے متعلق ہیں۔ ایامِ بیض کے روزے رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد بھی نفلاً رکھے ہیں۔

روزے کے احکام پر مشتمل یہ رکوع چھ آیتوں پر مشتمل ہے اور یہ اس اعتبار سے ایک عجیب مقام ہے کہ اس ایک جگہ روزے کا تذکرہ جامعیت کے ساتھ آ گیا ہے۔ قرآن مجید میں دیگر احکام بہت دفعہ آئے ہیں۔ نماز کے احکام بہت سے مقامات پر آئے ہیں۔ کہیں وضو کے احکام آئے ہیں تو کہیں تیمّم کے‘ کہیں نمازِ قصر اور نمازِ خوف کا ذکر ہے۔ لیکن ''صوم'' کی عبادت پر یہ کل چھ آیات ہیں‘ جن میں اس کی حکمت‘ اس کی غرض و غایت اور اس کے احکام سب کے سب ایک جگہ آ گئے ہیں۔ فرمایا:

آیت ۱۸۳ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ ''اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ فرض کیا گیا تھا تم سے پہلوں پر تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔''

وہ جنگ کے لیے گھوڑے کو تیار کرواتے تھے‘ تمہیں تقویٰ کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ روزے کی مشق تم سے اس لیے کرائی جارہی ہے تاکہ تم بھوک کو قابو میں رکھ سکو‘ شہوت کو قابو میں رکھ سکو‘ پیاس کو برداشت کرسکو۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلنا ہوگا‘ اس میں بھوک بھی آئے گی‘ پیاس بھی آئے گی۔ اپنے آپ کو جہاد و قتال کے لیے تیار کرو۔ سورۃ البقرۃ کے اگلے رکوع سے قتال کی بحث شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ روزے کی یہ بحث گویا قتال کے لیے بطور تمہید آ رہی ہے۔

آیت ۱۸۴ ﴿اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ﴾ ''گنتی کے چند دن ہیں۔''

''مَعْدُوْدٰت'' جمع قلت ہے‘ جو تین سے نو تک کے لیے آتی ہے۔ یہ گویا اس کا ثبوت ہے کہ یہاں مہینے بھر کے روزے مراد نہیں ہیں۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ ''اس پر بھی جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو''

﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾ ''تو وہ تعداد پوری کرلے دوسرے دنوں میں۔''

﴿وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ ؕ﴾ ''اور جو اِس کی طاقت رکھتے ہوں (اور وہ روزہ نہ رکھیں) اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا کھلانا۔''

ان آیات کی تفسیر میں‘ جیسا کہ عرض کیا گیا‘ مفسرینؒ کے بہت سے اقوال ہیں۔ میں نے اپنے مطالعے کے بعد جو رائے قائم کی ہے میں صرف وہی بیان کر رہا ہوں کہ اُس وقت امام رازیؒ کے بقول یہ فرضیت عَلَی التّعیین نہیں تھی بلکہ علی التّخییر تھی۔ یعنی روزہ فرض تو کیا گیا ہے لیکن اس کا بدل بھی دیا جارہا ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کی استطاعت کے باوجود نہیں رکھنا چاہتے تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دو۔ چونکہ روزے کے وہ پہلے سے عادی نہیں تھے‘ لہٰذا انہیں تدریجاً اس کا خوگر بنایا جارہا تھا۔

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ ؕ﴾ ''اور جو اپنی مرضی سے کوئی خیر کرنا چاہے تو اُس کے لیے خیر ہے۔''

اگر کوئی روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوگا۔

﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾﴾ ''اور روزہ رکھو‘ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔''

یہاں بھی ایک طرح کی رعایت کا انداز ہے۔ یہ دو آیات ہیں جن میں میرے نزدیک روزے کا پہلا حکم دیا گیا‘ جس کے تحت رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان نے ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان روزوں کا حکم رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کو اپنے طور پر دیا ہو اور بعد میں ان آیات نے اس کی توثیق کر دی ہو۔

اب وہ آیات آ رہی ہیں جو خاص رمضان کے روزے سے متعلق ہیں۔ ان میں سے دو آیات میں روزے کی حکمت اور غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ پھر ایک طویل آیت روزہ کے احکام پر مشتمل ہے اور آخر میں ایک آیت گویا لٹمس ٹیسٹ ہے۔

آیت ۱۸۵ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ ''لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ۔''

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ﴾ ''تو جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے (یا جو شخص بھی اس مہینے میں مقیم ہو) اس پر لازم ہے کہ روزہ رکھے۔''

اب وہ وجوب علی التخییر کا معاملہ ختم ہو گیا اور وجوب علی التعیین ہو گیا کہ یہ لازم ہے‘ یہ رکھنا ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾ ''اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ تعداد پوری کرلے دوسرے دنوں میں۔''

یہ رعایت حسب سابق برقرار رکھی گئی۔

﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫﴾ ''اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ سختی نہیں چاہتا۔''

لوگ خواہ مخواہ اپنے اوپر سختیاں جھیلتے ہیں‘ شدید سفر کے اندر بھی روزے رکھتے ہیں‘ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنے کی اجازت دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک سفر میں ان لوگوں پر کافی سرزنش کی جنہوں نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ آپؐ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ جہاد و قتال کے لیے نکلے تھے کہ کچھ لوگوں نے اس سفر میں بھی روزہ رکھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفر کے بعد جہاں منزل پر جا کر خیمے لگانے تھے وہ نڈھال ہو کر گر گئے اور جن لوگوں کا روزہ نہیں تھا انہوں نے خیمے لگائے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِی السَّفَرِ)) [۲۱] ''سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے''۔ لیکن ہمارا نیکی کا تصور مختلف ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ خواہ ۱۰۵ بخار چڑھا ہوا ہو وہ کہیں گے کہ روزہ تو میں نہیں چھوڑوں گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی رعایت سے فائدہ نہ اٹھانا ایک طرح کا کفرانِ نعمت ہے۔

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ ''تا کہ تم تعداد پوری کرو''

مرض یا سفر کے دوران جو روزے چھوٹ جائیں تمہیں دوسرے دنوں میں ان کی تعداد پوری کرنی ہوگی۔ وہ جو ایک رعایت تھی کہ فدیہ دے کر فارغ ہو جاؤ وہ اب منسوخ ہوگئی۔

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ ''اور تا کہ تم بڑائی کرو اللہ کی اس پر جو ہدایت اُس نے تمہیں بخشی ہے''

﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾﴾ ''اور تا کہ تم شکر کر سکو۔''

وہ نعمتِ عظمیٰ جو قرآن حکیم کی شکل میں تمہیں دی گئی ہے' تم اس کا شکر ادا کرو۔ اس موضوع پر میرے دو کتابچوں ''عظمتِ صوم'' اور ''عظمتِ صیام و قیامِ رمضانِ مبارک'' کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ ان میں یہ سارے مضامین تفصیل سے آئے ہیں کہ روزے کی کیا حکمت ہے' کیا غرض و غایت ہے' کیا مقصد ہے اور آخری منزل کیا ہے۔ مطلوب تو یہ ہے کہ تمہارا یہ جو جسمِ حیوانی ہے' یہ کچھ کمزور پڑے اور روحِ ربانی جو تم میں پھونکی گئی ہے اسے تقویت حاصل ہو۔ چنانچہ دن میں روزہ رکھو اور اس حیوانی وجود کو ذرا کمزور کرو' اس کے تقاضوں کو دباؤ۔ پھر راتوں کو کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کا کلام سنو اور پڑھو' تا کہ تمہاری روح کی آبیاری ہو' اس پر آبِ حیات کا ترشح ہو۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ خود تمہارے اندر سے تقربِ الی اللہ کی ایک پیاس اُبھرے گی۔

آیت ۱۸۶ ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾ ''اور (اے نبیﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان کو بتا دیجیے کہ) میں قریب ہوں۔''

میرے نزدیک یہ دنیا میں حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔ فصل اگر ہے تو وہ تمہاری اپنی خباثت ہے۔ اگر تمہاری نیت میں فساد ہے کہ حرام خوری تو کرنی ہی کرنی ہے تو اب کس منہ سے اللہ سے دعا کرو گے؟ لہٰذا کسی پیر کے پاس جاؤ گے کہ آپ دعا کر دیجیے' یہ نذرانہ حاضر ہے۔ بندے اور خدا کے درمیان خود انسان کا نفس حائل ہے اور کوئی نہیں' ورنہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو یہ ہے کہ: ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے' راہ رو منزل ہی نہیں!

اُس تک پہنچنے کا واسطہ کوئی پوپ نہیں' کوئی پادری نہیں' کوئی پنڈت نہیں' کوئی پروہت نہیں' کوئی پیر نہیں۔ جب چاہو اللہ سے ہم کلام ہو جاؤ۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے: ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے؟   پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ میرا ہر بندہ جب چاہے' جہاں چاہے مجھ سے ہم کلام ہو سکتا ہے۔

﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ ''میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے''

''اجابت'' کے مفہوم میں کسی کی پکار کا سننا' اس کا جواب دینا اور اسے قبول کرنا' یہ تینوں چیزیں شامل ہیں۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط عائد کی جا رہی ہے:

﴿فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ﴾ ''پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں''

﴿وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ﴾ ''اور مجھ پر ایمان رکھیں''

یہ یک طرفہ بات نہیں ہے' بلکہ یہ دو طرفہ معاملہ ہے۔ جیسے ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا''۔ تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہاری قدردانی کروں گا۔ تم میری طرف چل کر آؤ گے تو میں دوڑ کر آؤں گا۔ تم بالشت بھر آؤ گے تو میں ہاتھ بھر آؤں گا۔ لیکن اگر تم رُخ موڑ لو گے تو ہم بھی رُخ موڑ لیں گے۔ ہماری تو کوئی غرض نہیں ہے' غرض تو تمہاری ہے۔ تم رجوع کرو گے تو ہم بھی رجوع کریں گے۔ تم توبہ کرو گے تو ہم اپنی نظرِ کرم تم پر متوجہ کر دیں گے۔ سورۂ محمدؐ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (آیت ۷) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا''۔ لیکن اگر تم اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھاؤ' ان کے ساتھ تمہاری ساز باز ہو اور کھڑے ہو جاؤ قنوتِ نازلہ میں اللہ سے مدد مانگنے کے لیے تو تم سے بڑا بے وقوف کون ہوگا؟ پہلے اللہ کی طرف اپنا رُخ تو کرو' اللہ سے اپنا معاملہ تو درست کرو۔ اس میں یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ پہلے ولی کامل بن جاؤ' بلکہ اُسی وقت خلوصِ نیت سے توبہ کرو' سارے پردے ہٹ جائیں گے۔ آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾ ''تا کہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔''

اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے اور اس کے احکام پر چلنے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ رشد و ہدایت کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

آیت ۱۸۷ ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ ''حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لیے روزے کی راتوں میں بے حجاب ہونا اپنی بیویوں سے۔''

احکامِ روزہ سے متعلق یہ آیت بڑی طویل ہے۔ یہود کے ہاں شریعتِ موسوی میں روزہ شام کو ہی شروع ہو جاتا تھا اور رات بھی روزے میں شامل تھی۔ چنانچہ تعلقِ زن و شو بھی قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے ہاں سحری وغیرہ کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔ جیسے ہی رات کو سوتے روزہ شروع ہو جاتا اور اگلے دن غروبِ آفتاب تک روزہ رہتا۔ ہمارے ہاں روزے میں نرمی کی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ رات کو روزے سے خارج کر دیا گیا۔ روزہ بس دن کا ہے اور رات کے وقت روزے کی ساری پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رات کو تعلقِ زن و شو بھی قائم کیا جا سکتا ہے اور کھانے پینے کی بھی اجازت ہے۔ لیکن بعض مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ہمارے ہاں بھی روزے کے وہی احکام ہیں جو یہود کے ہاں ہیں۔ اس لیے ایسا بھی ہوتا تھا کہ روزوں کی راتوں میں بعض لوگ جذبات میں بیویوں سے مقاربت کر لیتے تھے' لیکن دل میں سمجھتے تھے کہ شاید ہم نے غلط کام کیا ہے۔ یہاں اب ان کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ تمہارے لیے روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ''وہ پوشاک ہیں تمہارے لیے اور تم پوشاک ہو اُن کے لیے۔''

یہ بڑا لطیف کنایہ ہے کہ وہ تمہارے لیے بمنزلۂ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلۂ لباس ہو۔ جیسے لباس میں اور جسم میں

کوئی پردہ نہیں ایسے ہی بیوی میں اور شوہر میں کوئی پردہ نہیں ہے۔ خود لباس ہی تو پردہ ہے۔ ویسے بھی مرد کے اخلاق کی حفاظت کرنے والی بیوی ہے اور بیوی کے اخلاق کی حفاظت کرنے والا مرد ہے۔ مجھے اقبال کا شعر یاد آ گیا: ؎

نے پردہ نہ تعلیم ، نئی ہو کہ پرانی　　نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

بہرحال مرد و عورت ایک دوسرے کے لیے ایک ضرورت بھی ہیں اور ایک دوسرے کی پردہ پوشی بھی کرتے ہیں۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اللہ کے علم میں ہے کہ تم اپنے آپ کے ساتھ خیانت کر رہے تھے''

تم ایک کام کر رہے تھے جو گناہ نہیں ہے، لیکن تم سمجھتے تھے کہ گناہ ہے، پھر بھی اس کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اس طرح تم اپنے آپ سے خیانت کے مرتکب ہو رہے تھے۔

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو اللہ نے تم پر نظرِ رحمت فرمائی''

﴿وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ﴾ ''اور تمہیں معاف کر دیا۔''

اس سلسلے میں جو بھی خطائیں ہوگئی ہیں وہ سب کی سب معاف سمجھو۔

﴿فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ ''تو اب تم ان کے ساتھ تعلق زن و شو قائم کرو''

﴿وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠﴾ ''اور تلاش کرو اس کو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔''

یعنی اولاد، جو تعلق زن و شو کا اصل مقصد ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق زن و شو کو سکون و راحت کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ﴿لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس تعلق کے بعد اعصاب کے تناؤ میں ایک سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس میں یہی حکمت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ہر سفر میں ایک زوجہ محترمہ کو ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ اس لیے کہ قائد اور سپہ سالار کو کسی وقت کسی ایسی پریشان کن صورت حال میں فیصلے کرنے پڑتے ہیں کہ جذبات پر اور اعصاب پر دباؤ ہوتا ہے۔

﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠﴾ ''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ واضح ہو جائے تمہارے لیے فجر کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے۔''

یہ پو پھٹنے کے لیے استعارہ ہے۔ یعنی جب سپیدۂ سحر نمایاں ہوتا ہے، صبح صادق ہوتی ہے اُس وقت تک کھانے پینے کی چھوٹ ہے۔ بلکہ یہاں ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ ''اور کھاؤ اور پیو'' امر کے صیغے آئے ہیں۔ سحری کرنے کی حدیث میں بھی تاکید آئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہمارے اور یہود کے روزے کے مابین سحری کا فرق ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے: ((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِي السَّحُوْرِ بَرَكَةً)) (۲۲) ''سحری ضرور کیا کرو، اس لیے کہ سحری میں برکت ہے۔''

﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ﴾ ''پھر رات تک روزے کو پورا کرو۔''

''رات تک'' سے اکثر فقہاء کے نزدیک غروبِ آفتاب مراد ہے۔ اہلِ تشیع اس سے ذرا آگے جاتے ہیں کہ غروبِ آفتاب پر چند منٹ مزید گزر جائیں۔

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ﴾ ''اور ان سے مباشرت مت کرو جبکہ تم مسجدوں میں حالتِ اعتکاف میں ہو۔''

یہ رعایت جو تمہیں دی جا رہی ہے اس میں ایک استثناء ہے کہ جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو پھر اپنی بیویوں سے رات کے دوران بھی کوئی تعلق قائم نہ کرو۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ﴾ ''یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدود ہیں، پس ان کے قریب بھی مت جاؤ۔''

بعض مقامات پر آتا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، پس ان سے تجاوز نہ کرو'' ان کو عبور نہ کرو۔ اصلاً حرام تو وہی شے ہوگی کہ حدود سے تجاوز کیا جائے۔ لیکن بہرحال احتیاط اس میں ہے کہ ان حدود سے دور رہا جائے (to keep at a safe distance) آخری حد تک چلے جاؤ گے تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس حد کو عبور نہ کر جاؤ۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ﴾ ''اسی طرح اللہ واضح کرتا ہے اپنی نشانیاں لوگوں کے لیے''

﴿لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝﴾ ''تاکہ وہ تقویٰ کی روش اختیار کر سکیں۔''

اب اس رکوع کی آخری آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ تقویٰ کا معیار اور اس کی کسوٹی کیا ہے۔ روزہ اس لیے فرض کیا گیا ہے اور یہ سارے احکام تمہیں اسی لیے دیے جا رہے ہیں تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے —— اور تقویٰ کا لٹمس ٹیسٹ ہے ''اکلِ حلال''۔ اگر یہ نہیں ہے تو کوئی نیکی نیکی نہیں ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۸۸ ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ''اور تم اپنے مال آپس میں باطل طریقوں سے ہڑپ نہ کرو''

﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ﴾ ''اور اس کو ذریعہ نہ بناؤ حکام تک پہنچنے کا''

﴿لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ﴾ ''تاکہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ہڑپ کر سکو گناہ کے ساتھ''

﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ''اور تم اس کو جانتے بوجھتے کر رہے ہو۔''

یہ تقویٰ کے لیے معیار اور کسوٹی ہے۔ جو شخص اکلِ حلال پر قانع ہو گیا اور حرام خوری سے بچ گیا وہ متقی ہے۔ ورنہ نمازوں اور روزوں کے انبار کے ساتھ ساتھ جو شخص حرام خوری کی روش اختیار کیے ہوئے ہے وہ متقی نہیں ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ احکام کی آیات کے درمیان یہ آیت کیونکر آئی ہے۔ اس سے پہلے روزے کے احکام آئے ہیں، آگے حج کے احکام آ رہے ہیں، پھر قتال کے احکام آئیں گے۔ ان کے درمیان میں اس آیت کی کیا حکمت ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جیسے روزے کی حکمت کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ روحِ انسانی میں تقرّب الی اللہ کی طلب پیدا ہو جائے اسی طرح احکامِ صوم کا نقطۂ عروج ''اکلِ حلال'' ہے۔

آیات ۱۸۹ تا ۱۹۶

﴿یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ ط قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ
ظُھُوْرِھَا وَلٰـکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ج وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا ص وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ
ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَالْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ج وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْہِ ج فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ ط کَذٰلِکَ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَھَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ
غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ط فَاِنِ انْتَھَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی
الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّھْرُ الْحَرَامُ بِالشَّھْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ط فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ
بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ ص وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا
بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ج وَاَحْسِنُوْا ج اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ ط فَاِنْ
اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ ج وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَکُمْ حَتّٰی یَبْلُغَ الْھَدْیُ مَحِلَّہٗ ط فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ
مَّرِیْضًا اَوْ بِہٖٓ اَذًی مِّنْ رَّاْسِہٖ فَفِدْیَۃٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَۃٍ اَوْ نُسُکٍ ج فَاِذَآ اَمِنْتُمْ قف فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَۃِ
اِلَی الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ ج فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَسَبْعَۃٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ط تِلْکَ
عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ ط ذٰلِکَ لِمَنْ لَّمْ یَکُنْ اَھْلُہٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ
شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾﴾

آیت ۱۸۹ ﴿یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ ط﴾ ''(اے نبیﷺ!) یہ آپؐ سے پوچھ رہے ہیں چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے بارے میں۔''

﴿قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط﴾ ''کہہ دیجیے یہ لوگوں کے لیے اوقات کا تعین ہے اور حج کے لیے ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ نے ایک کیلنڈر لٹکا دیا ہے۔ ہلال کو دیکھ کر معلوم ہو گیا کہ چاند کی پہلی تاریخ ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد نصف چاند دیکھ کر پتا چل گیا کہ اب ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔ دو ہفتے ہو گئے تو پورا چاند ہو گیا۔ اب اس نے گھٹنا شروع کیا۔ تو یہ نظام گویا لوگوں کے لیے اوقاتِ کار کی تعیین کے لیے ہے اور اس ضمن میں خاص طور پر سب سے اہم معاملہ حج کا ہے۔ یہ نوٹ کیجیے کہ صوم کے بعد حج اور حج کے ساتھ ہی قتال کا ذکر آ رہا ہے۔ اس لیے کہ ''حج'' وہ عبادت ہے جو ایک خاص جگہ پر ہو سکتی ہے۔ نماز اور روزہ ہر جگہ ہو سکتے ہیں، زکوٰۃ ہر جگہ دی جا سکتی ہے، لیکن ''حج'' تو مکہ مکرمہ ہی میں ہو گا، اور وہ مشرکین کے زیر تسلط تھا اور اسے مشرکین کے تسلط سے نکالنے کے لیے قتال لازم تھا۔ قتال کے لیے پہلے صبر کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ پہلے روزے کا حکم دیا گیا کہ جیسے اپنے گھوڑوں کو روزہ رکھواتے تھے ایسے ہی خود روزہ رکھو۔ سورۃ البقرۃ میں صوم، حج اور قتال کے احکام کے درمیان یہ ترتیب اور ربط ہے۔

﴿وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰـکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ج﴾ ''اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو، بلکہ نیکی تو اس کی ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا۔''

اہل عرب ایامِ جاہلیت میں بھی حج تو کر رہے تھے، مناسک حج کی کچھ بگڑی ہوئی شکلیں بھی موجود تھیں، اور اس کے ساتھ انہوں نے کچھ بدعات و رسوم کا اضافہ بھی کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک بدعت یہ تھی کہ جب وہ احرام باندھ کر گھر سے نکل پڑتے تو اس کے بعد اگر انہیں گھروں میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آتی تو گھروں کے دروازوں سے داخل نہ ہوتے بلکہ پچھواڑے سے دیوار پھلاند کر آتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ بڑا تقویٰ ہے۔ فرمایا یہ سرے سے کوئی نیکی کی بات نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو، بلکہ اصل نیکی تو اس کی نیکی ہے جو تقویٰ کی روش اختیار کرے اور حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھے۔ یہاں پوری ''آیت البر'' کو ذہن میں رکھ لیجیے جس کے آخر میں الفاظ آئے تھے: ﴿وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾﴾ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں ﴿وَلٰـکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ج﴾ کے الفاظ میں نیکی کا وہ پورا تصور مضمر ہے جو آیت البر میں بیان ہو چکا ہے۔

﴿وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا ص﴾ ''اور گھروں میں داخل ہوا اُن کے دروازوں سے۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

آیت ۱۹۰ ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ﴾ ''اور قتال کرو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے قتال کر رہے ہیں''

لیجیے قتال کا حکم آ گیا۔ سورۃ البقرۃ کے نصف ثانی کے مضامین کی جو چار لڑیاں میں نے گنوائی تھیں —— یعنی عبادات، معاملات، انفاق اور قتال —— یہ ان میں سے چوتھی لڑی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کی راہ میں ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کر رہے ہیں۔

﴿وَلَا تَعْتَدُوْا ط﴾ ''لیکن حد سے تجاوز نہ کرو۔''

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

آیت ۱۹۱ ﴿وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ﴾ ''اور انہیں قتل کرو جہاں کہیں بھی انہیں پاؤ''

﴿وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ﴾ ''اور نکالو ان کو وہاں سے جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے''

مہاجرین مکہ مکرمہ سے نکالے گئے تھے، وہاں پر محمد رسول اللہﷺ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان پر قافیہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا، تبھی تو آپؐ نے ہجرت کی۔ اب حکم دیا جا رہا ہے کہ نکالو انہیں وہاں سے جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔

﴿وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ﴾ ''اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔''

کفار و مشرکین سے قتال کے ضمن میں کہیں یہ خیال نہ آئے کہ قتل اور خونریزی بُری بات ہے۔ یاد رکھو کہ فتنہ اس سے بھی زیادہ بری بات ہے۔ فتنہ کیا ہے؟ ایسے حالات جن میں انسان خدائے واحد کی بندگی نہ کر سکے' اسے غلط کاموں پر مجبور کیا جائے' وہ حرام خوری پر مجبور ہو گیا ہو' یہ سارے حالات فتنہ ہیں۔ تو واضح رہے کہ قتل اور خونریزی اتنی بُری شے نہیں ہے جتنی فتنہ ہے۔

﴿وَلَا تُقٰتِلُوۡهُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوۡكُمۡ فِيۡهِ ۚ﴾ ''ہاں مسجد حرام کے پاس (جسے امن کی جگہ بنا دیا گیا ہے) اُن سے جنگ مت کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔''

﴿فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ ؕ﴾ ''پھر اگر وہ تم سے جنگ کریں تو اُن کو قتل کرو۔''

﴿كَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹۱﴾﴾ ''یہی بدلہ ہے کافروں کا۔''

آیت ۱۹۲ ﴿فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۲﴾﴾ ''پھر اگر وہ باز آ جائیں تو یقیناً اللہ بخشنے والا بہت مہربان ہے۔''

آیت ۱۹۳ ﴿وَقٰتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّيَكُوۡنَ الدِّيۡنُ لِلّٰهِ ؕ﴾ ''اور لڑو ان سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔''

﴿فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَلَا عُدۡوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۹۳﴾﴾ ''پھر اگر وہ باز آ جائیں تو کوئی زیادتی جائز نہیں ہے مگر ظالموں پر۔''

دعوتِ محمدی ﷺ کے ضمن میں اب یہ جنگ کا مرحلہ شروع ہو گیا ہے۔ مسلمانو جان لو' ایک دَور وہ تھا کہ بارہ تیرہ برس تک تمہیں حکم تھا ﴿كُفُّوۡٓا اَيۡدِيَكُمۡ﴾ ''اپنے ہاتھ باندھے رکھو!'' ماریں کھاؤ لیکن ہاتھ مت اٹھانا۔ اب تمہاری دعوت اور تحریک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ اب جب تمہاری تلواریں نیام سے باہر آ گئی ہیں تو یہ نیام میں نہ جائیں جب تک کہ فتنہ بالکل ختم نہ ہو جائے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے' اللہ کا دین قائم ہو جائے' پوری زندگی میں اس کے احکام کی تنفیذ ہو رہی ہو۔ یہ آیت دوبارہ سورۃ الانفال میں زیادہ نکھری ہوئی شان کے ساتھ آئی ہے: ﴿وَقَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّيَكُوۡنَ الدِّيۡنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹) ''اور جنگ کرو اُن سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ دین کی بالادستی جزوی طور پر نہیں بلکہ کلی طور پر پوری انسانی زندگی پر قائم ہو جائے' انفرادی زندگی پر بھی اور اجتماعی زندگی پر بھی۔ اور اجتماعی زندگی کے بھی سارے پہلو (Politico-Socio-Economic System) کلی طور پر اللہ کے احکام کے تابع ہوں۔

آیت ۱۹۴ ﴿اَلشَّهۡرُ الۡحَـرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَـرَامِ﴾ ''حرمت والا مہینہ بدلہ ہے حرمت والے مہینے کا''

﴿وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ﴾ ''اور حرمات کے اندر بھی بدلہ ہے۔''

یعنی اگر انہوں نے اَشہر حرم کی بے حرمتی کی ہے تو اُس کے بدلے میں یہ نہیں ہوگا کہ ہم تو ہاتھ پر ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں کہ یہ تو اَشہر حرم ہیں۔ حدودِ حرم اور اَشہر حرم کی حرمت اہل عرب کے ہاں مسلّم تھی۔ ان کے ہاں یہ طے تھا کہ ان چار مہینوں میں کوئی خونریزی' کوئی جنگ نہیں ہوگی' یہاں تک کہ کوئی اپنے باپ کے قاتل کو پالے تو وہ اس کو بھی قتل نہیں کرے گا۔ یہاں وضاحت کی جا رہی ہے کہ اَشہر حرم اور حدودِ حرم میں جنگ واقعتاً بہت بڑا گناہ ہے' لیکن اگر کفار کی طرف سے ان کی حرمت کا لحاظ نہ رکھا جائے اور وہ اقدام کریں تو اب یہ نہیں ہوگا کہ ہاتھ پاؤں باندھ کر اپنے آپ کو پیش کر دیا جائے' بلکہ جوابی کارروائی کرنا ہوگی۔ اس جوابی اقدام میں اگر حدودِ حرم یا اَشہر حرم کی بے حرمتی کرنی پڑے تو اس کا وبال بھی ان پر آئے گا جنہوں نے اس معاملے میں پہل کی۔

﴿فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۖ﴾ ''تو جو کوئی بھی تم پر زیادتی کرتا ہے تو تم بھی اس کے خلاف کارروائی کرو (اقدام کرو) جیسے کہ اس نے تم پر زیادتی کی۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''

﴿وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾﴾ ''اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔''

یعنی اللہ کی تائید و نصرت اور اس کی مدد اہل تقویٰ کے لیے آئے گی۔ اب آگے ''انفاق'' کا حکم آ رہا ہے جو مضامین کی چار لڑیوں میں سے تیسری لڑی ہے۔ قتال کے لیے انفاقِ مال لازم ہے۔ اگر فوج کے لیے ساز و سامان نہ ہو' رسد کا اہتمام نہ ہو' ہتھیار نہ ہوں' سواریاں نہ ہوں تو جنگ کیسے ہو گی؟

آیت ۱۹۵ ﴿وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۚ﴾ ''اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور مت ڈالو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں۔''

یعنی جس وقت اللہ کے دین کو روپے پیسے کی ضرورت ہو اُس وقت جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے جی چراتے ہیں وہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر عام اپیل کی اور اُس وقت جو لوگ اپنے مال کو سمیٹ کر بیٹھے رہے تو گویا انہوں نے اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈال دیا۔

﴿وَاَحۡسِنُوۡا ۛۚ﴾ ''اور احسان کی روش اختیار کرو۔''

اپنے دین کے اندر خوبصورتی پیدا کرو۔ دین میں بہتر سے بہتر مقام حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ دنیا میں آگے سے آگے اور دین میں پیچھے سے پیچھے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دین میں یہ دیکھیں گے کہ کم سے کم پر گزارا ہو جائے' جبکہ دنیا کے معاملے میں آگے سے آگے نکلنے کی کوشش ہو گی ع ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!'' یہ جستجو جو دنیا میں ہے اس سے کہیں بڑھ کر دین میں ہونی چاہیے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ﴾ ''پس تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۹۵﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ محسنین کو (ان لوگوں کو جو درجۂ احسان پر فائز ہو جائیں) پسند کرتا

ہے۔‘‘

حدیثِ جبرائیلؑ (جسے اُمّ السُّنّۃ کہا جاتا ہے) میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے تین سوال کیے تھے: (۱) اَخۡبِرۡنِیۡ عَنِ الۡاِسۡلَامِ ’’مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے (کہ اسلام کیا ہے؟) (۲) اَخۡبِرۡنِیۡ عَنِ الۡاِیۡمَانِ ’’مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے (کہ ایمان کیا ہے؟)‘‘ (۳) اَخۡبِرۡنِیۡ عَنِ الۡاِحۡسَانِ ’’مجھے احسان کے بارے میں بتایئے (کہ احسان کیا ہے؟) احسان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ ‘ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُنۡ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ)) (۲۳) ’’(احسان یہ ہے) کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے‘ پھر اگر تو اسے نہ دیکھ سکے (یعنی یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے) تو (کم از کم یہ خیال رہے کہ) وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے‘‘۔ دین کے سارے کام‘ عبادات‘ انفاق اور جہاد و قتال ایسی کیفیت میں اور ایسے اخلاص کے ساتھ ہوں گویا تم اپنی آنکھوں سے اللہ کو دیکھ رہے ہو‘ اور اگر یہ مقام اور کیفیت حاصل نہ ہو تو کم سے کم یہ کیفیت تو ہو جائے کہ تمہیں مستحضر رہے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ احسان ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ اس انداز میں نہیں کیا گیا۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ویسے یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۃ المائدۃ میں آئے گا۔

آیت ۱۹۶ ﴿وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَۃَ لِلّٰہِ ؕ﴾ ’’اور حج اور عمرہ مکمل کرو اللہ کے لیے۔‘‘

عمرہ کے لیے احرام تو مدینہ منورہ سے سات میل باہر نکل کر ہی باندھ لیا جائے گا‘ لیکن حج مکمل تب ہوگا جب طواف بھی ہوگا‘ وقوفِ عرفہ بھی ہوگا اور اس کے سارے مناسک ادا کیے جائیں گے۔ لہٰذا جو شخص بھی حج یا عمرہ کی نیت کر لے تو پھر اسے تمام مناسک کو مکمل کرنا چاہیے‘ کوئی کمی نہ رہے۔

﴿فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ﴾ ’’پھر اگر تمہیں گھیر لیا جائے‘‘

یعنی روک دیا جائے‘ جیسا کہ ۶ ہجری میں ہوا کہ مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کرنی پڑی اور عمرہ ادا کیے بغیر واپس جانا پڑا۔ مشرکین مکہ اَڑ گئے تھے کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

﴿فَمَا اسۡتَیۡسَرَ مِنَ الۡہَدۡیِ ۚ﴾ ’’تو جو کوئی بھی قربانی میسر ہو وہ پیش کر دو۔‘‘

یہ دمِ احصار کہلاتا ہے کہ چونکہ اب ہم آگے نہیں جا سکتے‘ ہمیں یہیں احرام کھولنا پڑ رہا ہے تو ہم اللہ کے نام پر یہ جانور دے رہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اس کا کفارہ ہے۔

﴿وَلَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَکُمۡ حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡہَدۡیُ مَحِلَّہٗ ؕ﴾ ’’اور اپنے سر اُس وقت تک نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔‘‘

یعنی جہاں جا کر قربانی کا جانور ذبح ہونا ہے وہاں پہنچ نہ جائے۔ اگر آپ کو حج یا عمرہ سے روک دیا گیا اور آپ نے قربانی کے جانور آگے بھیج دیے تو آپ کو روکنے والے ان جانوروں کو نہیں روکیں گے‘ اس لیے کہ ان کا گوشت تو انہیں کھانے کو ملے گا۔ اب اندازہ کر لیا جائے کہ اتنا وقت گزر گیا ہے کہ قربانی کا جانور اپنے مقام پر پہنچ گیا ہوگا۔

﴿فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ بِہٖۤ اَذًی مِّنۡ رَّاۡسِہٖ﴾ ’’پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو‘‘

یعنی سر میں کوئی زخم وغیرہ ہو اور اُس کی وجہ سے بال کٹوانے ضروری ہو جائیں۔

﴿فَفِدۡیَۃٌ مِّنۡ صِیَامٍ اَوۡ صَدَقَۃٍ اَوۡ نُسُکٍ ۚ﴾ ’’تو وہ فدیہ کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔‘‘

اگر اس ہدی کے جانور کے کعبہ پہنچنے سے پہلے پہلے تمہیں اپنے بال کاٹنے پڑیں تو فدیہ ادا کرنا ہوگا۔ یعنی ایک کمی جو رہ گئی ہے اس کی تلافی کے لیے کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کفارے کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں: روزے‘ یا صدقہ یا قربانی۔ اس کی وضاحت احادیثِ نبویہؐ سے ہوتی ہے کہ یا تو تین دن کے روزے رکھے جائیں‘ یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا کم از کم ایک بکری کی قربانی دی جائے۔ اس قربانی کو دمِ جنایت کہتے ہیں۔

﴿فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ ۟ ﴾ ’’پھر جب تمہیں امن حاصل ہو (اور تم سیدھے بیت اللہ پہنچ سکتے ہو)‘‘

﴿فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَۃِ اِلَی الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَیۡسَرَ مِنَ الۡہَدۡیِ ۚ﴾ ’’تو جو کوئی بھی فائدہ اٹھائے عمرے کا حج سے قبل تو وہ قربانی پیش کرے جو بھی اسے میسر ہو۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے اہل عرب کے ہاں ایک سفر میں حج اور عمرہ دونوں کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک یہ کعبہ کی توہین تھی۔ ان کے ہاں حج کے لیے تین مہینے شوال‘ ذوالقعدہ اور ذوالحجہ تھے‘ جبکہ رجب کا مہینہ عمرے کے لیے مخصوص تھا۔ وہ عمرے کے لیے علیحدہ سفر کرتے اور حج کے لیے علیحدہ۔ یہ بات حدودِ حرم میں رہنے والوں کے لیے تو آسان تھی‘ لیکن اس اُمت کو تو پوری دنیا میں پھیلنا تھا اور دور دراز سے سفر کر کے آنے والوں کے لیے اس میں مشقت تھی۔ لہٰذا شریعتِ محمدیؐ میں لوگوں کے لیے جہاں اور آسانیاں پیدا کی گئیں وہاں حج و عمرہ کے ضمن میں یہ آسانی بھی پیدا کی گئی کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کو جمع کر لیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے عمرہ کر کے احرام کھول دیا جائے اور پھر آٹھویں ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھ لیا جائے۔ یہ ’’حجِ تمتع‘‘ کہلاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حج کے لیے احرام باندھا تھا‘ جاتے ہی عمرہ بھی کر لیا‘ لیکن احرام کھولا نہیں اور اسی احرام میں حج بھی کر لیا۔ یہ ’’حجِ قران‘‘ کہلاتا ہے۔ لیکن اگر شروع ہی سے صرف حج کا احرام باندھا جائے اور عمرہ نہ کیا جائے تو یہ ’’حجِ افراد‘‘ کہلاتا ہے۔ قران یا تمتع کرنے والے پر قربانی ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسے دمِ شکر کہتے ہیں اور قربانی کرنے والے کو اس میں سے کھانے کی اجازت دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ دمِ جبر ہے اور قربانی کرنے والے کو اس میں سے کھانے کی اجازت نہیں ہے۔

﴿فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ فِی الۡحَجِّ﴾ ’’جس کو قربانی نہ ملے تو وہ تین دن کے روزے ایامِ حج میں رکھے‘‘

یعنی عین ایامِ حج میں ساتویں‘ آٹھویں اور نویں ذوالحجہ کو روزہ رکھے۔ دسویں کا روزہ نہیں ہو سکتا‘ وہ عید کا دن (یوم النحر) ہے۔

﴿وَسَبۡعَۃٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ﴾ ’’اور سات روزے رکھو جبکہ تم واپس پہنچ جاؤ۔‘‘

اپنے گھروں میں جا کر سات روزے رکھو۔

﴿تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ ط﴾ ''یہ کل دس (روزے) ہوں گے۔''

﴿ذٰلِکَ لِمَنْ لَّمْ یَکُنْ اَھْلُہٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط﴾ ''یہ (رعایت) اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ رہتے ہوں۔''

یعنی ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ کو جمع کرنے کی رعایت' خواہ تمتع کی صورت میں ہو یا قران کی صورت میں' صرف آفاقی کے لیے ہے' جس کے اہل و عیال جوارِ حرم میں نہ رہتے ہوں' یعنی جو حدودِ حرم کے باہر سے حج کرنے آیا ہو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾﴾ ''اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔''

آیات ۱۹۷ تا ۲۰۳

﴿اَلْحَجُّ اَشْھُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ج فَمَنْ فَرَضَ فِیْھِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْہُ اللّٰہُ ط وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی ز وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ ط فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ص وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰىکُمْ ج وَاِنْ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا ط فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا ط وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ط فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ ج وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ لا لِمَنِ اتَّقٰی ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾﴾

پچھلے رکوع سے مناسکِ حج کا تذکرہ شروع ہو چکا ہے۔ اب اس پچیسویں رکوع میں حج کا اصل فلسفہ' اس کی اصل حکمت اور اس کی اصل روح کا بیان ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۹۷ ﴿اَلْحَجُّ اَشْھُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ج﴾ ''حج کے معلوم مہینے ہیں۔''

یعنی عرب میں جو بھی پہلے سے رواج چلا آ رہا تھا اُس کی توثیق فرما دی گئی کہ واقعی حج کے مواقیت کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِیْھِنَّ الْحَجَّ﴾ ''تو جس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ان مہینوں میں حج کو''

لازم کرنے سے مراد حج کا عزم اور نیت پختہ کرنا ہے اور اس کی علامت احرام باندھ لینا ہے۔

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ط﴾ ''تو (اس کو خبردار رہنا چاہیے کہ) دورانِ حج نہ تو شہوت کی کوئی بات کرنی ہے' نہ فسق و فجور کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی۔''

زمانۂ حج میں جن باتوں سے روکا گیا ہے ان میں اوّلین یہ ہے کہ شہوت کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ میاں بیوی بھی اگر ساتھ حج کر رہے ہوں تو احرام کی حالت میں ان کے لیے وہی قید ہے جو اعتکاف کی حالت میں ہے۔ باقی یہ کہ فسوق و جدال یعنی اللہ کی نافرمانی اور باہم لڑائی جھگڑا تو ویسے ہی ناجائز ہے' دورانِ حج اس سے خاص طور پر روک دیا گیا۔ اس لیے کہ بہت بڑی تعداد میں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے' سفر میں بھی لوگ ساتھ ہوتے ہیں۔ اس حالت میں لوگوں کے غصوں کے پارے جلدی چڑھ جانے کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے خاص طور پر روکا گیا تاکہ مناسکِ حج کی ادائیگی کے دوران امن اور سکون ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ آج بھی یہ بات معجزات میں سے ہے کہ دنیا بھر سے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے جمع ہونے کے باوجود وہاں امن و سکون رہتا ہے اور جنگ و جدال اور جھگڑا و فساد وغیرہ کہیں نظر نہیں آتا۔ مجھے الحمدللہ پانچ چھ مرتبہ حج کی سعادت حاصل ہوئی ہے' لیکن وہاں پر جھگڑا اور گالم گلوچ کی کیفیت میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْہُ اللّٰہُ ط﴾ ''اور نیکی کے جو کام بھی تم کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔''

حج کے دوران مناسکِ حج پر مستزاد جو بھی نیکی کے کام کر سکو' مثلاً نوافل پڑھو یا اضافی طواف کرو تو تمہاری یہ نیکیاں اللہ کے علم میں ہوں گی' کسی اور کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی ز﴾ ''اور زادِ راہ ساتھ لے لیا کرو' یقیناً بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔''

اس کے دو معنی لیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ یعنی سفر حج میں مادی زادِ راہ کے علاوہ تقویٰ کی پونجی بھی ضروری ہے۔ اگر آپ نے اخراجاتِ سفر کے لیے روپیہ پیسہ تو وافر لے لیا' لیکن تقویٰ کی پونجی سے تہی دامن رہے تو دورانِ حج اچھی سہولیات تو حاصل کر لیں گے مگر حج کی روح اور اس کی برکات سے محروم رہیں گے۔

لیکن اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی بہت اہم ہے کہ اگر انسان خود اپنا زادِ راہ ساتھ نہ لے تو پھر وہاں دوسروں سے مانگنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہاں ''تقویٰ'' سے مراد سوال سے بچنا ہے۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ زادِ راہ لے کر چلو تاکہ تمہیں کسی کے سامنے سائل نہ بننا پڑے۔ اگر تم صاحبِ استطاعت نہیں ہو تو حج تم پر فرض ہی نہیں ہے۔ اور ایک شے جو تم پر فرض نہیں ہے اس کے لیے خواہ مخواہ وہاں جا کر بھیک مانگنا یا یہاں سے بھیک مانگ کر یا چندہ اکٹھا کر کے جانا قطعاً غلط حرکت ہے۔

﴿وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾﴾ ''اور میرا ہی تقویٰ اختیار کرو اے ہوش مندو!''

آیت ۱۹۸ ﴿لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ ط﴾ ''تم پر اس امر میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم (سفر حج کے

دوران) اپنے ربّ کا فضل بھی تلاش کرو۔''

آدمی ہندوستان سے یا پاکستان سے حج کے لیے جا رہا ہے اور وہ اپنے ساتھ کچھ ایسی اجناس لے جائے جنہیں وہاں پر بیچ کر کچھ نفع حاصل کر لے تو یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔

﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠﴾ ''پس جب تم عرفات سے واپس لوٹو تو اللہ کو یاد کرو مشعر حرام کے نزدیک۔''

وقوفِ عرفات حج کا رکن اعظم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلْحَجُّ عَرَفَةُ))(۲۴) یعنی اصل حج تو عرفہ ہی ہے۔ اگر کسی سے حج کے باقی تمام مناسک رہ جائیں، صرف قیامِ عرفہ میں شمولیت ہو جائے تو اس کا حج ہو گیا، باقی جو چیزیں رہ گئی ہیں ان کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص عرفات کے قیام میں ہی شریک نہیں ہوا تو پھر اس کا حج نہیں ہوا۔ ایامِ حج کا ٹائم ٹیبل نوٹ کیجیے کہ ۸ ذوالحجہ کو مکہ مکرمہ سے نکل کر رات منیٰ میں گزارنا ہوتی ہے۔ اگلا دن ۹ ذوالحجہ یوم عرفہ ہے۔ اس روز صبح کو عرفات کے لیے قافلے چلتے ہیں اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوپہر سے پہلے وہاں پہنچ جایا جائے۔ وہاں پر ظہر کے وقت ظہر اور عصر دونوں نمازیں ملا کر پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سے غروبِ آفتاب تک عرفات کا قیام ہے، جس میں کوئی نماز نہیں۔ یعنی روایتی عبادات کے سب دروازے بند ہیں۔ اب تو صرف دعا ہے۔ اگر آپ کے اندر دعا کی ایک روح پیدا ہو چکی ہے، آپ اپنے ربّ سے ہم کلام ہو سکتے ہیں اور آپ کو حلاوتِ مناجات حاصل ہو گئی ہے تو بس دعا مانگتے رہیے۔ قیامِ عرفہ کے دوران کھڑے ہو کر یا بیٹھے ہوئے، جس طرح بھی ہو اللہ سے مناجات کی جائے۔ یا اس میں اگر کسی وجہ سے کمی ہو جائے تو آدمی تلاوت کرے۔ لیکن عام نماز اب کوئی نہیں۔ ۹ ذوالحجہ کو وقوفِ عرفات کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہو چکنے کے بعد عرفات سے روانگی ہے، لیکن وہاں مغرب کی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اب مزدلفہ میں جا کر مغرب اور عشاء دونوں نمازیں جمع کر کے ادا کرنی ہیں اور رات وہیں کھلے آسمان تلے بسر کرنی ہے۔ یہ مزدلفہ کا قیام ہے۔ مشعر حرام ایک پہاڑ کا نام ہے جو مزدلفہ میں واقع ہے۔

﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ﴾ ''اور یاد کرو اُسے جیسے کہ اُس نے تمہیں ہدایت کی ہے۔''

یعنی اللہ کا ذکر کرو جس طرح اللہ نے تمہیں اپنے رسول ﷺ کے ذریعے سکھایا ہے۔ ذکر کے جو طور طریقے رسول اللہ ﷺ نے سکھائے ہیں انہیں اختیار کرو اور زمانۂ جاہلیت کے طریقے ترک کر دو۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ١٩٨﴾ ''اور یقیناً اس سے پہلے تو تم گمراہ لوگوں میں سے تھے۔''

تم حج کی حقیقت سے ناواقف تھے۔ حج کی بس شکل باقی رہ گئی تھی، اس کی روح ختم ہو گئی تھی، اس کے مناسک میں بھی ردّ و بدل کر دیا گیا تھا۔

آیت ۱۹۹ ﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ ''پھر تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے سب لوگ پلٹتے ہیں،''

زمانۂ جاہلیت میں قریش مکہ عرفات تک نہ جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری خاص حیثیت ہے، لہٰذا ہم منیٰ ہی میں مقیم رہیں گے، باہر سے آنے والے لوگ عرفات جائیں اور وہاں سے طواف کے لیے واپس لوٹیں، یہ سارے مناسک ہمارے لیے نہیں ہیں۔ یہاں فرمایا گیا کہ یہ ایک غلط بات ہے جو تم نے ایجاد کر لی ہے۔ تم بھی وہیں سے طواف کے لیے واپس لوٹو جہاں سے دوسرے لوگ لوٹتے ہیں، یعنی عرفات سے۔

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ﴾ ''اور اللہ سے استغفار کرتے رہو۔''

اپنی اگلی تقصیر پر نادم ہو اور اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت چاہو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ١٩٩﴾ ''یقیناً اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

آیت ۲۰۰ ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ﴾ ''اور جب تم اپنے مناسکِ حج ادا کر چکو،''

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ﴾ ''تو اب اللہ کا ذکر کرو جیسے کہ تم اپنے آباء و اَجداد کا ذکر کرتے رہے ہو،''

﴿اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ﴾ ''بلکہ اس سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو۔''

یعنی دسویں ذوالحجہ کو جب افعالِ حج سے فراغت پا چکو تو قیامِ منیٰ کے دوران اللہ کا خوب ذکر کرو جیسے زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء و اَجداد کا ذکر کیا کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر اللہ کا ذکر کرو۔ ان کا قدیم دستور تھا کہ حج سے فارغ ہو کر تین دن منیٰ میں قیام کرتے اور بازار لگاتے۔ وہاں میلے کا سا سماں ہوتا جہاں مختلف قبائل کے شعراء اپنے قبیلوں کی مدح سرائی کرتے تھے اور اپنے اسلاف کی عظمت بیان کرتے تھے۔ اللہ کا ذکر ختم ہو چکا تھا۔ فرمایا کہ جس شدومدّ کے ساتھ تم اپنے آباء و اَجداد کا ذکر کرتے رہے ہو اب اسی انداز سے، بلکہ اُس سے بھی زیادہ شدومدّ کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو۔

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ٢٠٠﴾ ''لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو یہی کہتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں دنیا ہی میں دے دے، اور ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔''

یعنی ارضِ حرم میں پہنچ کر دورانِ حج بھی اُن کی ساری دُعائیں دُنیوی چیزوں ہی کے لیے ہیں۔ چنانچہ وہ مال کے لیے، اولاد کے لیے، ترقی کے لیے، دُنیوی ضروریات کے لیے اور اپنی مشکلات کے حل کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں دنیا رَچی بسی ہوئی ہے۔ جیسے بنی اسرائیل کے دلوں میں بچھڑے کا تقدس اور اس کی محبت جاگزیں کر دی گئی تھی اُسی طرح ہمارے دلوں میں دنیا کی محبت گھر کر چکی ہے، لہٰذا وہاں جا کر بھی دنیا ہی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ یہاں واضح فرما دیا گیا کہ ایسے لوگوں کے لیے پھر آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

آیت ۲۰۱ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ﴾ ''اور اُن میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں''

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ٢٠١﴾ ''پروردگار! ہمیں اس دنیا میں بھی خیر عطا فرما اور آخرت میں بھی خیر عطا فرما اور ہمیں بچا لے آگ کے عذاب سے۔''

یہی وہ دعا ہے جو طواف کے ہر چکر میں رکنِ یمانی سے حجرِ اَسود کے درمیان چلتے ہوئے مانگی جاتی ہے۔ دنیا کا سب سے

بڑا خیر ایمان اور ہدایت ہے۔ دنیا کا کوئی خیر خیر نہیں ہے جب تک کہ اس کے ساتھ ہدایت اور ایمان نہ ہو۔ چنانچہ سب سے پہلے انسان ہدایت‘ ایمان اور استقامت طلب کرے‘ پھر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دنیا میں کشادگی اور رزق میں کشائش کی دعا بھی کرے تو یہ بات پسندیدہ ہے۔

آیت ۲۰۲ ﴿اُولٰٓئِکَ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ﴾ ”ان ہی لوگوں کے لیے حصہ ہو گا اُس میں سے جو انہوں نے کمایا۔“

یہ الفاظ بہت اہم ہیں۔ محض دعا کافی نہیں ہو جائے گی‘ بلکہ اپنا عمل بھی ضروری ہے۔ یہاں پر یہ جو فرمایا کہ ”ان کے لیے حصہ ہے اُس میں سے جو انہوں نے کمایا“ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں سے کیوں؟ وہ تو سارا ملنا چاہیے! لیکن نہیں‘ بندے کو اپنے اعمال پر غرّہ نہیں ہونا چاہیے‘ اسے ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں کسی مسئلے میں میری نیت میں فساد نہ آ گیا ہو‘ ممکن ہے میرے کسی عمل کے اندر کوئی کمی یا کوتاہی ہو گئی ہو۔ اس لیے یہ نہ سمجھ لیں کہ جو کچھ بھی کیا ہے اس کا اجر لازماً ملے گا۔ جو کچھ انہوں نے کمایا ہے اُس میں اگر خلوص ہے‘ ریاکاری نہیں ہے‘ اس کے تمام آداب اور شرائط ملحوظ رکھے گئے ہیں تو اُن کو ان کا حصہ ملے گا۔

﴿وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾﴾ ”اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کو حساب چکانے میں دیر نہیں لگتی‘ وہ بہت جلدی حساب کر لے گا۔ اب تو ہمارے لیے یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں رہا‘ ہمارے ہاں کمپیوٹرز پر کتنی جلدی حساب ہو جاتا ہے‘ اللہ کے ہاں تو پتا نہیں کیسا سپر کمپیوٹر ہو گا کہ اسے حساب نکالنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی!

آیت ۲۰۳ ﴿وَاذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ﴾ ”اور ذکر کرو اللہ کا گنتی کے چند دنوں میں۔“

اس سے مراد ذوالحجہ کی گیارہویں‘ بارہویں اور تیرہویں تاریخیں ہیں جن میں یوم نحر کے بعد منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے۔ ان تین دنوں میں کنکریاں مارنے کے وقت اور ہر نماز کے بعد تکبیر کہنے کا حکم ہے۔ دیگر اوقات میں بھی ان دنوں میں تکبیر اور ذکر الٰہی کثرت سے کرنا چاہیے۔

﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ ۚ﴾ ”تو جو کوئی دو دن ہی میں جلدی سے واپس آ جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔“

یعنی جو کوئی تین دن پورے نہیں کرتا‘ بلکہ دو دن ہی میں واپسی اختیار کر لیتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ تَاَخَّرَ﴾ ”اور جو پیچھے رہے“

یعنی منیٰ میں ٹھہرا رہے اور تین دن کی مقدار پوری کرے۔

﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ﴾ ”تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں‘ بشرطیکہ وہ تقویٰ اختیار کرے۔“

اصل چیز تقویٰ ہے۔ جو کوئی زمانۂ حج میں پرہیزگاری کی روش اختیار کیے رکھے تو اس پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ منیٰ میں دو دن قیام کرے یا تین دن۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اجر محفوظ ہے۔ اگر کسی شخص نے منیٰ میں قیام تو تین دن کا کیا‘ لیکن تیسرے دن اُس نے کچھ اور ہی حرکتیں شروع کر دیں‘ اس لیے کہ جی اکتایا ہوا ہے اور طبیعت کے اندر ٹھہراؤ نہیں ہے تو وہ تیسرا دن اس کے لیے کچھ خاص مفید ثابت نہیں ہو گا۔ اصل شے جو اللہ کے ہاں قبولیت کے لیے شرط لازم ہے‘ وہ تقویٰ ہے۔ آگے پھر فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾﴾ ”اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور خوب جان رکھو کہ یقیناً تمہیں اُسی کی جانب جمع کر دیا جائے گا۔“

تم سب کے سب ہانک کر اُسی کی جناب میں لے جائے جاؤ گے۔

آیات ۲۰۴ تا ۲۱۰

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُہٗ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیُشْھِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِہٖ ۙ وَھُوَ اَلَدُّ
الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْھَا وَیُھْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ
الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُہٗ جَھَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِھَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ
یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ
کَآفَّۃً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْکُمُ الْبَیِّنٰتُ
فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾ ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَھُمُ اللّٰہُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَقُضِیَ
الْاَمْرُ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾﴾

آیت ۲۰۴ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُہٗ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ ”اور لوگوں میں سے کوئی شخص ایسا بھی ہے جس کی باتیں تمہیں بہت اچھی لگتی ہیں دنیا کی زندگی میں“

یہ منافقین میں سے ایک خاص گروہ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ منافقین میں سے بعض تو ایسے تھے کہ ان کی زبانوں پر بھی نفاق واضح طور پر ظاہر ہو جاتا تھا‘ جبکہ منافقین کی ایک قسم وہ تھی کہ بڑے چاپلوس اور چرب زبان تھے۔ ان کی گفتگو ایسی ہوتی تھی گویا وہ تو بڑے ہی مخلص اور بڑے ہی فدا کار ہیں۔ اپنا موقف اس انداز سے پیش کرتے کہ یوں لگتا تھا کہ بڑی ہی نیک نیتی پر مبنی ہے‘ لیکن ان کا کردار انتہائی گھناؤنا تھا۔ ان کی ساری بھاگ دوڑ رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مخالفت کی راہ میں ہوتی تھی۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

﴿وَیُشْھِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِہٖ ۙ﴾ ”اور وہ اللہ کو بھی گواہ ٹھہراتا ہے اپنے دل کی بات پر۔“

اس کا اندازِ کلام یہ ہوتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اللہ جانتا ہے کہ خلوص سے کہہ رہا ہوں‘ پوری نیک نیتی سے کہہ رہا

ہوں۔ منافق کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو قابل اعتبار ثابت کرنے کے لیے بات بات پر قسم کھاتا ہے۔

﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴﴾ ''حالانکہ فی الواقع وہ شدید ترین دشمن ہے۔''

آیت ۲۰۵ ﴿وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ﴾ ''اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو زمین میں بھاگ دوڑ کرتا ہے''

﴿لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ﴾ ''تاکہ اس میں فساد مچائے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کرے۔''

یہ لوگ جب آپ ؐ کے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد مچائیں اور لوگوں کی کھیتیاں اور جانیں تباہ و برباد کریں۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کو فساد بالکل پسند نہیں ہے۔''

آیت ۲۰۶ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ ''اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو جھوٹی عزتِ نفس اس کو گناہ پر اور جما دیتی ہے''

جب ایسے شخص سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کا خوف کرو، اللہ سے ڈرو، تم باتیں ایسی خوبصورت کرتے ہو اور عمل تمہارا اتنا گھناؤنا ہے، ذرا سوچو تو سہی، تو اُس کو اپنی جھوٹی اَنا اور عزتِ نفس گناہ پر اور جما دیتی ہے۔ ایک شخص وہ ہوتا ہے جس سے خطا ہو گئی تو اُس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور اپنی اصلاح کر لی۔ جبکہ ایک شخص وہ ہے جس کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ میں کیسے مان لوں کہ میری غلطی ہے؟ اس کی جھوٹی اَنا اور جھوٹی عزتِ نفس اسے گناہ سے ہٹنے نہیں دیتی بلکہ مزید آمادہ کرتی ہے۔

﴿فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ﴾ ''سو اُس کے لیے جہنم کافی ہے۔''

﴿وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۲۰۶﴾ ''اور یقیناً وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔''

روایات میں آتا ہے کہ منافقین مدینہ میں ایک شخص اخنس بن شریق تھا، یہ اُس کا کردار بیان ہوا ہے۔ شانِ نزول کے اعتبار سے یہ بات ٹھیک ہے اور تاویل خاص میں اس کو بھی سامنے رکھا جائے گا، لیکن درحقیقت یہ ایک کردار ہے جو آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ اصل میں اس کردار کو پہچاننا چاہیے اور اس کے حوالے سے اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرنی چاہیے کہ اس کردار سے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

آیت ۲۰۷ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے جو بیچ دیتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا کے لیے۔''

قرآن کا یہ عام اسلوب ہے کہ کرداروں کا فوری تقابل (simultaneous contrast) کرتا ہے۔ چنانچہ ایک ناپسندیدہ کردار کے ذکر کے فوراً بعد پسندیدہ کردار کا ذکر کیا گیا کہ لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو اپنے آپ کو اللہ کی رضا جوئی کے لیے تج دیتے ہیں اور اپنا تن من دھن قربان کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ﴿اِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷﴾ ''اور اللہ اپنے ایسے بندوں کے حق میں بہت شفیق ہے۔''

جس شخص نے اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنا سب کچھ تج دینے کا ارادہ کر لیا ہو، نیت کر لی ہو، اُس سے بھی کبھی کوئی کوتاہی ہو سکتی ہے، کبھی جذبات میں آ کر کوئی غلط قدم اٹھ سکتا ہے۔ اپنے ایسے بندوں کو اللہ تعالیٰ بڑی شفقت اور مہربانی کے ساتھ معاف فرمائے گا۔

آیت ۲۰۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۠﴾ ''اے اہل ایمان! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے۔''

اہل ایمان سے اب وہ بات کہی جا رہی ہے جس کا معکوس (converse) ہم بنی اسرائیل سے خطاب کے ذیل میں (آیت ۸۵ میں) پڑھ چکے ہیں:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْىٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾

''کیا تم ہماری کتاب (اور دین و شریعت) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو رد کر دیتے ہو؟ سو جو کوئی بھی تم میں سے یہ روش اختیار کریں ان کی کوئی سزا اس کے سوا نہیں ہے کہ دنیا میں ذلت و خواری ان پر مسلط کر دی جائے اور قیامت کے دن ان کو شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔''

اب مثبت پیرائے میں مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ کی اطاعت میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ — تحفظات (reservations) اور استثناءات (exceptions) کے ساتھ نہیں۔ یہ طرزِ عمل نہ ہو کہ اللہ کی بندگی تو کرنی ہے، مگر فلاں معاملے میں نہیں۔ اللہ کا حکم تو ماننا ہے لیکن یہ حکم میں نہیں مان سکتا۔ اللہ کے احکام میں سے کسی ایک کی نفی سے کل کی نفی ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ جزوی اطاعت قبول نہیں کرتا۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ﴾ ''اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔''

﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۰۸﴾ ''وہ تو یقیناً تمہارا بڑا کھلا دشمن ہے۔''

آیت ۲۰۹ ﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ ''پھر اگر تم پھسل گئے اس کے بعد بھی کہ تمہارے پاس یہ واضح تعلیمات آ چکی ہیں''

﴿فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۰۹﴾ ''تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

اس میں تہدید اور دھمکی کا پہلو ہے کہ پھر اللہ کی پکڑ بھی بہت سخت ہوگی۔ اور پھر یہ کہ وہ حکیم بھی ہے، اس کی پکڑ میں بھی حکمت ہے، اگر اس کی طرف سے پکڑ کا معاملہ نہ ہو تو پھر دین کا پورا نظام بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے کسی گناہ پر پکڑ ہی نہیں ہے تو پھر یہ آزمائش کیا ہوئی؟ پھر جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا معاملہ کیا ہوا؟

آیت ۲۱۰ ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ﴾ ''کیا یہ اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ آ جائے ان پر اللہ تعالیٰ بادلوں کے سائبانوں میں اور فرشتے اور فیصلہ چکا دیا جائے؟''

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح احکامات اور تنبیہات آ جانے کے بعد بھی کج روی سے باز نہیں آتے تو کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنا جلال دکھائے اور فرشتوں کی افواجِ قاہرہ کے ساتھ ظاہر ہو کر ان کا حساب چکا دے؟

انسان کا نفس اسے ایک تو یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ دین کے اس حصے پر تو آرام سے عمل کرتے رہو جو آسان ہے' باقی پھر دیکھا جائے گا۔ گویا ''میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو''۔ دوسری پٹی یہ پڑھاتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ بھی اللہ کا حکم ہے اور دین کا بھی تقاضا ہے' لیکن ابھی ذرا ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائیں' ابھی ذرا بچوں کے معاملات ہیں' بچے برسرِ روزگار ہو جائیں' بچیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں' میں ریٹائرمنٹ لے لوں اور اپنا مکان بنا لوں' پھر میں اپنے آپ کو دین کے لیے خالص کر لوں گا۔ یہ نفس کا سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ اس طرح وقت گزرتے گزرتے انسان موت کی وادی میں چلا جاتا ہے۔ کیا معلوم موت کی گھڑی کب آ جائے! یہ مہلتِ عمر تو اچانک ختم ہو سکتی ہے۔ پوری دنیا کی قیامت بھی جب آئے گی اچانک آئے گی اور ہر شخص کی ذاتی قیامت تو اس کے سر پر تلوار کی طرح لٹکی ہوئی ہے۔ ازروئے حدیثِ نبویؐ:

((مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ)) (۲۵)

''جو مر گیا تو اس کی قیامت تو آ گئی!''

تو کیا تمہارے پاس کوئی گارنٹی ہے کہ یہ سارے کام کر لو گے اور یہ سارے کام کر چکنے کے بعد زندہ رہو گے اور تمہارے جسم میں توانائی کی کوئی رمق بھی باقی رہ جائے گی کہ دین کا کوئی کام کر سکو؟ تو پھر تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ ہو سکتا ہے اچانک اللہ کی طرف سے مہلت ختم ہو جائے۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾﴾ ''اور یقیناً تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔''

آیات ۲۱۱ تا ۲۱۶

﴿سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۖ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾﴾

آیت ۲۱۱ ﴿سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ﴾ ''پوچھ لو بنی اسرائیل سے' ہم نے انہیں کتنی روشن نشانیاں دیں۔''

یعنی اے مسلمانو! دیکھو کہیں تم بھی ان ہی کے راستے پر نہ چلنا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے آگاہ فرمایا تھا:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ' حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ))

قُلْنَا : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ : ((فَمَنْ؟)) (۲۶)

''تم لازماً اپنے سے پہلوں کے طور طریقوں کی پیروی کرو گے' بالشت کے مقابلے میں بالشت اور ہاتھ کے مقابلے میں ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی گھس کر رہو گے''۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہود و نصاریٰ کی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو اور کس کی؟''

﴿وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾﴾ ''اور جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت کو' بعد اس کے کہ وہ اس کے پاس آ گئی ہو تو (وہ جان لے کہ) اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے۔''

جو کوئی اللہ کی نعمت کو پانے کے بعد اس میں تبدیلی کرتا ہے' یا اس میں تحریف کرتا ہے یا خود غلط روش اختیار کرتا ہے تو اس کو جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس طرزِ عمل پر بہت سخت سزا دیتا ہے۔ بنی اسرائیل ہی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ قرآن حکیم میں ان سے دو مرتبہ فرمایا گیا: ﴿يٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾﴾ (البقرۃ) ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت عطا کی تمام اہلِ عالم پر''۔ لیکن پھر ان ہی کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۶۱) ''اور اُن پر ذلت و خواری اور محتاجی و کم ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے''۔ اور یہ مضمون بھی سورۂ آلِ عمران میں دوبارہ آئے گا۔

آیت ۲۱۲ ﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ ''ان کافروں کے لیے دنیا کی زندگی بڑی مزین کر دی گئی ہے''

یہاں کی چمک دمک اور شان و شوکت ان کے لیے بڑی محبوب و دل پسند بنا دی گئی ہے۔ ویسے تو نئے ماڈل کی لمبی لمبی چمکیلی کاریں' اونچی اونچی عمارتیں اور وسیع و عریض کوٹھیاں کس کو اچھی نہیں لگتیں' لیکن کفار کے دلوں میں مال و اسبابِ دُنیوی کی محبت اتنی گھر کر جاتی ہے کہ پھر کوئی اچھی بات ان کی زندگی میں نہیں رہتی' اور نہ ہی کوئی اچھی بات ان کے اوپر اثر کرتی ہے۔ اہل ایمان کو بھی اگر ایمان کے ساتھ یہ نعمتیں ملیں تو یہ مستحسن ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط﴾ (الاعراف: ۳۲) ''(اے نبیؐ! ان سے) کہیے' کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں؟'' اچھا کھانا' اچھا پینا' اچھا پہننا حرام نہیں ہے۔ اللہ نے اس کو لوگوں کے لیے ممنوع نہیں کیا۔ ایک مسلمان دین کے تقاضے ادا کر کے' اللہ کا حق ادا کر کے اور حلال سے کما کر ان چیزوں کو حاصل کرے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ حدیث بھی ذہن میں لے آیئے: ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ)) [۲۷] ''دنیا مؤمن کے لیے ایک قید خانہ اور کافر کے لیے باغ ہے۔''

﴿وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ﴾ ''اور وہ مذاق اڑاتے ہیں اہل ایمان کا۔''

ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں کہ ذرا ان پاگلوں کو' ان بے وقوفوں کو' ان fanatics کو دیکھو' جنہیں اپنے نفع و نقصان کا کچھ ہوش نہیں ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط﴾ ''اور جن لوگوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی تھی قیامت کے دن وہ ان کے اوپر ہوں گے۔''

وہ ان کافروں کے مقابلے میں عالی مرتبت اور عالی مقام ہوں گے' بلکہ سورۃ المُطفّفین میں تو یہاں تک آیا ہے کہ جنت میں جانے کے بعد اہل ایمان کفار کا مذاق اڑائیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۲۱۲﴾ ''اور اللہ تعالیٰ رزق عطا فرمائے گا جس کو چاہے گا بے حساب۔''

یہ جنت کی طرف اشارہ ہے۔ اب پھر ایک طویل آیت آ رہی ہے جس میں ایک اہم مضمون بیان ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ البقرۃ میں جا بجا علم و حکمت اور معرفتِ الٰہی کے بڑے حسین اور خوش نما پھول آئے ہیں جو اس بُنتی میں بُن دیے گئے ہیں۔ دو لڑیاں شریعت کی ہیں' یعنی عبادات اور معاملات' جبکہ دو لڑیاں جہاد کی' یعنی جہاد بالمال (انفاق) اور جہاد بالنفس (قتال)' اور ان کے درمیان یہ عظیم پھول آ جاتے ہیں۔ اس آیت کو میں نے ''آیت الاختلاف'' کا عنوان دیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کے درمیان اختلاف کیوں ہوتا رہا ہے' اور یہ بہت اہم مضمون ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں وحدتِ ادیان کا جو فلسفہ کچھ لوگوں کی طرف سے پیش ہوتا ہے اس کا ایک حصہ صحیح ہے اور ایک حصہ غلط ہے۔ صحیح کون سا ہے اور غلط کون سا ہے' وہ اس آیت سے معلوم ہوگا۔

آیت ۲۱۳ ﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف﴾ ''تمام انسان ایک ہی اُمت تھے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں سب کے سب انسان ایک ہی اُمت تھے۔ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور حضرت آدمؑ نبی ہیں۔ چنانچہ اُمت تو ایک ہی تھی۔ جب تک ان میں گمراہی پیدا نہیں ہوئی' اختلافات پیدا نہیں ہوئے' شیطان نے کچھ لوگوں کو نہیں ورغلایا' اُس وقت تک تو تمام انسان ایک ہی اُمت تھے۔ اب یہاں پر ایک لفظ محذوف ہے: ''ثُمَّ اخْتَلَفُوْا'' (پھر ان میں اختلافات ہوئے)۔ اختلاف کے نتیجے میں فساد پیدا ہوا اور کچھ لوگوں نے گمراہی کی روش اختیار کر لی۔ آدمؑ کا ایک بیٹا اگر ہابیل تھا تو دوسرا قابیل بھی تھا۔

﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص﴾ ''تو اللہ نے (اپنے) نبی بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے۔''

اللہ تعالیٰ نے انبیاءِ کرام علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا جو نیکوکاروں کو بشارت دیتے تھے اور غلط کاروں کو خبردار کرتے تھے۔

﴿وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط﴾ ''اور ان کے ساتھ (اپنی) کتاب نازل فرمائی حق کے ساتھ' تاکہ وہ فیصلہ کر دے لوگوں کے مابین ان امور میں جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔''

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ج﴾ ''اور کتاب میں اختلاف نہیں کیا مگر ان ہی لوگوں نے جنہیں یہ دی گئی تھی' اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن ہدایات آ چکی تھیں' محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے۔''

''بَغْيًا'' کا لفظ قبل ازیں آیت ۹۰ میں آ چکا ہے۔ وہاں میں نے وضاحت کی تھی کہ دین میں اختلاف کا اصل سبب یہی ضدم ضدا والا رویّہ ہوتا ہے۔ انسان میں غالب ہونے کی جو طلب اور اُمنگ (The urge to dominate) موجود ہے وہ حق کو قبول کرنے میں مزاحم ہو جاتی ہے۔ دوسرے کی بات ماننا نفسِ انسانی پر بہت گراں گزرتا ہے۔ آدمی کہتا ہے میں اس کی بات کیوں مانوں' یہ میری کیوں نہ مانے؟ انسان کے اندر جہاں اچھے میلانات رکھے گئے ہیں وہاں بُری اُمنگیں اور میلانات بھی رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ انسان کے باطن میں حق و باطل کی ایک کشاکش چلتی ہے۔ اسی طرح کی کشاکش خارج میں بھی چلتی ہے۔ تو فرمایا کہ جب انسانوں میں اختلافات رونما ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو بھیجا جو مُبشّر اور منذِر بن کر آئے۔

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ط﴾ ''پس اللہ نے ہدایت بخشی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اُس حق کے معاملے میں جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا' اپنے حکم سے۔''

﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۱۳﴾ ''اور اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف۔''

سلسلۂ انبیاء و رُسل کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان ﷺ پر قرآن حکیم نازل فرما کر' اپنی توفیق سے' اس نزاع و

اختلاف میں حق کی راہ اہل ایمان پر کھولی ہے۔ اور اللہ ہی ہے جو اپنی مشیّت اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق جس کو چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔

اب بڑی سخت آیت آ رہی ہے، جو بڑی لرزا دینے والی آیت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک بڑی تعداد مہاجرین کی تھی جو مکہ کی سختیاں جھیل کر آئے تھے۔ ان کے لیے تو اب جو بھی مراحل آئندہ آنے والے تھے وہ بھی کوئی ایسے مشکل نہیں تھے۔ لیکن جو حضرات مدینہ منورہ میں ایمان لائے تھے، یعنی انصار، اُن کے لیے تو یہ نئی بات تھی۔ اس لیے کہ انہوں نے تو وہ سختیاں نہیں جھیلی تھیں جو مکہ میں مہاجرین نے جھیلی تھیں۔ تو اب روئے سخن خاص طور پر ان سے ہے، اگرچہ خطاب عام ہے۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب عام طور پر ملتا ہے کہ الفاظ عام ہیں، لیکن روئے سخن کسی خاص طبقہ کی طرف ہے۔ تو درحقیقت یہاں انصار کو بتایا جا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا پھولوں کی سیج نہیں ہے۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ ”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے“

﴿وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ﴾ ”حالانکہ ابھی تک تمہارے اوپر وہ حالات و واقعات وارد نہیں ہوئے جو تم سے پہلوں پر ہوئے تھے۔“

﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا﴾ ”پہنچی ان کو سختی بھوک کی اور تکلیف اور وہ ہلا مارے گئے“

﴿حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ﴾ ”یہاں تک کہ (وقت کا) رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟“

﴿اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾ ”(اب انہیں یہ خوشخبری دی گئی کہ) آگاہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔“

یعنی اللہ تو اہل ایمان کو آزماتا ہے، اسے کھوٹے اور کھرے کو الگ کرنا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو اس سے پہلے انیسویں رکوع کے بالکل آغاز میں آ چکی ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (آیت ۱۵۵) ”اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مال و جان اور ثمرات کے نقصان سے“۔ یہ کوئی پھولوں بھرا راستہ نہیں ہے، پھولوں کی سیج نہیں ہے، حق کا راستہ کانٹوں بھرا راستہ ہے، اس کے لیے ذہناً تیار ہو جاؤ۔ ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے   شرطِ اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی!

اور: ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے   لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اس راستے میں اللہ کی مدد ضرور آتی ہے، لیکن آزمائشوں اور قربانیوں کے بعد۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پھر سورۃ الصّف میں فتح و نصرت کی خوشخبری سنائی گئی، جبکہ غزوۂ احزاب واقع ہو چکا تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان رضی اللہ عنہم شدید ترین امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر چکے تھے۔ تب انہیں بایں الفاظ خوشخبری دی گئی: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ﴾ (آیت ۱۳) ”اور جو دوسری چیز تمہیں پسند ہے (وہ بھی تمہیں ملے گی) اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح“۔ ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ”اور (اے نبیؐ!) اہل ایمان کو بشارت دے دیجیے!“ اپنے اہل ایمان ساتھیوں کو بشارت دے دیجیے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اللہ کی نصرت کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

آیت ۲۱۵ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ﴾ ”یہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟“

یعنی انفاق کے لیے جو کہا جا رہا ہے تو ہم کیا خرچ کریں؟ کتنا خرچ کریں؟ انسان بھلائی کے لیے جو بھی خرچ کرے تو اس میں سب سے پہلا حق کن کا ہے؟

﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ ”کہہ دیجیے جو بھی تم خرچ کرو مال و اسباب میں سے“

﴿فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ﴾ ”تو والدین، رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے (خرچ کرو)۔“

سب سے پہلا حق والدین کا ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾﴾ ”اور جو خیر بھی تم کماؤ گے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔“

تم جو بھی اچھا کام کرو گے تو جان لو کہ وہ اللہ کے علم میں ہے۔ ضرورت نہیں ہے کہ دنیا اس سے واقف ہو، تمہیں اگر اللہ سے اجر لینا ہے تو وہ تو رات کے اندھیرے میں بھی دیکھ رہا ہے۔ اگر تمہارے دائیں ہاتھ نے دیا ہے اور بائیں کو پتا نہیں چلا تو اللہ کو تو پھر بھی پتا چل گیا ہے۔ تو تم خاطر جمع رکھو، تمہاری ہر نیکی اللہ کے علم میں ہے اور وہ اسے ضائع نہیں کرے گا۔

اب اگلی آیت میں قتال کے مضمون کا تسلسل ہے۔ میں نے سورۃ البقرۃ کے نصفِ آخر کے مضامین کو چار مختلف رنگوں کی لڑیوں سے تشبیہ دی تھی، جن کو باہم بٹ لیا جائے تو چاروں رنگ کٹے پھٹے نظر آتے ہیں اور اگر انہیں کھول دیا جائے تو ہر رنگ مسلسل نظر آتا ہے۔

آیت ۲۱۶ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ﴾ ”(مسلمانو!) اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے اور وہ تمہیں گراں گزر رہی ہے۔“

واضح رہے کہ سورۃ البقرۃ سے پہلے سورۂ محمد ﷺ نازل ہو چکی تھی اور اُس میں قتال کی فرضیّت آ چکی تھی۔ (چنانچہ اُس کا ایک نام سورۃ القتال بھی ہے۔) لہٰذا اس حوالے سے کچھ لوگ پریشان ہو رہے تھے۔ خاص طور پر منافقین یہ کہتے تھے کہ بھائی صلح جوئی سے کام لو، بس دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف لاؤ، یہ جنگ و جدال اور لڑائی بھڑائی تو کوئی اچھا کام نہیں ہے، اس میں تو بہت خرابی ہے۔ ان کے علاوہ ایسے مسلمان جن کا ایمان قدرے کمزور تھا، اگرچہ وہ منافق تو نہیں تھے، لیکن ان کا ایمان ابھی پختہ نہیں تھا، ابھی تازہ تازہ ایمان لائے تھے اور تربیت کے مراحل سے ابھی نہیں گزرے تھے، ان میں سے بھی بعض لوگوں کے دلوں میں انقباض پیدا ہو رہا تھا۔ یہاں قتال کی فرضیّت کے لیے ”کُتِبَ“ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ روزے، قصاص اور وصیت کے ضمن میں آ چکا ہے۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ ...... ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى﴾ ...... ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚ الْوَصِيَّةُ﴾ ...... فرمایا کہ تم پر جنگ فرض کر

دی گئی ہے اور وہ تمہیں بُری لگ رہی ہے۔

﴿وَعَسٰٓی اَنۡ تَکۡرَهُوۡا شَیۡئًا وَّهُوَخَیۡرٌ لَّـكُمۡ ۚ﴾ ''اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔''

﴿وَعَسٰٓی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡ ؕ﴾ ''اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بُری ہو۔''

﴿وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾﴾ ''اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

تم اپنی عقل پر ایمان نہ رکھو' اللہ کی وحی پر ایمان رکھو' اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان رکھو۔ جس وقت کے لیے جو حکم موزوں تھا وہی تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے دیا گیا۔ چودہ برس تک تمہیں قتال سے منع کیا گیا۔ اُس وقت تمہارے لیے حکم تھا: ''كُفُّوۡا اَيۡدِيَكُمۡ '' (اپنے ہاتھ روکے رکھو!) اب تم پر قتال فرض کیا جا رہا ہے' لٰہذا اب اس حکم پر سرِ تسلیم خم کرنا تمہارے لیے لازم ہے۔

آیات ۲۱۷ تا ۲۲۱

﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الشَّهۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِیۡهِ ؕ قُلۡ قِتَالٌ فِیۡهِ كَبِیۡرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَكُفۡرٌۢ بِهٖ
وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ٭ وَاِخۡرَاجُ اَهۡلِهٖ مِنۡهُ اَكۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۚ وَالۡفِتۡنَةُ اَكۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ ؕ وَلَا یَزَالُوۡنَ
یُقَاتِلُوۡنَكُمۡ حَتّٰی یَرُدُّوۡكُمۡ عَنۡ دِیۡنِكُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا ؕ وَمَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِیۡنِهٖ فَیَمُتۡ وَهُوَ كَافِرٌ
فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ
رَّحِیۡمٌ ﴿۲۱۸﴾ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ ؕ قُلۡ فِیۡهِمَآ اِثۡمٌ كَبِیۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ
نَّفۡعِهِمَا ؕ وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ كَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّكُمۡ
تَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۱۹﴾ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ ؕ وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡیَتٰمٰی ؕ قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَیۡرٌ ؕ وَاِنۡ
تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعۡنَتَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیۡزٌ
حَكِیۡمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰی یُؤۡمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ وَلَا
تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِیۡنَ حَتّٰی یُؤۡمِنُوۡا ؕ وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِکٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ
یَدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ۚ وَاللّٰهُ یَدۡعُوۡٓا اِلَی الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ وَیُبَیِّنُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ
یَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾﴾

آیت ۲۱۷ ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الشَّهۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِیۡهِ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں حرمت والے مہینے میں جنگ کے بارے میں۔''

قتال کا حکم آنے کے بعد اب وہ پوچھتے تھے کہ یہ جو حرمت والے مہینے ہیں ان میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ اس لیے کہ سیرت میں یہ واقعہ آتا ہے کہ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو چند افراد کے دستے کا کمانڈر بنا کر ہدایت فرمائی تھی کہ مکہ اور طائف کے درمیان جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کریں اور قریش کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ وادیٔ نخلہ میں قیام کے دوران وہاں قریش کے ایک مختصر سے قافلے کے ساتھ مڈبھیڑ ہوگئی اور مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ اُس روز رجب کی آخری تاریخ تھی اور رجب کا مہینہ اشہر حرم میں سے ہے۔ یہ ہجرت کے بعد پہلا خون تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ اس پر مشرکین نے بہت واویلا کیا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے' بنے پھرتے ہیں اللہ والے' رسول والے' دین والے' آخرت والے اور انہوں نے حرمت والے مہینے کو بٹہ لگا دیا' اس میں جنگ کی۔ تو یہ دراصل اللہ تعالیٰ اپنے ان مؤمن بندوں کی طرف سے گویا خود صفائی پیش کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ حرمت والے مہینوں میں قتال کا کیا حکم ہے؟

﴿قُلۡ قِتَالٌ فِیۡهِ كَبِیۡرٌ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے کہ اس میں جنگ کرنا بہت بڑی (گناہ کی) بات ہے۔''

﴿وَصَدٌّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَكُفۡرٌۢ بِهٖ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ٭ وَاِخۡرَاجُ اَهۡلِهٖ مِنۡهُ اَكۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۚ﴾ ''لیکن اللہ کے راستے سے روکنا' اس کا کفر کرنا' مسجد حرام سے روکنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے کہیں بڑا گناہ ہے۔''

یہ وہ سنگین جرائم ہیں جن کا ارتکاب مشرکین مکہ کی جانب سے ہو رہا تھا۔ یہاں فرمایا گیا کہ یہ سب کام اشہر حرم میں جنگ کرنے سے بھی بڑے جرائم ہیں۔ لٰہذا ان کے سدباب کے لیے اگر اشہر حرم میں جنگ کرنی پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں۔

﴿وَالۡفِتۡنَةُ اَكۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ ؕ﴾ ''اور فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔''

قبل ازیں آیت ۱۹۱ میں الفاظ آ چکے ہیں: ﴿وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ﴾ فتنہ ہر وہ کیفیت ہے جس میں صاحبِ ایمان کے لیے ایمان پر قائم رہنا اور اسلام پر عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ آج کا پورا معاشرہ فتنہ ہے۔ اسلام پر عمل کرنا مشکل ہے' بدمعاشی اور حرام خوری کے راستے کھلے ہوئے ہیں' اکلِ حلال اس قدر مشکل بنا دیا گیا ہے کہ دانتوں پسینہ آئے تو شاید نصیب ہو۔ نکاح اور شادی کے جائز راستوں پر بڑی بڑی شرطیں اور قدغنیں عائد ہیں' جبکہ ناجائز مراسم اور زنا کے راستے کھلے ہیں۔ جس معاشرے کے اندر باطل کا غلبہ ہو جائے اور حق پر چلنا ممکن نہ رہے وہ بڑے فتنے میں مبتلا ہے۔ باطل کا غلبہ سب سے بڑا

فتنہ ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ فتنہ قتل کے مقابلے میں بہت بڑی شے ہے۔

﴿وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ط﴾ ”اور یہ لوگ تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹا دیں تمہیں اپنے دین سے اگر وہ ایسا کر سکتے ہوں۔“

وہ تو اس پر تُلے ہوئے ہیں کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔ یہاں مشرکین مکہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے‘ کیونکہ اب یہ غزوۂ بدر کی تمہید چل رہی ہے۔ اس کے بعد غزوۂ بدر ہونے والا ہے‘ اس کے لیے اہل ایمان کو ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا ہے اور انہیں آگاہ کیا جا رہا ہے کہ مشرکین کی جنگ کا مقصد تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کرنا ہے‘ وہ تو اپنی بھرپور کوشش کرتے رہیں گے کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے لوٹا کر واپس لے جائیں۔

﴿وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ﴾ ”اور (سن لو) جو کوئی بھی تم میں سے اپنے دین سے پھر گیا“

﴿فَیَمُتْ وَهُوَ کَافِرٌ﴾ ”اور اُسی حالت میں اس کی موت آ گئی کہ وہ کافر ہی تھا“

﴿فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ج﴾ ”تو یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت جائیں گے۔“

پہلے خواہ کتنی ہی نیکیاں کی ہوئی تھیں‘ کتنی ہی نمازیں پڑھی ہوئی تھیں‘ کتنا ہی انفاق کیا ہوا تھا‘ صدقات دیے تھے‘ جو کچھ بھی کیا تھا سب کا سب صفر ہو جائے گا۔

﴿وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾﴾ ”اور وہ ہوں گے جہنم والے‘ وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔“

آیت ۲۱۸ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لا اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ط﴾ ”(اس کے برعکس) جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں تو یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔“

یہاں اُن لوگوں پر بڑا لطیف طنز ہے جو خود تو حرام کے راستے پر جا رہے ہیں‘ لیکن یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان پر رحم فرمائے گا۔ اللہ ایسی روش اختیار کرنے والوں پر رحمت نہیں فرماتا‘ اللہ کی رحمت کا مستحق بننا پڑتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت کا مستحق وہی ہے جو ایمان‘ ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ایسے لوگ بجا طور پر اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۱۸﴾﴾ ”اور اللہ تعالیٰ غفور ہے‘ رحیم ہے۔“

وہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے۔

آیت ۲۱۹ ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ط﴾ ”(اے نبیؐ!) یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ ان کا کیا حکم ہے؟)۔“

ان احکام سے شریعت کا ابتدائی خاکہ (blue print) تیار ہونا شروع ہو گیا ہے‘ کچھ احکام پہلے آ چکے ہیں اور کچھ اب آ رہے ہیں۔ شراب اور جوئے کے بارے میں یہاں ابتدائی حکم بیان ہوا ہے اور اس پر محض اظہارِ ناراضگی فرمایا گیا ہے۔

﴿قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ﴾ ”(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ ان دونوں کے اندر بہت بڑے گناہ کے پہلو ہیں“

﴿وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز﴾ ”اور لوگوں کے لیے کچھ منفعتیں بھی ہیں“

﴿وَاِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ط﴾ ”البتہ ان کا گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے بڑا ہے۔“

یعنی اشارہ کر دیا گیا کہ ان کو چھوڑ دو۔ اب معاملہ تمہاری عقلِ سلیم کے حوالے ہے‘ حقیقت تم پر کھول دی گئی ہے۔ یہ ابتدائی حکم ہے‘ لیکن حکم کے پیرائے میں نہیں۔ بس واضح کر دیا گیا کہ ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے‘ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ بقول غالب: ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو؟ اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے!

اور: ؎

میں میکدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا!

یہ حکمت سمجھ لیجیے کہ شراب اور جوئے میں کیا چیز مشترک ہے کہ یہاں دونوں کو جمع کیا گیا؟ شراب کے نشے میں بھی انسان اپنے آپ کو حقائق سے منقطع کرتا ہے اور محنت سے جی چراتا ہے۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق کا مواجہہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ع ”اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے!“ —— اور جوئے کی بنیاد بھی محنت کی نفی پر ہے۔ ایک رویّہ تو یہ ہے کہ محنت سے ایک آدمی کما رہا ہے‘ مشقت کر رہا ہے‘ کوئی کھوکھا‘ چھابڑی یا ریڑھی لگا کر کچھ کمائی کر رہا ہے‘ جبکہ ایک ہے چانس اور داؤ کی بنیاد پر پیسے کمانا۔ یہ محنت کی نفی ہے۔ چنانچہ شراب اور جوئے کے اندر اصل میں علت ایک ہی ہے۔

﴿وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط﴾ ”اور یہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں؟“

آیت ۱۹۵ میں انفاق کا حکم بایں الفاظ آ چکا ہے: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ ج﴾ ”اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ جھونکو“۔ تو سوال کیا گیا کہ ”کتنا خرچ کریں؟“ ہمیں کچھ مقدار بھی بتا دی جائے۔ فرمایا:

﴿قُلِ الْعَفْوَ ط﴾ ”کہہ دیجیے: جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔“

اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ تم اپنی ضرورتوں کو پیچھے ڈال دو‘ بلکہ تم پہلے اپنی ضرورتیں پوری کرو‘ پھر جو تمہارے پاس بچ جائے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ کمیونزم کے فلسفہ میں ایک اصطلاح ”قدرِ زائد“ (surplus value) استعمال ہوتی ہے۔ یہ ہے ”اَلْعَفْوَ“۔ جو بھی تمہاری ضروریات سے زائد ہے یہ surplus value ہے‘ اسے اللہ کی راہ میں دے دو۔ اس کو بچا کر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ پر بے اعتمادی کا اظہار کر رہے ہیں کہ اللہ نے آج تو دے دیا ہے‘ کل نہیں دے گا۔ لیکن یہ کہ انسان کی ضرورتیں کیا ہیں‘ کتنی ہیں‘ اس کا اللہ نے کوئی پیمانہ مقرر نہیں کیا۔ اس کا تعلق باطنی روح سے ہے۔ ایک مسلمان کے اندر اللہ کی محبت اور آخرت پر ایمان جوں جوں بڑھتا جائے گا اتنا ہی وہ اپنی ضرورتیں کم کرے گا‘ اپنے معیارِ زندگی

کو پست کرے گا اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں دے گا۔ اصول یہ ہے کہ ہر شخص یہ دیکھے کہ جو میری ضرورت سے زائد ہے اسے میں بچا بچا کر نہ رکھوں' بلکہ اللہ کی راہ میں دے دوں۔ انفاق فی سبیل اللہ پر اس سورۂ مبارکہ میں پورے دو رکوع آگے آنے والے ہیں۔

﴿کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾﴾ ''اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لیے واضح کر رہا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔''

آیت ۲۲۰ ﴿فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ؕ﴾ ''دنیا اور آخرت (کے معاملات) میں۔''

تمہارا یہ غور و فکر دنیا کے بارے میں بھی ہونا چاہیے اور آخرت کے بارے میں بھی۔ دنیا میں بھی اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ نہ کھاؤ' نہ پیو' چلے کشی کرو' جنگلوں میں نکل جاؤ! نہیں' اسلام تو متمدن زندگی کی تعلیم دیتا ہے' گھر گرہستی اور شادی بیاہ کی ترغیب دیتا ہے' بیوی بچوں کے حقوق بتاتا ہے اور ان کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہیں آخرت کی بھی فکر کرنی چاہیے' اور دنیا و آخرت کے معاملات میں ایک نسبت و تناسب (ratio proportion) قائم رہنا چاہیے۔ دنیا کی کتنی قدر و قیمت ہے اور اس کے مقابلے میں آخرت کی کتنی قدر و قیمت ہے' اس کا صحیح طور پر اندازہ کرنا چاہیے۔ اگر یہ اندازہ غلط ہو گیا اور کوئی غلط تناسب قائم کر لیا گیا تو ہر چیز تلپٹ ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر ایک دوا کے نسخے میں کوئی چیز کم تھی' کوئی زیادہ تھی۔ اگر آپ نے جو چیز کم تھی اسے زیادہ کر دیا اور جو زیادہ تھی اسے کم کر دیا تو اب ہو سکتا ہے یہ نسخہ شفا نہ رہے' نسخۂ ہلاکت بن جائے۔

﴿وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ﴾ ''اور یہ آپؐ سے پوچھ رہے ہیں یتیموں کے بارے میں۔''

﴿قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَیْرٌ ؕ﴾ ''(اے نبیﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ (جس طرزِ عمل میں) ان کی بھلائی اور مصلحت (ہو وہی اختیار کرنا) بہتر ہے۔''

ان کی مصلحت کو پیشِ نظر رکھنا بہتر ہے' نیکی ہے' بھلائی ہے۔ اصل میں لوگوں کے سامنے سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت تھی:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ﴾ (آیت ۳۴) ''اور مالِ یتیم کے قریب تک نہ پھٹکو' مگر ایسے طریقے پر جو (یتیم کے حق میں) بہتر ہو''۔ چنانچہ وہ مالِ یتیم کے بارے میں انتہائی احتیاط کر رہے تھے اور انہوں نے یتامیٰ کی ہنڈیاں بھی علیحدہ کر دی تھیں کہ مبادا اُن کے حصے کی کوئی بوٹی ہمارے پیٹ میں چلی جائے۔ لیکن اس طرح یتامیٰ کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ تکلیف اور حرج میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کسی کے گھر میں یتیم پرورش پا رہا ہے تو اس کا خرچ الگ طور پر اس کے مال میں سے نکالا جا رہا ہے اور اس کے لیے الگ ہنڈیا پکائی جا رہی ہے۔ فرمایا کہ اُس حکم سے یہ مقصد نہیں تھا' مقصد یہ تھا کہ تم کہیں ان کے مال ہڑپ نہ کر جاؤ' ان کے لیے اصلاح اور بھلائی کا معاملہ کرنا بہتر طرزِ عمل ہے۔

﴿وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُکُمْ ؕ﴾ ''اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملائے رکھو تو وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔''

﴿وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ﴾ ''اور اللہ جانتا ہے مفسد کو بھی اور مصلح کو بھی۔''

وہ جانتا ہے کہ کون بدنیتی سے یتیم کا مال ہڑپ کرنا چاہتا ہے اور کون یتیم کی خیر خواہی چاہتا ہے۔ یہ ہنڈیا علیحدہ کر کے بھی گڑبڑ کر سکتا ہے اور یہ وہ شخص ہے جو ہنڈیا مشترک کر کے بھی حق پر رہ سکتا ہے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَاَعْنَتَکُمْ ؕ﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں سختی ہی میں ڈالے رکھتا۔''

لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں مشقت اور سختی سے بچایا اور تم پر آسانی فرمائی۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۲۰﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

وہ انتہائی مشقت پر مبنی سخت سے سخت حکم بھی دے سکتا ہے' اس لیے کہ وہ زبردست ہے' لیکن وہ انسانوں کو مشقت میں نہیں ڈالتا' بلکہ اس کے ہر حکم کے اندر حکمت ہوتی ہے۔ اور جہاں حکمت نرمی کی متقاضی ہوتی ہے وہاں وہ رعایت دیتا ہے۔

آیت ۲۲۱ ﴿وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ ؕ﴾ ''اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔''

﴿وَلَاَمَۃٌ مُّؤْمِنَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِکَۃٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْکُمْ ۚ﴾ ''اور ایک مؤمنہ لونڈی بہتر ہے ایک آزاد مشرکہ عورت سے اگرچہ وہ تمہیں اچھی بھی لگتی ہو۔''

﴿وَلَا تُنْکِحُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَتّٰی یُؤْمِنُوْا ؕ﴾ ''اور اپنی عورتیں مشرکوں کے نکاح میں مت دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔''

﴿وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِکٍ وَّلَوْ اَعْجَبَکُمْ ؕ﴾ ''اور ایک مؤمن غلام بہتر ہے ایک آزاد مشرک مرد سے اگرچہ وہ تمہیں پسند بھی ہو۔''

خواہ وہ صاحب حیثیت اور مال دار ہو' لیکن دولت ایمان سے محروم ہو تو تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنی بہن یا بیٹی اس کے نکاح میں دے دو۔

﴿اُولٰٓئِکَ یَدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ ۚ﴾ ''یہ لوگ آگ کی طرف بلا رہے ہیں۔''

اگر ان سے رشتے ناتے جوڑو گے تو وہ تمہیں بھی جہنم میں لے جائیں گے اور تمہاری اولاد کو بھی۔

﴿وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّۃِ وَالْمَغْفِرَۃِ بِاِذْنِہٖ ۚ﴾ ''اور اللہ تمہیں بلا رہا ہے جنت کی طرف اور مغفرت کی طرف اپنے حکم سے۔''

﴿وَیُبَیِّنُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾﴾ ''اور وہ اپنی آیات واضح کر رہا ہے لوگوں کے لیے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

آیات ۲۲۲ تا ۲۲۸

﴿وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ ط قُلْ ھُوَ اَذًی لا فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ لا وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰی
یَطْھُرْنَ ج فَاِذَا تَطَھَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ ط اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ ﴿۲۲۲﴾
نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ ص فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ ز وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ
مُّلٰقُوْہُ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ
النَّاسِ ط وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ
قُلُوْبُکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِھِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَۃِ اَشْھُرٍ ج فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰہَ
غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِھِنَّ ثَلٰثَۃَ
قُرُوْٓءٍ ط وَلَا یَحِلُّ لَھُنَّ اَنْ یَّکْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِیْٓ اَرْحَامِھِنَّ اِنْ کُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط
وَبُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ فِیْ ذٰلِکَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ط وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ص
وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَۃٌ ط وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾﴾

آیت ۲۲۲ ﴿وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ ط﴾ ’’اور وہ عورتوں کی ماہواری کے بارے میں آپؐ سے سوال کر رہے ہیں۔‘‘

﴿قُلْ ھُوَ اَذًی لا﴾ ’’کہہ دیجیے وہ ایک ناپاکی بھی ہے اور ایک تکلیف کا مسئلہ بھی ہے‘‘

﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ لا﴾ ’’تو حیض کی حالت میں عورتوں سے علیحدہ رہو‘‘

﴿وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰی یَطْھُرْنَ ج﴾ ’’اور ان سے مقاربت نہ کرو یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔‘‘

﴿فَاِذَا تَطَھَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ ط﴾ ’’پھر جب وہ خوب پاک ہو جائیں تو اب ان کی طرف جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔‘‘

معلوم ہوا کہ بدیہیاتِ فطرت اللہ تعالیٰ کے اوامر میں شامل ہیں۔ عورتوں کے ساتھ مجامعت کا طریقہ انسان کو فطری طور پر معلوم ہے‘ یہ ایک امر طبعی ہے۔ ہر حیوان کو بھی جبلی طور پر معلوم ہے کہ اسے اپنی مادہ کے ساتھ کیسا تعلق قائم کرنا ہے۔ لیکن اگر انسان فطری طریقہ چھوڑ کر غیر فطری طریقہ اختیار کرے اور عورتوں کے ساتھ بھی قوم لوط والا عمل کرنے لگے تو یہ حرام ہے۔ صحیح راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری فطرت میں ڈالا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ ﴿۲۲۲﴾﴾ ’’یقیناً اللہ محبت کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں سے اور محبت کرتا ہے بہت پاکبازی اختیار کرنے والوں سے۔‘‘

ان سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس سے توبہ کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں سے دور رہتے ہیں۔

آیت ۲۲۳ ﴿نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ ص﴾ ’’تمہاری بیویاں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی ہیں۔‘‘

جیسے کھیت میں بیج بوتے ہو‘ پھر فصل کاٹتے ہو‘ اسی طرح بیویوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد عطا کرتا ہے۔

﴿فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ ز﴾ ’’تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ‘‘

تم اپنی کھیتی میں جدھر سے چاہو آؤ‘ تمہارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے‘ آگے سے یا داہنی طرف سے یا بائیں طرف سے‘ جدھر سے بھی چاہو‘ مگر یہ ضرور ہے کہ تخم ریزی اسی خاص جگہ میں ہو جہاں سے پیداوار کی امید ہو سکتی ہے۔

﴿وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ ط﴾ ’’اور اپنے آگے کے لیے سامان کرو۔‘‘

یعنی اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اپنی نسل کو آگے بڑھانے کی کوشش کرو۔ اولاد انسان کا اثاثہ ہوتی ہے اور بڑھاپے میں اس کا سہارا بنتی ہے۔ آج تو الٹی گنگا بہائی جا رہی ہے اور اولاد کم سے کم پیدا کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے‘ جبکہ ایک زمانے میں اولاد عصائے پیری شمار ہوتی تھی۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ مُّلٰقُوْہُ ط﴾ ’’اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ تمہیں اس سے مل کر رہنا ہے۔‘‘

نوٹ کیجیے کہ قرآن حکیم میں شریعت کے ہر حکم کے ساتھ تقویٰ کا ذکر بار بار آ رہا ہے۔ اس لیے کہ کسی قانون کی لاکھ پیروی کی جا رہی ہو مگر تقویٰ نہ ہو تو وہ قانون مذاق بن جائے گا‘ کھیل تماشا بن جائے گا۔ اس کی بعض مثالیں ابھی آئیں گی۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۲۳﴾﴾ ’’اور (اے نبیﷺ!) اہل ایمان کو بشارت دے دیجیے۔‘‘

آیت ۲۲۴ ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ﴾ ’’اور اللہ کے نام کو تختۂ مشق نہ بنا لو اپنی قسموں کے لیے‘‘

﴿اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ ط﴾ ’’کہ بھلائی نہ کرو گے‘ پرہیزگاری نہ کرو گے اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے۔‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کے عظیم نام کو استعمال کرتے ہوئے ایسی قسمیں مت کھاؤ جو نیکی و تقویٰ اور مقصدِ اصلاح کے خلاف ہوں۔ کسی وقت غصے میں آ کر آدمی قسم کھا بیٹھتا ہے کہ میں فلاں شخص سے کبھی حسن سلوک اور بھلائی نہیں کروں گا‘ اس سے روکا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی اسی طرح کی قسم کھالی تھی۔ مسطح ایک غریب مسلمان تھے‘ جو آپؓ کے قرابت دار بھی تھے۔ ان کی آپؓ مدد کیا کرتے تھے۔ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگی تو مسطح بھی اُس آگ کے بھڑکانے والوں میں شامل ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ ان کے طرزِ عمل سے بہت رنجیدہ خاطر ہوئے کہ میں تو اس کی سرپرستی کرتا رہا اور یہ میری بیٹی پر تہمت لگانے والوں میں شامل ہو گیا۔ آپؓ نے قسم کھائی کہ اب میں کبھی اس کی مدد نہیں کروں گا۔ یہ واقعہ سورۃ النور میں آئے گا۔ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم ایسا نہ کرو‘ تم اپنی نیکی کے دروازے کیوں بند کرتے ہو؟ جس نے ایسی قسم کھالی ہے وہ اس

قسم کو کھول دے اور قسم کا کفارہ دے دے۔ اسی طرح لوگوں کے مابین مصالحت کرانا بھی ضروری ہے۔ دو بھائیوں کے درمیان جھگڑا تھا‘ آپ نے مصالحت کی کوشش کی لیکن آپ کی بات نہیں مانی گئی‘ اس پر آپ نے غصے میں آ کر کہہ دیا کہ اللہ کی قسم‘ اب میں ان کے معاملے میں دخل نہیں دوں گا۔ اس طرح کی قسمیں کھانے سے روکا گیا ہے۔ اور اگر کسی نے ایسی کوئی قسم کھائی ہے تو وہ اسے توڑ دے اور اس کا کفارہّ دے دے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾﴾ ’’اور اللہ سننے والا‘ جاننے والا ہے۔‘‘

آیت ۲۲۵ ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ ’’اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرے گا تم سے تمہاری بے معنی قسموں پر (جو تم عزم وارادہ کے بغیر کھا بیٹھتے ہو)‘‘

عربوں کا اندازِ گفتگو اس طرح کا ہے کہ وَاللہ‘ باللہ کے بغیر ان کا کوئی جملہ شروع ہی نہیں ہوتا۔ اس سے درحقیقت ان کی نیت قسم کھانے کی نہیں ہوتی بلکہ یہ ان کا گفتگو کا ایک اسلوب ہے۔ اس طرح کی قسموں پر مؤاخذہ نہیں ہے۔

﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ﴾ ’’لیکن ان قسموں پر تم سے ضرور مؤاخذہ کرے گا جو تم نے اپنے دلی ارادے کے ساتھ کھائی ہوں۔‘‘

ایسی قسموں کو توڑو گے تو کفارہّ دینا ہوگا۔ کفارےّ کا حکم سورۃ المائدۃ میں بیان ہوا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ البقرۃ میں شریعت اسلامی کا ابتدائی خاکہ دے دیا گیا ہے اور اس کے تکمیلی احکام کچھ سورۃ النساء میں اور کچھ سورۃ المائدۃ میں بیان ہوئے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾﴾ ’’اور اللہ بخشنے والا ہے اور حلیم ہے۔‘‘

وہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ وہ فوراً نہیں پکڑتا‘ بلکہ اصلاح کی مہلت دیتا ہے۔

آیت ۲۲۶ ﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ﴾ ’’جو لوگ اپنی بیویوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔‘‘

اگر کوئی مرد کسی وقت ناراض ہو کر یا غصے میں آ کر یہ قسم کھا لے کہ اب میں اپنی بیوی کے قریب نہیں جاؤں گا‘ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا‘ تو یہ ایلاء کہلاتا ہے۔ خود آنحضورﷺ نے بھی اپنی ازواجِ مطہرات سے ایلاء فرمایا تھا۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے عرض کیا تھا کہ اب عام مسلمانوں کے ہاں بھی خوشحالی آ گئی ہے تو ہمارے ہاں یہ تنگی اور سختی کیوں ہے؟ اب ہمارے بھی نفقات بڑھائے جائیں۔ اس پر رسول اللہﷺ نے ان سے ایلاء کیا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ لوگ قسم تو کھا بیٹھتے تھے کہ بیوی کے پاس نہ جائیں گے‘ مگر بعد میں اس پر پچھتاتے تھے کہ کیا کریں۔ اب وہ بیوی بے چاری معلقّ ہو کر رہ جاتی۔ اس آیت میں ایلاء کی مہلت مقرر کر دی گئی کہ زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک انتظار کیا جا سکتا ہے۔

﴿فَاِنْ فَاۗءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾﴾ ’’پس اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا‘ مہربان ہے۔‘‘

ان چار ماہ کے دوران اگر وہ اپنی قسم کو ختم کریں اور رجوع کر لیں‘ تعلق زن و شو قائم کر لیں تو اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

آیت ۲۲۷ ﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾﴾ ’’اور اگر وہ طلاق کا ارادہ کر چکے ہوں تو اللہ سننے والا‘ جاننے والا ہے۔‘‘

یعنی چار ماہ کا عرصہ گزر جانے پر شوہر کو بہرحال فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یا تو رجوع کرے یا طلاق دے۔ اب عورت کو مزید معلق نہیں رکھا جا سکتا۔ رجوع کی صورت میں چونکہ قسم توڑنا ہوگی لہٰذا اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ حکم جاری کیا تھا کہ جو لوگ جہاد کے لیے گھروں سے دور گئے ہوں انہیں چار ماہ بعد لازمی طور پر گھر بھیجا جائے۔ آپؓ نے یہ حکم غالباً اسی آیت سے استنباط کرتے ہوئے جاری فرمایا تھا۔ اس کے لیے آپؓ نے اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے مشاورت بھی فرمائی تھی۔ اگرچہ آپؓ کا حضرت حفصہؓ سے باپ بیٹی کا رشتہ ہے‘ مگر دین کے معاملات میں شرم و حیا آڑے نہیں آتی‘ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الاحزاب:۵۳) ’’اور اللہ شرماتا نہیں حق بات بتلانے میں‘‘۔ آپؓ نے ان سے پوچھا کہ ایک عورت کتنا عرصہ اپنی عفت و عصمت کو سنبھال کر اپنے شوہر کا انتظار کر سکتی ہے؟ حضرت حفصہؓ نے کہا چار ماہ۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے مجاہدین کے بارے میں یہ حکم جاری فرما دیا کہ انہیں چار ماہ سے زیادہ گھروں سے دُور نہ رکھا جائے۔

آیت ۲۲۸ ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْۗءٍ ۭ﴾ ’’اور جن عورتوں کو طلاق دے دی جائے اُن پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔‘‘

طلاق کے بعد عورت کے لیے تین ماہ کی عدت ہے۔ اس عدت میں شوہر چاہے تو رجوع کر سکتا ہے‘ اگر اس نے ایک یا دو طلاقیں دی ہوں۔ البتہ تیسری طلاق کے بعد رجوع کا حق نہیں ہے۔ طلاقِ رجعی کے بعد ابھی اگر عدت ختم ہو جائے تو اب شوہر کا رجوع کا حق ختم ہو جائے گا اور عورت آزاد ہوگی۔ لیکن اس مدت کے اندر وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔

﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ﴾ ’’اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے ارحام میں جو کچھ پیدا کر دیا ہو وہ اسے چھپائیں‘‘

﴿اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ ’’اگر وہ فی الواقع اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔‘‘

تین حیض کی مدت اسی لیے مقرر کی گئی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں۔ اگر عورت حاملہ ہو لیکن وہ اپنا حمل چھپا رہی ہو تاکہ اس کے پیٹ میں پلنے والا اس کا بچہ اس کے پاس ہی رہے‘ تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے۔

﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ﴾ ’’اور ان کے شوہر اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ انہیں لوٹا لیں اس عدت کے دوران میں اگر وہ واقعتہً اصلاح چاہتے ہوں۔‘‘

اسے رجعت کہتے ہیں۔ شوہروں کو حق حاصل ہے کہ وہ عدت کے اندر اندر رجوع کر سکتے ہیں‘ لیکن یہ حق تیسری طلاق

کے بعد حاصل نہیں رہتا۔ پہلی یا دوسری طلاق کے بعد عدت ختم ہونے سے پہلے شوہر کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ رجوع کر لے۔ اس پر بیوی کو انکار کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم تو مجھے طلاق دے چکے ہو‘ اب میں تمہاری بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪﴾ ’’اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق۔‘‘

یعنی ان کے لیے جو حقوق ہیں وہ ان کی ذمہ داریوں کی مناسبت سے ہیں۔

﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ﴾ ’’اور مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ فوقیت کا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾﴾ ’’اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے‘ حکمت والا ہے۔‘‘

اس زمانے میں اس آیت کی بہت غلط تعبیر بھی کی گئی ہے اور اس سے مساواتِ مرد و زن کا فلسفہ ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ بعض مترجمین نے ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪﴾ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ ’’عورتوں کے حقوق بھی مردوں پر ویسے ہی ہیں جیسے مردوں کے اُن پر حقوق ہیں‘‘۔ یہ ترجمہ درست نہیں ہے‘ اس لیے کہ اسلامی شریعت میں مرد اور عورت کے درمیان یعنی شوہر اور بیوی کے درمیان مساوات نہیں ہے۔ اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے عربی میں ’’لِ‘‘ اور ’’عَلٰی‘‘ کا استعمال معلوم ہونا چاہیے۔ ’’لِ‘‘ کسی کے حق کے لیے اور ’’عَلٰی‘‘ کسی کی ذمہ داری کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ اس ٹکڑے کا ترجمہ اس طرح ہوگا: لَهُنَّ ’’ان کے لیے حقوق ہیں‘‘۔ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ ’’جیسی کہ ان پر ذمہ داریاں ہیں‘‘۔ اللہ تعالیٰ نے جیسی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے ویسے حقوق اس کو دیے ہیں اور جیسی ذمہ داری عورت پر ڈالی ہے اُس کی مناسبت سے اس کو بھی حقوق دے دیے ہیں۔ اور اس بات کو کھول دیا کہ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ﴾ یعنی مردوں کو اُن پر ایک درجہ فوقیت کا حاصل ہے۔ اب مساوات کیونکر ہو سکتی ہے؟ آخر میں فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾﴾ ’’اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے‘ حکمت والا ہے۔‘‘

خواہ تمہیں یہ بات پسند ہو خواہ ناپسند ہو‘ یہ اُس کا حکم ہے۔ وہ عزیز ہے‘ زبردست ہے‘ جو چاہے حکم دے۔ اور حکیم ہے‘ حکمت والا ہے‘ اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔

اس آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس پر قدرے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ دیکھئے‘ انسانی تمدن کا اہم ترین اور بنیادی ترین مسئلہ کیا ہے؟ ایک ہے انسانی زندگی کا مسئلہ۔ انسانی زندگی کا سب سے پہلا مسئلہ تو وہی ہے جو حیوانی زندگی کا بھی ہے‘ یعنی اپنی مادی ضروریات۔ ہر حیوان کی طرح انسان کے ساتھ بھی پیٹ لگا ہوا ہے جو کھانے کو مانگتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب دو انسان ملتے ہیں اور اس سے تمدن کا آغاز ہوتا ہے تو اس کا سب سے بڑا مسئلہ انسان کی شہوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دو جنسیں بنا دی ہیں اور ان دونوں کے مابین تعلق سے نسل آگے چلتی ہے۔ اب اس معاملے کو کیسے منظم کیا جائے‘ اس کی کیا حدود و قیود ہوں؟ یہ جذبہ واقعتاً بہت زور آور (potent) ہے۔ اس کے بارے میں فرائیڈ نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ اس نے ذرا زیادہ مرچ مسالا لگا دیا ہے‘ ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا جنسی جذبہ نہایت قوی اور زور آور جذبہ ہے۔ اور جو شے جتنی قوی ہو اسے حدود میں رکھنے کے لیے اس پر اسی قدر زیادہ قدغنیں عائد کرنی پڑتی ہیں۔ کوئی گھوڑا جتنا منہ زور ہوتا ہی اسے لگام دینا آسان نہیں ہوتا‘ اس کے لیے پھر مشقت کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اگر اس جنسی جذبے کو بے لگام چھوڑ دیا جاتا تو تمدن میں فساد ہو جاتا۔ لہٰذا اس کے لیے شادی کا معاملہ رکھا گیا کہ ایک عورت کا ایک مرد کے ساتھ رشتہ قائم ہو جائے‘ سب کو معلوم ہو کہ یہ اس کی بیوی ہے یہ اس کا شوہر ہے‘ تاکہ اس طرح نسب کا معاملہ بھی چلے اور ایک خاندانی ادارہ وجود میں آئے۔ ورنہ آزاد شہوت رانی (free sex) سے تو خاندانی ادارہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ نکاح کے ذریعے ازدواجی بندھن کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سکھایا اور اس طرح خاندانی ادارہ وجود میں آیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس ادارے میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں؟ اس نظریے سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ سیدھی سی بات ہے کہ کسی بھی ادارے کے دو برابر کے سربراہ نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ کسی محکمے کے دو ڈائریکٹر بنا دیں تو وہ ادارہ تباہ ہو جائے گا۔ اوپر مینیجنگ ڈائریکٹر ایک ہی ہوگا‘ اس کے نیچے آپ دس ڈائریکٹر بھی بنا دیں تو کوئی حرج نہیں۔ کسی ادارے کا جنرل مینیجر ایک ہی ہوگا‘ اس کے ماتحت آپ ہر شعبے کا ایک مینیجر بنا دیجیے۔ کسی بھی ادارے میں اگر نظم قائم کرنا ہے تو اس کا چوٹی (top) کا سربراہ ایک ہی ہونا چاہیے۔ لہٰذا جب ایک مرد اور ایک عورت سے ایک خاندانی ادارہ وجود میں آئے تو اس کا سربراہ کون ہوگا—— مرد یا عورت؟ مرد اور عورت انسان ہونے کے ناطے بالکل برابر ہیں‘ ایک ہی باپ کے نطفے سے بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی۔ ایک ہی ماں کے رحم میں بہن نے بھی پرورش پائی ہے اور بھائی نے بھی۔ لہٰذا اس اعتبار سے شرفِ انسانیت میں‘ نوعِ انسانیت کے فرد کی حیثیت سے‘ دونوں برابر ہیں۔ لیکن جب ایک مرد اور ایک عورت مل کر خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں تو اب یہ برابر نہیں رہے۔ جیسے انسان سب برابر ہیں‘ لیکن ایک دفتر میں چپڑاسی اور افسر برابر نہیں ہیں‘ ان کے الگ الگ اختیارات اور فرائض ہیں۔

قرآن حکیم میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ جو احکام دیے گئے ہیں وہ خاندانی نظام اور عائلی معاملات ہی سے متعلق ہیں۔ اس لیے کہ انسانی تمدن کی جڑ بنیاد اور یہی ہے۔ یہاں سے خاندان بنتا ہے اور خاندانوں کے اجتماع کا نام معاشرہ ہے۔ پاکستانی معاشرے کی مثال لے لیجیے۔ اگر ہماری آبادی اِس وقت چودہ کروڑ ہے اور آپ ایک خاندان کے سات افراد شمار کر لیں تو ہمارا معاشرہ دو کروڑ خاندانوں پر مشتمل ہے۔ خاندان کا ادارہ مستحکم ہوگا تو معاشرہ مستحکم ہو جائے گا۔ خاندان کے ادارے میں صلاح اور فلاح ہو گی تو معاشرے میں بھی صلاح و فلاح نظر آئے گی۔ اگر خاندان کے ادارے میں فساد‘ بے چینی‘ ظلم اور ناانصافی ہو گی‘ میاں اور بیوی میں جھگڑے ہو رہے ہوں گے تو پھر وہاں اولاد کی تربیت صحیح نہیں ہو سکتی‘ ان کی تربیت میں یہ منفی چیزیں شامل ہو جائیں گی اور اسی کا عکس پورے معاشرے پر پڑے گا۔ چنانچہ خاندانی ادارے کی اصلاح اور اس کے استحکام کے لیے قرآن مجید میں بڑی تفصیل سے احکام دیے گئے ہیں‘ جنہیں عائلی قوانین کہا جاتا ہے۔

اس ضمن میں طلاق ایک اہم معاملہ ہے۔اس میں مرد اور عورت کو برابر کا اختیار نہیں دیا گیا۔ جہاں تک شادی کا تعلق ہے اس میں عورت کی رضامندی ضروری ہے‘ اسے شادی سے انکار کرنے کا حق حاصل ہے‘ اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔لیکن ایک مرتبہ جب وہ نکاح میں آ گئی ہے تو اب شوہر کا پلڑا بھاری ہے‘ وہ اسے طلاق دے سکتا ہے۔اگر ظلم کے ساتھ دے گا تو اللہ کے ہاں جواب دہی کرنی پڑے گی اور پکڑ ہو جائے گی۔لیکن بہرحال اسے اختیار حاصل ہے۔عورت خود طلاق نہیں دے سکتی‘ البتہ طلاق حاصل کر سکتی ہے‘ جسے ہم ''خلع'' کہتے ہیں۔وہ عدالت کے ذریعے سے یا خاندان کے بڑوں کے ذریعے سے خلع حاصل کر سکتی ہے‘ لیکن اسے مرد کی طرح طلاق دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔اسی طرح اگر مرد نے ایک یا دو طلاقیں دے دیں اور ابھی عدت پوری نہیں ہوئی تو اسے رجوع کا حق حاصل ہے۔اس پر عورت انکار نہیں کر سکتی۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو موجودہ زمانے میں خواتین کو اچھی نہیں لگتیں۔اس لیے کہ آج کی دنیا میں مساواتِ مرد و زن کا فلسفہ شیطان کا سب سے بڑا فلسفہ اور معاشرے میں فتنہ وفساد اور گندگی پیدا کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔اور اب ہمارے ایشیائی ممالک خاص طور پر مسلمان ممالک میں خاندانی نظام کی جو بچی کھچی شکل باقی رہ گئی ہے اور جو کچھ رہی سہی اقدار موجود ہیں انہیں تباہ و برباد کرنے کی سرتوڑ کوششیں ہو رہی ہیں۔قاہرہ کانفرنس اور بیجنگ کانفرنس کا مقصد یہی ہے کہ ایشیا کا مشرق اور مغرب دونوں طرف سے گھیراؤ کیا جائے تاکہ یہاں کی عورت کو آزادی دلائی جائے۔مرد وعورت کی مساوات اور عورتوں کی آزادی (emancipation) کے نام پر ہمارے خاندانی نظام کو اسی طرح برباد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس طرح ان کے ہاں برباد ہو چکا ہے۔امریکی صدر بل کلنٹن نے اپنے سالِ نو کے پیغام میں کہا تھا کہ جلد ہی ہماری قوم کی اکثریت ''حرام زادوں'' (born without any wedlock) پر مشتمل ہو گی۔وہاں اب محض ''one parent family'' رہ گئی ہے۔ماں کی حیثیت باپ کی بھی ہے اور ماں کی بھی۔وہاں کے بچے اپنے باپ کو جانتے ہی نہیں۔اب وہاں ایک مہم زور وشور سے اٹھ رہی ہے کہ ہر انسان کا حق ہے کہ اسے معلوم ہو کہ اس کا باپ کون ہے۔یہ عظیم تباہی ہے جو مغربی معاشرے پر آ چکی ہے اور ہمارے ہاں بھی لوگ اس معاشرے کی نقالی اختیار کر رہے ہیں اور یہ نظریۂ مساواتِ مرد و زن بہت ہی تابناک اور خوشنما الفاظ کے ساتھ سامنے آ رہا ہے۔

البتہ اس معاملے کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیے ہیں بدقسمتی سے ہم مسلمانوں نے وہ بھی ان کو نہیں دیے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں پر ابھی تک ہمارا ہندوانہ پس منظر مسلط ہے اور ہندوؤں کے معاشرے میں عورت کی قطعاً کوئی حیثیت ہی نہیں۔وراثت کا حق تو بہت دُور کی بات ہے‘ اسے تو اپنے شوہر کی موت کے بعد زندہ رہنے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔اسے تو شوہر کی چِتا کے ساتھ ہی جل کر ستی ہو جانا چاہیے۔گویا اس کا تو کوئی قانونی وجود (legal entity) ہے ہی نہیں۔ہمارے آباء واَجداد مسلمان تو ہو گئے تھے‘ لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کی تربیت نہیں ہو سکی تھی‘ لہٰذا ہمارے ذہنوں پر وہی ہندوانہ تصورات مسلط ہیں کہ عورت تو مرد کے پاؤں کی جوتی کی طرح ہے۔یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں کہ ان کے جائز حقوق بھی ان کو نہیں دیتے‘ اس کے نتیجے میں ہم اپنے اوپر ہونے والی مغربی یلغار کو مؤثر کرنے میں خود مدد دے رہے ہیں۔اگر ہم اپنی خواتین کو وہ حقوق نہیں دیں گے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کے لیے مقرر کیے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ آزادیٔ نسواں‘ حقوقِ نسواں اور مساواتِ مرد و زن جیسے خوش نما عنوانات سے جو دعوت اٹھی ہے وہ لازماً انہیں کھینچ کر لے جائے گی۔لہٰذا اس طرف بھی دھیان رکھیے۔ہمارے ہاں دین دار گھرانوں میں خاص طور پر عورتوں کے حقوق نظر انداز ہوتے ہیں۔اس کو سمجھنا چاہیے کہ اسلام میں عورتوں کے کیا حقوق ہیں اور ان کی کس قدر دلجوئی کرنی چاہیے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ((خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِهٖ وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِیْ)) (۲۸) ''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنے گھر والوں کے لیے اچھے ہوں۔اور جان لو کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے اچھا ہوں''۔لہٰذا ضروری ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک ہو‘ ان کی دلجوئی ہو‘ ان کے احساسات کا بھی پاس کیا جائے۔البتہ جہاں دین اور شریعت کا معاملہ آ جائے وہاں کسی لچک کی گنجائش نہ ہو‘ وہاں آپ شمشیر برہنہ ہو جائیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ یہ معاملہ دین کا ہے‘ اس میں مَیں تمہاری کوئی رعایت نہیں کر سکتا‘ ہاں اپنے معاملات کے اندر مَیں ضرور نرمی کروں گا۔

اس ساری بحث کو ذہن میں رکھیے۔ہمارے جدید دانشور اس آیت کے درمیانی الفاظ کو تو لے لیتے ہیں: ﴿وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ص﴾ اور اس سے مساواتِ مرد و زن کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں‘ لیکن ان سے پہلے والے الفاظ اور ﴿وَبُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ﴾ اور بعد والے الفاظ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَةٌ﴾ سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔یہ طرزِ عمل بالکل غلط ہے۔ایک مرد اور ایک عورت سے جو خاندانی ادارہ وجود میں آتا ہے‘ اسلام اس کا سربراہ مرد کو ٹھہراتا ہے۔یہ فلسفہ زیادہ وضاحت سے سورۃ النساء میں بیان ہو گا جہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ......﴾ (آیت ۳۴)۔یہاں اس کی تمہید آ گئی ہے تاکہ یہ کڑوی گولی خواتین کے حلق سے ذرا نیچے اترنی شروع ہو جائے۔اس آیت کا ترجمہ ایک بار پھر دیکھ لیجیے: ''اور ان کے شوہر اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ انہیں لوٹا لیں اس عدت کے دوران میں اگر وہ واقعۃً اصلاح چاہتے ہوں۔اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق۔اور مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ فوقیت کا ہے۔اور اللہ زبردست ہے‘ حکیم ہے''۔اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں عورت کے حوالے کی ہیں‘ جس طرح کے اس پر فرائض عاید کیے ہیں ویسے ہی اس کو حقوق بھی عطا کیے ہیں۔یہ دنیا کا مسلّمہ اصول ہے کہ حقوق وفرائض باہم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔اگر آپ کی ذمہ داری زیادہ ہے تو حقوق اور اختیارات بھی زیادہ ہوں گے۔اگر آپ پر ذمہ داری بہت زیادہ ڈال دی جائے لیکن حقوق اور اختیارات اس کی مناسبت سے نہ ہوں تو آپ اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر سکتے۔جہاں ذمہ داری کم ہو گی وہاں حقوق اور اختیارات بھی کم ہوں گے۔یہ دونوں چیزیں متناسب (proportionate) چلتی ہیں۔

اب ہم اگلی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

آیات ۲۲۹ تا ۲۳۱

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ شَیۡـًٔا اِلَّاۤ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِہٖ ؕ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ فَلَا تَعۡتَدُوۡہَا ۚ وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنۡ طَلَّقَہَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَہٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَہَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَاۤ اَنۡ یَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ یُّقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ؕ وَتِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ یُبَیِّنُہَا لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَلَا تُمۡسِکُوۡہُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَہٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰہِ ہُزُوًا ۫ وَّاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ وَالۡحِکۡمَۃِ یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۳۱﴾﴾

آیت ۲۲۹ ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪﴾ ''طلاق دو مرتبہ ہے۔''

یعنی ایک شوہر کو دو مرتبہ طلاق دے کر رجوع کر لینے کا حق ہے۔ ایک دفعہ طلاق دی اور عدت کے اندر اندر رجوع کر لیا تو ٹھیک ہے۔ پھر طلاق دے دی اور عدت کے اندر اندر رجوع کر لیا تو بھی ٹھیک ہے۔ تیسری مرتبہ طلاق دے دی تو اب وہ رجوع نہیں کر سکتا۔

﴿فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ﴾ ''پھر یا تو معروف طریقے سے روک لینا ہے یا پھر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔''

یعنی دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد اب فیصلہ کرو۔ یا تو اپنی بیوی کو نیکی اور بھلائی کے ساتھ گھر میں روک لو' تنگ کرنے اور پریشان کرنے کے لیے نہیں' یا پھر بھلے طریقے سے' بھلے مانسوں کی طرح اسے رخصت کر دو۔

﴿وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ شَیۡـًٔا﴾ ''اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے انہیں دیا تھا اس میں سے کچھ بھی واپس لو''

جب تم طلاق دے رہے ہو تو تم نے انہیں جو مہر دیا تھا اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔ ہاں اگر عورت خود طلاق مانگے تو اسے اپنے مہر میں سے کچھ چھوڑنا پڑ سکتا ہے۔ لیکن جب مرد طلاق دے رہا ہو تو وہ اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا جو وہ اپنی بیوی کو دے چکا ہے۔ سورۃ النساء (آیت ۲۰) میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں کہ اگر چہ تم نے سونے کا ڈھیر (قنطار) دے دیا ہو پھر بھی اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

﴿اِلَّاۤ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ؕ﴾ ''سوائے اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔''

مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کے ضمن میں جو اہداف و مقاصد معین فرمائے ہیں' اس کے لیے جو احکام دیے ہیں اور جو آداب بتائے ہیں' فریقین اگر یہ محسوس کریں کہ ہم انہیں ملحوظ نہیں رکھ سکتے تو یہ ایک استثنائی صورت ہے' جس میں عورت کوئی مال یا رقم فدیہ کے طور پر دے کر ایسے شوہر سے خلاصی حاصل کر سکتی ہے۔

﴿فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِہٖ ؕ﴾ ''پس اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدودِ الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے' تو ان دونوں پر اس معاملے میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے۔''

یعنی ایسی صورت میں عورت اگر فدیہ کے طور پر کچھ دے دلا کر اپنے آپ کو چھڑا لے تو اس میں فریقین پر کوئی گناہ نہیں۔ مثلاً کسی عورت کا مہر دس لاکھ تھا' وہ اس میں سے پانچ لاکھ شوہر کو واپس دے کر اس سے خلع لے لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

﴿تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ فَلَا تَعۡتَدُوۡہَا ۚ﴾ ''یہ اللہ کی حدود ہیں' پس ان سے تجاوز مت کرو۔''

دیکھئے روزے وغیرہ کے ضمن میں حدود اللہ کے ساتھ ﴿فَلَا تَقۡرَبُوۡہَا﴾ فرمایا تھا۔ یہاں فرمایا: ﴿فَلَا تَعۡتَدُوۡہَا ۚ﴾ اس لیے کہ ان معاملات میں لوگ بڑے دھڑلے سے اللہ کی مقرر کردہ حدود کو پامال کر جاتے ہیں۔ اگر چہ قانون باقی رہ جاتا ہے مگر اس کی روح ختم ہو جاتی ہے۔

﴿وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾﴾ ''اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔''

آیت ۲۳۰ ﴿فَاِنۡ طَلَّقَہَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَہٗ ؕ﴾ ''پھر اگر وہ (تیسری مرتبہ) اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز نہیں ہے' جب تک کہ وہ عورت کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے۔''

تیسری طلاق دے چکنے کے بعد اگر کوئی شخص پھر اسی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو جب تک وہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اور وہ اسے طلاق نہ دے اس وقت تک یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔ اسے ''حلالہ'' کہا جاتا ہے۔ لیکن ''حلالہ'' کے نام سے ہمارے ہاں جو مکروہ دھندا مروّج ہے کہ ایک معاہدے کے تحت عورت کا نکاح کسی مرد سے کیا جاتا ہے کہ تم پھر اسے طلاق دے دینا' اس پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

﴿فَاِنۡ طَلَّقَہَا﴾ ''پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے''

یعنی وہ عورت دوسری جگہ پر شادی کر لے' لیکن دوسرے شوہر سے بھی اس کی نہ بنے اور وہ بھی اس کو طلاق دے دے۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَاۤ اَنۡ یَّتَرَاجَعَاۤ﴾ ''تو اب کوئی گناہ نہیں ہوگا ان دونوں پر کہ وہ مراجعت کر لیں''

اب وہ عورت اپنے سابقہ شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ دوسرے شوہر سے نکاح کے بعد عورت کو شاید عقل آ جائے کہ زیادتی میری ہی تھی کہ پہلے شوہر کے ہاں بس نہیں سکی۔ اب دوسری مرتبہ تجربہ ہونے پر ممکن ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ اب اگر وہ دوبارہ اپنے سابقہ شوہر کی طرف رجوع کرنا چاہے تو اس کی اجازت ہے کہ وہ پھر سے نکاح کر لیں۔

﴿اِنْ ظَنَّآ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ط﴾ ''اگر ان کو یہ یقین ہو کہ وہ اللہ کی حدود کی پاسداری کر سکیں گے۔''

ازدواجی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے جو حدود مقرر کی ہیں اور جو احکام دیے ہیں ان کو بہر حال مدّ نظر رکھنا ہے اور تمام معاملات پر فائق رکھنا ہے۔

﴿وَتِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ یُبَیِّنُھَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۲۳۰)﴾ ''اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں‘ جن کو وہ واضح کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم حاصل کرنا چاہیں۔''

یَعْلَمُوْنَ کا ترجمہ ہے ''جو جانتے ہیں'' یعنی جنہیں علم حاصل ہے‘ لیکن یہاں اس کا مفہوم ہے ''جو علم کے طالب ہیں''۔ بعض اوقات فعل کو طلبِ فعل کے معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

آیت ۲۳۱ ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ﴾ ''اور جب تم لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی عدّت پوری کر لیں''

﴿فَاَمْسِکُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ص﴾ ''تو یا تو معروف طریقے سے انہیں روک لو یا اچھے انداز سے انہیں رخصت کر دو۔''

﴿وَلَا تُمْسِکُوْھُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ج﴾ ''اور تم انہیں مت روکو نقصان پہنچانے کے ارادے سے کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔''

دیکھو ایسا مت کرو کہ تم انہیں تنگ کرنے کے لیے روک لو کہ میں اس کی ذرا اور خبر لے لوں‘ اگر طلاق ہو جائے گی تو یہ آزاد ہو جائے گی۔ غصہ اتنا چڑھا ہوا ہے کہ ابھی بھی ٹھنڈا نہیں ہو رہا اور وہ اس لیے رجوع کر رہا ہے تاکہ عورت کو مزید پریشان کرے‘ اسے اور تکلیفیں پہنچائے۔ اس طرح تو اس نے قانون کا مذاق اڑایا اور اللہ کی دی ہوئی اس اجازت کا ناجائز استعمال کیا۔

﴿وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ ط﴾ ''اور جو کوئی بھی یہ کام کرے گا وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔''

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا ز﴾ ''اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بنا لو۔''

ضروری ہے کہ احکامِ شریعت پر ان کی روح کے مطابق عمل کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں خاص طور پر ازدواجی زندگی کے ضمن میں بار بار اللہ کے خوف اور تقویٰ کی تاکید کی گئی ہے۔ اگر تمہارے دل اس سے خالی ہوں گے تو تم اللہ کی شریعت کو کھیل تماشا بنا دو گے‘ ٹھٹھا اور مذاق بنا دو گے۔

﴿وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ﴾ ''اور یاد کرو اللہ کے جو انعامات تم پر ہوئے ہیں''

﴿وَمَآ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ وَالْحِکْمَۃِ﴾ ''اور جو اُس نے نازل فرمائی تم پر اپنی کتاب اور حکمت۔''

﴿یَعِظُکُمْ بِہٖ ط﴾ ''وہ اس کے ذریعے سے تمہیں نصیحت کر رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد بھی اگر تم نے اس کی حدود کو توڑا اور اس کی شریعت کو مذاق بنایا تو پھر تمہیں اس کی گرفت سے ڈرنا چاہیے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۲۳۱)﴾ ''اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا حقیقی علم حاصل ہے۔''

آیات ۲۳۲ تا ۲۳۷

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ اَنْ یَّنْکِحْنَ اَزْوَاجَھُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَھُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ ط ذٰلِکَ یُوْعَظُ بِہٖ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط ذٰلِکُمْ اَزْکٰی لَکُمْ وَاَطْھَرُ ط
وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۲) وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ
الرَّضَاعَۃَ ط وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَہٗ رِزْقُھُنَّ وَکِسْوَتُھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط لَا تُکَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَھَا ج لَا تُضَآرَّ
وَالِدَۃٌ م بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّہٗ بِوَلَدِہٖ ق وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِکَ ج فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْھُمَا
وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا ط وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَکُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ
اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۲۳۳) وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ
اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِھِنَّ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّعَشْرًا ج فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ
اَنْفُسِھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۲۳۴) وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا عَرَّضْتُمْ بِہٖ مِنْ خِطْبَۃِ
النِّسَآءِ اَوْ اَکْنَنْتُمْ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ سَتَذْکُرُوْنَھُنَّ وَلٰکِنْ لَّا تُوَاعِدُوْھُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ط وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتٰبُ اَجَلَہٗ ط وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ
اَنْفُسِکُمْ فَاحْذَرُوْہُ ج وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ (۲۳۵) لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ
تَمَسُّوْھُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَھُنَّ فَرِیْضَۃً ج وَّمَتِّعُوْھُنَّ ج عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُہٗ وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُہٗ ج مَتَاعًا م
بِالْمَعْرُوْفِ ج حَقًّا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ (۲۳۶) وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْھُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْھُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَھُنَّ فَرِیْضَۃً
فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ ط وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ط وَلَا

تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ ۭ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۳۷﴾

آیت ۲۳۲ ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ اَنْ یَّنْکِحْنَ اَزْوَاجَھُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ﴾ ''اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو' پھر وہ اپنی عدت پوری کر لیں' تو مت آڑے آؤ اس میں کہ وہ عورتیں پھر نکاح کر لیں اپنے سابق ازواج سے' جبکہ وہ آپس میں رضامند ہو جائیں بھلے طریقے پر۔''

جو عورت طلاق پا کر اپنی عدت پوری کر چکی ہو وہ آزاد ہے کہ جہاں چاہے اپنی پسند سے نکاح کر لے۔ اس کے اس ارادے میں طلاق دینے والے شوہر یا اس کے خاندان والوں کو کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاق دی اور عدت کے دوران رجوع نہیں کیا تو اب عدت کے بعد عورت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اسی شوہر سے نکاح ثانی کر سکتی ہے۔ آیت ۲۲۸ کے ذیل میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ ایک یا دو طلاق کی صورت میں شوہر کو عدت کے دوران رجوع کا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر عدت پوری ہو گئی تو اب یہ طلاق رجعی نہیں رہی' طلاقِ بائن ہو گئی۔ اب شوہر اور بیوی کا جو رشتہ تھا وہ ٹوٹ گیا۔ اب اگر یہ رشتہ پھر سے جوڑنا ہے تو دوبارہ نکاح کرنا ہو گا اور اس میں عورت کی مرضی کو دخل ہے۔ عدت کے اندر اندر رجوع کی صورت میں عورت کی مرضی کو دخل نہیں ہے۔ لیکن عدت کے بعد اب عورت کو اختیار ہے' وہ چاہے تو اسی سابق شوہر سے نکاح ثانی کر لے اور چاہے تو اپنی مرضی سے کسی اور شخص سے نکاح کر لے۔ البتہ طلاقِ مغلظ (تیسری طلاق) کے بعد جب تک اس عورت کا نکاح کسی اور مرد سے نہ ہو جائے اور وہ بھی اسے طلاق نہ دے دے' سابق شوہر کے ساتھ اس کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ طلاقِ بائن کے بعد اگر وہی عورت اور وہی مرد پھر سے نکاح کرنا چاہیں تو اب کسی کو اس میں آڑے نہیں آنا چاہیے۔ عام طور پر عورت کے قریبی رشتے دار اس میں رکاوٹ بنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخص نے پہلے بھی تمہیں ستایا تھا' اب تم پھر اُسی سے نکاح کرنا چاہتی ہو' ہم تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔

﴿ذٰلِکَ یُوْعَظُ بِہٖ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ ''یہ وہ چیز ہے جس کی نصیحت کی جا رہی ہے تم میں سے اُس کو جو واقعتاً ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور یومِ آخرت پر۔''

جن کے اندر ایمان ہی نہیں ہے ان کے لیے تو یہ ساری نصیحت گویا بھینس کے آگے بین بجانا ہے جس سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

﴿ذٰلِکُمْ اَزْکٰی لَکُمْ وَاَطْھَرُ ۭ﴾ ''یہی طریقہ تمہارے لیے زیادہ پاک اور زیادہ عمدہ ہے۔''

﴿وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾﴾ ''اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

لہٰذا تم اپنی عقل کو مقدم نہ رکھو' بلکہ اللہ کے احکام کو مقدم رکھو۔ مرد اور عورت دونوں کا خالق وہی ہے' اسے مرد بھی عزیز ہے اور عورت بھی عزیز ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ))(۲۹) یعنی تمام مخلوق اللہ کے کنبے کی مانند ہے۔ لہٰذا اللہ کو تو ہر انسان محبوب ہے' خواہ مرد ہو یا عورت ہو۔ انسان اُس کی تخلیق کا شاہکار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس کا علم بھی کامل ہے' وہ جانتا ہے کہ عورت کے کیا حقوق ہونے چاہئیں اور مرد کے کیا ہونے چاہئیں۔

آیت ۲۳۳ ﴿وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ﴾ ''اور مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں پورے دو سال''

﴿لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَۃَ ۭ﴾ ''اُس شخص کے لیے جو مدتِ رضاعت پوری کرانا چاہتا ہو۔''

اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ مطلقہ عورت اُس کے بچے کو دودھ پلائے اور رضاعت کی مدت پوری کرے تو دو سال تک وہ عورت اس ذمہ داری سے انکار نہیں کر سکتی۔

﴿وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَہٗ رِزْقُھُنَّ وَکِسْوَتُھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ﴾ ''اور بچے والے کے ذمے ہے بچوں کی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق۔''

اس مدت میں بچے کے باپ پر مطلقہ کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری ہے' جسے ہم نان نفقہ کہتے ہیں' اس لیے کہ قانوناً اولاد شوہر کی ہے۔ اس سلسلے میں دستور کا لحاظ رکھنا ہو گا۔ یعنی مرد کی حیثیت اور عورت کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھنا ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ مرد کروڑ پتی ہو لیکن وہ مطلقہ بیوی کو اپنی خادماؤں کی طرح کا نان نفقہ دینا چاہے۔

﴿لَا تُکَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَھَا ۚ﴾ ''کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی مگر اس کی وسعت کے مطابق۔''

﴿لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَۃٌۢ بِوَلَدِھَا﴾ ''نہ تو تکلیف پہنچائی جائے کسی والدہ کو اپنے بچے کی وجہ سے''

﴿وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّہٗ بِوَلَدِہٖ﴾ ''اور نہ اُس کو جس کا وہ بچہ ہے (یعنی باپ) اُس کے بچے کی وجہ سے۔''

یعنی دونوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے' جیسا کہ حدیث نبویؐ ہے: ((لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ))(۳۰) یعنی نہ تو نقصان پہنچانا ہے اور نہ ہی نقصان اٹھانا ہے۔

﴿وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِکَ ۚ﴾ ''اور وارث پر بھی اسی طرح کی ذمہ داری ہے۔''

اگر بچے کا باپ فوت ہو جائے تو بچے کو دودھ پلانے والی مطلقہ عورت کا نان نفقہ مرحوم کے وارثوں کے ذمے رہے گا۔

﴿فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْھُمَا وَتَشَاوُرٍ﴾ ''پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ دودھ چھڑا لیں (دو برس کے اندر ہی) باہمی رضامندی اور صلاح سے''

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا ۭ﴾ ''تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔''

﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَکُمْ﴾ ''اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو''

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ﴾ ''تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں''

اگر بچے کا باپ یا اُس کے ورثاء بچے کی والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے بچے کو دودھ پلوانا چاہتے ہوں تو بھی کوئی حرج نہیں' انہیں اس کی اجازت ہے' بشرطیکہ......

﴿اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ﴾ ''جب کہ تم (بچے کی ماں کو) وہ سب کچھ دے دو جس کا کہ تم نے دینا ٹھہرایا تھا دستور کے موافق۔''

یہ نہ ہو کہ نان نفقہ بچانے کے لیے اب تم مدتِ رضاعت کے درمیان بچے کی ماں کے بجائے کسی اور عورت سے اس لیے دودھ پلوانے لگو کہ اُسے معاوضہ کم دینا پڑے گا۔ اگر تم کسی دایہ وغیرہ سے دودھ پلوانا چاہتے ہو تو پہلے بچے کی ماں کو بھلے طریقے پر وہ سب کچھ ادا کر دو جو تم نے طے کیا تھا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت ۲۳۴ ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ ''اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں''

﴿يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ﴾ ''تو وہ عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک۔''

قبل ازیں آیت ۲۲۸ میں مطلقہ عورت کی عدت تین حیض بیان ہوئی ہے۔ یہاں بیوہ عورتوں کی عدت بیان کی جا رہی ہے کہ وہ شوہر کی وفات کے چار ماہ دس دن بعد تک اپنے آپ کو شادی سے روکے رکھیں۔

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ ''پس جب وہ اپنی اس مدت تک پہنچ جائیں (یعنی عدت گزار لیں)''

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ﴾ ''تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس معاملے میں جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں۔''

عدت گزار چکنے کے بعد وہ آزاد ہیں' جہاں مناسب سمجھیں نکاح کر سکتی ہیں۔ اب تم انہیں روکنا چاہو کہ ہماری ناک کٹ جائے گی' یہ بیوہ ہو کر صبر سے بیٹھ نہیں سکی' اس سے رہا نہیں گیا' اس طرح کی باتیں بالکل غلط ہیں' اب تمہارا کوئی اختیار نہیں کہ تم انہیں روکو۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

آیت ۲۳۵ ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ﴾ ''اور تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اس میں کہ کنایہ و اشارہ میں ظاہر کر دو اُن عورتوں سے پیغامِ نکاح یا پوشیدہ رکھو اپنے دلوں میں۔''

کسی عورت کا عدت کے دوران نکاح تو نہیں ہو سکتا' نہ ہی اسے واضح طور پر پیغامِ نکاح دیا جا سکتا ہے' البتہ اشارے کنائے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مجھے اس میں دلچسپی ہے۔ یا پھر یہ بات اپنے دل ہی میں پوشیدہ رکھی جائے اور عدت ختم ہونے کا انتظار کیا جائے۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ﴾ ''اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے''

آخر تمہیں ان کا خیال تو آئے گا کہ یہ عورت بیوہ ہو گئی ہے' اب میں اس سے شادی کر سکتا ہوں۔ کوئی آدمی یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ یہ جو میرے دل میں بیوہ کے بارے میں خیال آ رہا ہے اور اس سے نکاح کی رغبت پیدا ہو رہی ہے تو شاید میں گناہ گار ہو گیا ہوں۔ یہاں اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ ایسے خیال کا آنا گناہ نہیں ہے' یہ قانونِ فطرت ہے۔

﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا﴾ ''لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپ کر''

ایسا نہ ہو کہ خفیہ ہی خفیہ نکاح کی بات پکّی ہو جائے۔

﴿اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۭ﴾ ''سوائے اس کے کہ کوئی بات کہہ دو معروف طریقے سے۔''

بس کوئی ایسی معروف بات کہہ سکتے ہو جس سے انہیں اشارہ مل جائے۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ﴾ ''اور مت باندھو گرہ نکاح کی جب تک کہ قانونِ شریعت اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے۔''

یعنی اللہ کی مقرر کردہ عدت جب تک پوری نہ ہو جائے۔ یہاں کتاب سے مراد قانونِ شریعت ہے۔ کتاب اللہ میں بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن مقرر کر دی گئی' اس کا پورا ہونا ضروری ہے' اس سے پہلے نکاح نہیں ہو سکتا۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ﴾ ''اور جان رکھو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے' پس اُس سے ڈرتے رہو۔''

اُس کی پکڑ سے بچنے کی کوشش کرو۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾﴾ ''اور یہ بھی جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور بُردبار ہے۔''

اللہ غفور ہے' بخشنے والا ہے' کوئی خطا ہو گئی ہے تو استغفار کرو' توبہ کرو' اللہ معاف فرمائے گا۔ اور وہ حلیم ہے' تحمل کرنے والا ہے' فوراً نہیں پکڑتا' بلکہ ڈھیل دیتا ہے' مہلت دیتا ہے کہ اگر چاہو تو تم توبہ کر لو۔

آیت ۲۳۶ ﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْھُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ﴾ ''تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر تم ایسی بیویوں کو طلاق دے دو جن کو نہ تو تم نے ابھی چھوا ہو اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا ہو۔''

اگر کوئی شخص اپنی منکوحہ کو اس حال میں طلاق دینا چاہے کہ نہ تو اس کے ساتھ خلوتِ صحیحہ کی نوبت آئی ہو اور نہ ہی اس کے لیے مہر مقرر کیا گیا ہو تو وہ دے سکتا ہے۔

﴿وَّمَتِّعُوْھُنَّ ۚ﴾ ''اور ان کو کچھ خرچ دو۔''

اس صورت میں اگرچہ مہر کی ادائیگی لازم نہیں ہے' لیکن مرد کو چاہیے کہ وہ اسے کچھ نہ کچھ مال و متاعِ دُنیوی کپڑے وغیرہ دے دلا کر فارغ کرے۔

﴿عَلَي الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَي الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ﴾ ''صاحبِ وسعت پر اپنی حیثیت کے مطابق ضروری ہے اور تنگ دست پر اپنی حیثیت کے مطابق۔''

جو وسعت والا ہے' غنی ہے' جس کو کشائش حاصل ہے وہ اپنی حیثیت کے مطابق ادا کرے اور جو تنگ دست ہے وہ اپنی حیثیت کے مطابق۔

﴿مَتَاعًاۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ ''جو خرچ کہ قاعدہ کے موافق ہے۔''
یہ ساز و سامانِ دنیا جو ہے یہ بھی بھلے انداز میں دیا جائے' ایسا نہ ہو کہ جیسے خیرات دی جا رہی ہو۔
﴿حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٢٣٦﴾﴾ ''یہ حق ہے محسنین پر۔''
نیکی کرنے والے' بھلے لوگ یہ سمجھ لیں کہ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ ایک ذمہ داری ہے۔

آیت ۲۳۷ ﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ ''اور اگر تم عورتوں کو طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور تم ٹھہرا چکے تھے ان کے لیے ایک متعین مہر''
﴿فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ ''تو جو مہر تم نے طے کیا تھا اب اُس کا آدھا ادا کرنا لازم ہے''
اس صورت میں مقرر شدہ مہر کا آدھا تو تمہیں دینا ہی دینا ہے۔
﴿اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ﴾ ''اِلا یہ کہ وہ معاف کر دیں''
یعنی کوئی عورت خود کہے کہ مجھے آدھا بھی نہیں چاہیے یا کوئی کہے کہ مجھے چوتھائی دے دیجیے۔
﴿اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ﴾ ''یا وہ شخص درگزر سے کام لے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔''
اور یہ گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے' وہ اسے کھول سکتا ہے۔ عورت از خود طلاق دے نہیں سکتی۔ لہٰذا مردوں کے لیے ترغیب ہے کہ وہ اس معاملے میں فراخ دلی سے کام لیں۔
﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ﴾ ''اور یہ کہ تم مرد درگزر کرو تو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔''
﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ ''اور اپنے مابین احسان کرنا مت بھلا دو۔''
اس کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے: ''اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو مت بھولو''۔ یعنی اللہ نے جو فضیلت تم مردوں کو عورتوں پر دی ہے اس کو مت بھولو۔ چنانچہ تمہارا طرزِ عمل بھی ایسا ہونا چاہیے کہ تم اپنے بڑے ہونے کے حساب سے ان کے ساتھ نرمی کرو اور ان کو زیادہ دو۔ تم نے ان کا جتنا بھی مہر مقرر کیا تھا وہ نصف کے بجائے پورا دے دو اور انہیں معروف طریقے سے عزت و تکریم کے ساتھ رخصت کرو۔
﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٧﴾﴾ ''یقیناً جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیات ۲۳۸ تا ۲۴۲

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ

اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٤١﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾﴾

آیت ۲۳۸ ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۤ﴾ ''محافظت کرو تمام نمازوں کی اور خاص طور پر بیچ والی نماز کی۔''
یہ جو بار بار آ رہا ہے کہ جان لو اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے' جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے' جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کی نگاہ میں ہے' جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے' تو اس سب کو قلب و ذہن میں مستحضر رکھنے کے لیے تمہیں پنج وقتہ نماز دی گئی ہے کہ اس کی نگہداشت کرو۔ دنیا کے کاروبار سے نکلو اور اللہ کے حضور حاضر ہو کر اس سے کیا ہوا عہد تازہ کرو۔ حفیظ کا ایک شعر ہے: ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی　　آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

''صلوٰۃ وسطیٰ'' (بیچ والی نماز) کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں' لیکن عام طور پر اس سے مراد عصر کی نماز لی جاتی ہے۔ اس لیے کہ دن میں دو نمازیں فجر اور ظہر اس سے پہلے ہیں اور دو ہی نمازیں مغرب اور عشاء اس کے بعد میں ہیں۔
﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾﴾ ''اور کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے پورے ادب کے ساتھ۔''
قیام' رکوع اور سجدہ فرائض نماز میں سے ہیں۔ رکوع میں بندہ اپنے ربّ کے حضور عاجزی سے جھک جاتا ہے' سجدہ اس جھکنے کی انتہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیام بھی قنوت' عاجزی اور انکساری کے ساتھ ہو' معلوم ہو کہ ایک بندہ اپنے آقا کے سامنے باادب کھڑا ہے۔

آیت ۲۳۹ ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ﴾ ''پھر اگر تم خطرے کی حالت میں ہو تو چاہے پیادہ پڑھ لو یا سوار۔''
دشمن اگر پیچھا کر رہا ہے اور آپ رُک کر تمام شرائط و آداب کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دیں گے تو وہ آپ کے سر پر پہنچ جائے گا۔ یا آپ نے کہیں جا کر فوری طور پر حملہ کرنا ہے اور آپ نماز کے لیے رُک جائیں گے تو مطلوبہ ہدف حاصل نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ دشمن سے خطرے کی حالت میں پیدل یا سوار جس حال میں بھی ہوں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔
﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ﴾ ''پھر جب تم امن میں ہو جاؤ''
خطرہ دور ہو جائے اور امن کی حالت ہو۔
﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾﴾ ''پھر اللہ کو یاد کرو جیسے کہ تمہیں اُس نے سکھایا ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے۔''
اُمت کو نماز کا طریقہ محمد رسول اللہ ﷺ نے سکھایا ہے اور حکم دیا ہے: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ))[31] ''نماز پڑھو جیسے کہ تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ نماز کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کا سکھایا ہوا ہے۔ روایات سے ثابت ہے کہ حضرت

جبرائیل علیہ السلام نے آ کر محمد رسول اللہ ﷺ کو دو دن نماز پڑھائی ہے۔ ایک دن پانچوں نمازیں اوّل وقت میں اور دوسرے دن پانچوں نمازیں آخری وقت میں پڑھائیں اور بتا دیا کہ ان نمازوں کا وقت ان اوقات کے درمیان ہے۔ چنانچہ نماز کے معاملے میں آنحضور ﷺ کے معلم حضرت جبرئیلؑ ہیں اور آپ ﷺ پوری اُمت کے لیے معلم ہیں۔"

اب بیوہ عورتوں کے بارے میں مزید ہدایات آ رہی ہیں۔

آیت ۲۴۰ ﴿وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ﴾ ''اور جو لوگ تم میں سے وفات دے دیے جائیں اور وہ چھوڑ جائیں بیویاں''

﴿وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ ۚ﴾ ''تو وہ وصیت کر جائیں اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک کے لیے نان نفقہ کی' بغیر اس کے کہ انہیں گھروں سے نکالا جائے۔''

مثال کے طور پر ایک شخص فوت ہوا ہے اور اس کی چار بیویاں ہیں' جن میں سے ایک کے ہاں اولاد ہے' جبکہ باقی تین اس اولاد کی سوتیلی مائیں ہیں۔ اب یہ اولاد سگی ماں کو تو اپنی ماں سمجھ کر اس کی خدمت کرے گی اور باقی تین کو خواہ مخواہ کی ذمہ داری (liability) سمجھے گی۔ تو فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ ان بیواؤں کو فوراً گھر سے نکال دو' کہ جاؤ اپنا راستہ لو' جس سے تمہاری شادی تھی وہ تو فوت ہو گیا' بلکہ ایک سال کے لیے انہیں گھر سے نہ نکالا جائے اور ان کا نان نفقہ دیا جائے۔ ان آیات کے نزول تک قانونِ وراثت ابھی نہیں آیا تھا' لہٰذا بیواؤں کے بارے میں وصیت کا عبوری حکم دیا گیا' جیسا کہ قبل ازیں آیت ۱۸۰ میں والدین اور قرابت داروں کے لیے وصیت کا عبوری حکم دیا گیا۔ سورۃ النساء میں قانونِ وراثت نازل ہوا تو اس میں والدین کا حق بھی معین کر دیا گیا اور شوہر کی وفات کی صورت میں بیوی کے حق کا اور بیوی کی وفات کی صورت میں شوہر کے حق کا بھی تعین کر دیا گیا اور اب والدین و عزیز و اقارب اور بیوگان کے حق میں وصیت کی ہدایات منسوخ ہو گئیں۔

﴿فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ﴾ ''پھر اگر وہ عورتیں خود نکل جائیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں جو کچھ وہ اپنے حق میں معروف طریقے پر کریں۔''

اگر کوئی عورت عدت گزارنے کے بعد دوسری شادی کر کے کہیں بسنا چاہے تو تم اسے سال بھر کے لیے روک نہیں سکتے۔ وہ اپنے حق میں معروف طریقے پر جو بھی فیصلہ کریں وہ اس کی مجاز ہیں' اس کا کوئی الزام تم پر نہیں آئے گا۔

﴿وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۲۴۰﴾ ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

آیت ۲۴۱ ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ﴾ ''اور مطلقہ عورتوں کو بھی سازوسامانِ زندگی دینا ہے معروف طریقے پر۔''

﴿حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ ۲۴۱﴾ ''یہ لازم ہے پرہیزگاروں پر۔''

واضح رہے کہ یہ ہدایت عدت کے وقت تک کے لیے ہے' اُس کے بعد نہیں۔ اسی معاملے میں کلکتہ ہائی کورٹ نے شاہ بانو کیس میں جو ایک فیصلہ دیا تھا اس پر ہندوستان میں شدید احتجاج ہوا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ کوئی مسلمان اگر اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہ بیوی اگر تو دوسری شادی کر لے تب تو بات دوسری ہے' ورنہ جب تک وہ زندہ رہے گی اس کا نان نفقہ طلاق دینے والے کے ذمے رہے گا۔ اس پر بھارت کے مسلمانوں نے کہا کہ یہ ہماری شریعت میں دخل اندازی ہے' شریعت نے مطلقہ کے لیے صرف عدت تک نان نفقہ کا حق رکھا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس مسئلے پر احتجاجی تحریک چلائی' جس میں بہت سے لوگوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ آخر کار راجیو گاندھی کی حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور پھر وہاں یہ قانون بنا دیا گیا کہ ہندوستان کی کوئی عدالت بشمول سپریم کورٹ مسلمانوں کے عائلی قوانین میں دخل نہیں دے سکتی۔ اس برّ میں مسلمانانِ بھارت کی عظمت کو سلام پیش کیا کرتا ہوں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں یہ ہوا کہ ایک فوجی آمر نے عائلی قوانین بنائے جن کے بارے میں سنی' شیعہ' اہل حدیث' دیوبندی' بریلوی تمام علماء اور جماعت اسلامی کی چوٹی کی قیادت سب نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ یہ قوانین خلافِ اسلام ہیں' مگر وہ آج تک چل رہے ہیں۔ ایک اور فوجی آمر گیارہ برس تک یہاں پر کوسِ لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ بجاتا رہا اور اسلام اسلام کا راگ بھی الاپتا رہا' لیکن اس نے بھی ان قوانین کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ اسی بنیاد پر میں نے اس کی شوریٰ سے استعفا دیا تھا۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں نے وہاں پر یہ بات نہیں ہونے دی۔

آیت ۲۴۲ ﴿کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ۲۴۲﴾ ''اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح کر رہا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو (اور سمجھو)۔''

آیات ۲۴۳ تا ۲۵۳

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۟ ثُمَّ اَحْیَاهُمْ
ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ۲۴۳ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْۤا
اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۲۴۴ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ
وَیَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۲۴۵ اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ
لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا
وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا
اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۲۴۶ وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا ؕ قَالُوْۤا
اَنّٰی یَکُوْنُ لَهُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ مِنْهُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ
عَلَیْکُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْکَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۲۴۷ وَقَالَ لَهُمْ
نَبِیُّهُمْ اِنَّ اٰیَةَ مُلْکِهٖۤ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْهِ سَکِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَبَقِیَّةٌ مِّمَّا تَرَکَ اٰلُ مُوْسٰی وَاٰلُ هٰرُوْنَ
تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِکَةُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۲۴۸ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ

اللّٰہَ مُبۡتَلِیۡکُمۡ بِنَہَرٍ ۚ فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡہُ فَلَیۡسَ مِنِّیۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ یَطۡعَمۡہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡۤ اِلَّا مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَۃًۢ بِیَدِہٖ ۚ
فَشَرِبُوۡا مِنۡہُ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡہُمۡ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَہٗ ہُوَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ ۙ قَالُوۡا لَا طَاقَۃَ لَنَا الۡیَوۡمَ بِجَالُوۡتَ
وَجُنُوۡدِہٖ ؕ قَالَ الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰہِ ۙ کَمۡ مِّنۡ فِئَۃٍ قَلِیۡلَۃٍ غَلَبَتۡ فِئَۃً کَثِیۡرَۃًۢ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ مَعَ
الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِہٖ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَی
الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۵۰﴾ فَہَزَمُوۡہُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۟ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ وَاٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَعَلَّمَہٗ
مِمَّا یَشَآءُ ؕ وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی
الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡہَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ؕ وَاِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۲۵۲﴾ تِلۡکَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا
بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ۘ مِنۡہُمۡ مَّنۡ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعۡضَہُمۡ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ
وَاَیَّدۡنٰہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنٰتُ وَلٰکِنِ
اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ کَفَرَ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقۡتَتَلُوۡا ۟ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ ﴿۲۵۳﴾

اب جو دو رکوع زیر مطالعہ آ رہے ہیں یہ اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں اس جنگ کا تذکرہ ہے جس کی حیثیت گویا تاریخ بنی اسرائیل کے غزوۂ بدر کی ہے۔ قبل ازیں یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے یوشع بن نون کی سرکردگی میں جہاد و قتال کیا تو فلسطین فتح ہو گیا۔ لیکن انہوں نے ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کی بجائے چھوٹی چھوٹی بارہ حکومتیں بنالیں اور آپس میں لڑتے بھی رہے۔ لیکن تین سو برس کے بعد پھر یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ جب ان کے اوپر دنیا تنگ ہو گئی اور آس پاس کی کافر اور مشرک قوموں نے انہیں دبا لیا اور بہت سوں کو اُن کے گھروں اور ان کے ملکوں سے نکال دیا تو پھر تنگ آ کر انہوں نے اُس وقت کے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ یعنی سپہ سالار مقرر کر دیجیے‘ اب ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے۔ چنانچہ وہ جو جنگ ہوئی ہے طالوت اور جالوت کی‘ اس کے بعد گویا بنی اسرائیل کا دورِ خلافت راشدہ شروع ہوا۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کا یہ دور جسے میں ”خلافتِ راشدہ“ سے تعبیر کر رہا ہوں‘ ان کے رسولؑ کے انتقال کے تین سو برس بعد شروع ہوا‘ جبکہ اِس اُمت مسلمہ کی خلافتِ راشدہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ساتھ متصل ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جانیں دیں‘ خون دیا‘ قربانیاں دیں اور اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں دین غالب ہو گیا اور اسلامی ریاست قائم ہو گئی۔ نتیجتاً آپؐ کے انتقال کے بعد خلافت کا دَور شروع ہو گیا‘ لیکن وہاں تین سو برس گزرنے کے بعد ان کا دَورِ خلافت آیا ہے۔ اس میں بھی تین خلافتیں تو متفق علیہ ہیں۔ یعنی حضرت طالوت‘ حضرت داوٗد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی خلافت۔ لیکن چوتھی خلافت پر آ کر تقسیم ہو گئی۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۂ رابع کے زمانے میں عالمِ اسلام منقسم ہو گیا کہ مصر اور شام نے حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ اسی طرح فلسطین کی مملکت حضرت سلیمانؑ کے دو بیٹوں میں تقسیم ہو گئی‘ اور اسرائیل اور یہودیہ کے نام سے دو ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ قرآن حکیم میں اس مقام پر طالوت اور جالوت کی اس جنگ کا تذکرہ آ رہا ہے جس کے بعد تاریخ بنی اسرائیل میں اسلام کے غلبے اور خلافتِ راشدہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ درحقیقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ اب یہی مرحلہ تمہیں درپیش ہے‘ غزوۂ بدر پیش آیا چاہتا ہے۔

آیت ۲۴۳ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ﴾ ”کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جو نکل کھڑے ہوئے اپنے گھروں سے“

﴿وَہُمۡ اُلُوۡفٌ﴾ ”جبکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے“

﴿حَذَرَ الۡمَوۡتِ ۪﴾ ”موت کے ڈر کی وجہ سے۔“

یعنی جب کفار اور مشرکین نے ان پر غلبہ کر لیا اور یہ دہشت زدہ ہو کر‘ اپنے ملک چھوڑ کر‘ اپنے گھروں سے نکل بھاگے۔

﴿فَقَالَ لَہُمُ اللّٰہُ مُوۡتُوۡا ۟﴾ ”تو اللہ نے ان سے کہا کہ مر جاوٴ!“

﴿ثُمَّ اَحۡیَاہُمۡ ؕ﴾ ”پھر (اللہ نے) انہیں زندہ کیا۔“

یہاں موت سے مراد خوف اور بزدلی کی موت بھی ہو سکتی ہے جو اُن پر بیس برس طاری رہی‘ پھر سیموئیل نبی کی اصلاح و تجدید کی کوششوں سے ان کی نشأۃِ ثانیہ ہوئی اور اللہ نے ان کے اندر ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ گویا یہاں پر موت اور احیاء سے مراد معنوی اور روحانی و اخلاقی موت اور احیاء ہے۔ لیکن بالفعل جسدی موت اور احیاء بھی اللہ کے اختیار سے باہر نہیں‘ اس کی قدرت میں ہے‘ وہ سب کو مار کر بھی دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۴۳﴾﴾ ”یقیناً اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔“

اکثر لوگ شکر گزاری کی روش اختیار کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے احسانات کی ناقدری کرتے ہیں۔

اب سابقہ اُمتِ مسلمہ کے ”غزوۂ بدر“ کا حال بیان کرنے سے پہلے مسلمانوں سے گفتگو ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ ان کی ہدایت کے لیے بیان ہو رہا ہے‘ تاریخ بیان کرنا قرآن کا مقصد نہیں ہے۔ یہ تو محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کی تحریک جس مرحلے سے گزر رہی تھی اور انقلابی عمل جس سٹیج پر پہنچ چکا تھا اس کی مناسبت سے سابقہ اُمت مسلمہ کی تاریخ سے واقعات بھی لائے جا رہے ہیں اور اُسی کی مناسبت سے احکام بھی دیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

آیت ۲۴۴ ﴿وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۴﴾﴾ ”اور جنگ کرو اللہ کی راہ میں‘ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔“

آیت ۲۴۵ ﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضۡعَافًا کَثِیۡرَۃً ؕ﴾ ”کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تو اللہ اس کو اس کے لیے کئی گنا بڑھاتا رہے۔“

جو انفاق خالص اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے کیا جاتا ہے اسے اللہ اپنے ذمے قرضِ حسنہ سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم

میرے دین کو غالب کرنا چاہتے ہو‘ میری حکومت قائم کرنا چاہتے ہو‘ تو جو کچھ اس پر خرچ کرو گے وہ مجھ پر قرض ہے‘ جسے میں کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کروں گا۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ﴾ ”اور اللہ تنگ دستی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی دیتا ہے۔“

اللہ ہی کے اختیار میں ہے کسی چیز کو سکیڑ دینا اور کھول دینا‘ کسی کے رزق کو تنگ کر دینا یا اس میں کشائش کر دینا۔

﴿وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۴۵﴾ ”اور اُسی کی طرف تمہیں لوٹا دیا جائے گا۔“

یہاں دیکھئے جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں چیزوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ جہاد بالنفس کی آخری شکل قتال ہے اور جہاد بالمال کے لیے پہلے لفظ ”انفاق“ آ رہا تھا‘ اب قرضِ حسنہ لایا جا رہا ہے۔

آیت ۲۴۶ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ﴾ ”کیا تم نے غور نہیں کیا بنی اسرائیل کے سرداروں کے معاملے میں‘ جو انہیں موسیٰؑ کے بعد پیش آیا؟“

﴿اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾ ”جبکہ انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیجیے‘ تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔

یہاں بادشاہ سے مراد امیر اور سپہ سالار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نبی کی موجودگی میں بلندترین مرتبہ تو نبی ہی کا رہے گا‘ لیکن ایک ایسا امیر نامزد کر دیجیے جو نبی کے تابع ہو کر جنگ کی سپہ سالاری کر سکے۔ میں حدیث بیان کر چکا ہوں کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کوئی نہ کوئی نبی ضرور موجود رہا ہے۔ اُس وقت سیموئیل نبی تھے جن سے سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ فرمائش کی تھی۔

﴿قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ﴾ ”انہوں نے کہا کہ تم سے اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ جب تم پر جنگ فرض کر دی جائے تو اُس وقت تم جنگ نہ کرو۔“

یعنی ابھی تو تمہارے بڑے دعوے ہیں‘ بڑے جوش و خروش اور بہادری کا اظہار کر رہے ہو‘ لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ میں اللہ تعالیٰ سے جنگ کی اجازت بھی لوں اور تمہارے لیے کوئی سپہ سالار یا بادشاہ بھی مقرر کر دوں اور پھر تم جنگ سے کنی کترا جاؤ؟

﴿قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ”انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال نہ کریں؟“

﴿وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ۭ﴾ ”جبکہ ہمیں نکال دیا گیا ہے ہمارے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے۔“

دشمنوں نے ان کے بیٹوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو باندیاں بنا لیا تھا اور یہ اپنے ملکوں سے خوف کے مارے بھاگے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اب ہم جنگ نہیں کریں گے تو کیا کریں گے؟

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ﴾ ”پھر جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی“

﴿تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ﴾ ”تو سب پیٹھ پھیر گئے‘ سوائے ان کی ایک قلیل تعداد کے۔“

یہ گویا مسلمانوں کو تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ تم بھی بہت کہتے رہے ہو کہ حضورؐ ہمیں جنگ کی اجازت ملنی چاہیے‘ لیکن ایسا نہ ہو کہ جب جنگ کا حکم آئے تو وہ تمہیں ناگوار گزرے۔ آیت ۲۱۶ میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ﴾ ”تم پر جنگ فرض کی گئی ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔“

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۲۴۶﴾ ”اور اللہ ایسے ظالموں سے خوب باخبر ہے۔“

آیت ۲۴۷ ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ﴾ ”اور اُن سے کہا ان کے نبیؐ نے کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔“

ان کا نام تورات میں ساؤل (Saul) آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اصل نام ساؤل ہو‘ لیکن چونکہ وہ بہت قد آور تھے اس لیے ان کا ایک صفاتی نام یا لقب ”طالوت“ ہو۔ طالوت کے معنی ”لمبے تڑنگے“ کے ہیں۔

﴿قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا﴾ ”انہوں نے کہا کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے ہمارے اوپر بادشاہت ملے؟“

﴿وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ﴾ ”جبکہ ہم اس سے زیادہ حق دار ہیں بادشاہت کے“

﴿وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ﴾ ”اور اسے تو مال کی وسعت بھی نہیں دی گئی۔“

وہ تو مفلس ہے‘ اسے تو اللہ تعالیٰ نے زیادہ دولت بھی نہیں دی ہے۔ کیونکہ ان کے معیارات یہی تھے کہ جو دولت مند ہے وہی صاحب عزت ہے۔

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ﴾ ”(نبیؐ نے) کہا: (اب جو چاہو کہو) یقیناً اللہ نے اس کو چن لیا ہے تم پر۔“

یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ (Divine Decision) ہے‘ جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اللہ نے اُسی کو تمہاری سرداری کے لیے چنا ہے۔

﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ﴾ ”اور اسے کشادگی عطا کی ہے علم اور جسم دونوں چیزوں میں۔“

وہ نہ صرف قد آور اور طاقت ور ہے بلکہ اللہ نے اسے علم اور فہم بھی وافر عطا فرمایا ہے‘ اسے امورِ جنگ سے بھی واقفیت ہے۔ تمہارے نزدیک عزت اور سرداری کا معیار دولت ہے‘ مگر اللہ نے اسے ان دو چیزوں کی بنا پر چنا ہے۔ ایک تو وہ جسمانی طور پر مضبوط اور طاقتور ہے۔ اُس دور میں ظاہر بات ہے اس کی بہت ضرورت تھی۔ اور دوسرے یہ کہ اسے علم‘ فہم‘ سمجھ اور دانش دی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی بادشاہت دے دیتا ہے۔“

اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جس کو چاہے دے‘ وہ جسے چاہے اپنی طرف سے اقتدار بخشے۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۴۷﴾ ”اور اللہ بہت سمائی والا ہے‘ سب کچھ جاننے والا ہے۔“

اس کی وسعت اتھاہ ہے‘ کوئی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا‘ اور وہ بڑا علم رکھنے والا ہے‘ سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ جس کو جو

کچھ دیتا ہے بر بنائے علم دیتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے۔

آیت ۲۴۸ ﴿وَقَالَ لَھُمْ نَبِیُّھُمْ اِنَّ اٰیَۃَ مُلْکِہٖٓ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَبَقِیَّۃٌ مِّمَّا تَرَکَ اٰلُ مُوْسٰی وَاٰلُ ھٰرُوْنَ تَحْمِلُہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ط﴾ ''اوران سے کہا ان کے نبی نے کہ طالوت کی بادشاہت کی ایک نشانی یہ ہوگی کہ تمہارے پاس وہ صندوق آ جائے گا (جو تم سے چھن چکا ہے) جس میں تمہارے لیے تسکین کا سامان ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اور کچھ آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں' وہ صندوق فرشتوں کی تحویل میں ہے۔''

طالوت کی امارت اور بادشاہی کی علامت کے طور پر وہ صندوق تمہارے پاس واپس آ جائے گا۔ اصل میں یہ ''تابوتِ سکینہ'' لکڑی کا ایک بہت بڑا صندوق تھا' جس میں بنی اسرائیل کے انبیاء کرام علیہم السلام کے تبرکات محفوظ تھے۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ صندوق اب بھی مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگ میں موجود ہے۔ انہوں نے بعض ذرائع سے فوٹو لے کر اس کی دستاویزی فلم بھی دکھا دی ہے۔ یہ ''تابوتِ سکینہ'' حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کردہ ہیکل کے تہہ خانے میں رکھا ہوا تھا اور وہیں پر ربائیّ (رَبّٰنِیّٖنَ) بھی موجود تھے۔ جب اس ہیکل کو منہدم کیا گیا تو وہ اسی میں دب گئے۔ وہ تہہ خانہ چاروں طرف سے بند ہوگیا ہوگا اور ان کی لاشیں اور تابوتِ سکینہ اس کے اندر ہی ہوں گے۔ تابوتِ سکینہ میں بنی اسرائیل کے لیے بہت بڑی روحانی تسکین کا سامان تھا کہ ہمارے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے تبرکات ہیں۔ اس میں عصائے موسیٰ بھی تھا اور وہ الواح بھی جو حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر دی گئی تھیں اور جن پر تورات لکھی ہوئی تھی۔ اس تابوت کو دیکھ کر بنی اسرائیل کو اسی طرح تسکین ہوتی تھی جیسے ایک مسلمان کو خانہ کعبہ کو دیکھ کر تسکین ہوتی ہے۔ اسرائیلیوں کو جب ان کے پڑوسی ملکوں نے شکست دی تو وہ تابوتِ سکینہ بھی چھین کر لے گئے۔ پوری قوم نے اس عظیم سانحے پر ماتم کیا اور اسے بنی اسرائیل سے ساری عزت وحشمت چھن جانے سے تعبیر کیا گیا۔ چنانچہ اس سے ان کے حوصلے مزید پست ہو گئے۔ اب جبکہ اسرائیلیوں نے جنگ کا ارادہ کیا اور وقت کے نبی حضرت سیموئیل علیہ السلام نے طالوت کو ان کا امیر مقرر کیا تو انہیں یہ بھی بتایا کہ طالوت کو اللہ کی طرف سے نامزد کیے جانے کی ایک علامت یہ ہوگی کہ تمہاری تسکین کا سامان ''تابوتِ سکینہ'' جو تم سے چھن گیا تھا' ان کے عہدِ امارت میں تمہیں واپس مل جائے گا اور اس وقت وہ فرشتوں کی تحویل میں ہے۔ ہوا یہ کہ ان کے دشمن جب تابوت چھین کر لے گئے تو وہ ان کے لیے ایک مصیبت بن گیا۔ وہ اسے جہاں رکھتے وہاں طاعون اور دوسری وبائیں پھوٹ پڑتیں۔ بالآخر انہوں نے اسے نحوست کا باعث سمجھتے ہوئے ایک چھکڑے پر رکھا اور بیلوں کو ہانک دیا کہ جدھر چاہیں لے جائیں۔ بیل سیدھے چلتے چلتے اسے بنی اسرائیل کے علاقے میں لے آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ فرشتوں کی راہنمائی سے ہوا۔ اس طرح وہ تابوتِ سکینہ ان کے پاس واپس پہنچ گیا جو برسوں پہلے ان سے چھن چکا تھا۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۴۸﴾﴾ ''یقیناً اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ماننے والے ہو۔''

آیت ۲۴۹ ﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ لا﴾ ''پھر جب طالوت اپنے لشکروں کو لے کر چلے''

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَھَرٍ ج﴾ ''تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرے گا ایک دریا سے (یعنی دریائے اُردن)۔''

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْہُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ج﴾ ''تو جو اس میں سے (پیٹ بھر کر) پانی پیئے گا وہ میرا ساتھی نہیں ہے۔''

﴿وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیْٓ﴾ ''اور جو اُس میں سے پانی نہیں پیئے گا وہ میرا ساتھی ہے''

﴿اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَۃً م بِیَدِہٖ ج﴾ ''سوائے اس کے کہ کوئی اپنے ہاتھ سے صرف چلّو بھر پانی لے کر پی لے۔''

اصل میں ہر کمانڈر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کسی بھی بڑی جنگ سے پہلے اپنے ساتھیوں کے جوش و جذبہ اور عزم و حوصلہ (morale) کو پرکھے اور نظم (discipline) کی حالت کو دیکھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی غزوۂ بدر سے قبل مشاورت کی تھی کہ مسلمانو! ایک طرف جنوب سے کیل کانٹے سے لیس ایک لشکر آ رہا ہے اور دوسری طرف شمال سے مال و اسباب سے لدا پھندا ایک قافلہ آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک تمہیں ضرور ملے گا۔ بتاؤ کدھر چلیں؟ کچھ لوگ جو کمزوری دکھا رہے تھے انہوں نے کہا کہ چلیں پہلے قافلہ لوٹ لیں! اور جو لوگ باہمت تھے انہوں نے کہا حضور! جو آپؐ کا ارادہ ہو' جو آپؐ کی منشا ہو' آپؐ اس کے مطابق فیصلہ فرمائیے' ہم حاضر ہیں! تو یہاں بھی طالوت نے اپنے لشکریوں کا ٹیسٹ لیا کہ وہ میرے حکم کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔

﴿فَشَرِبُوْا مِنْہُ﴾ ''تو انہوں نے اس میں سے (خوب جی بھر کر) پانی پیا''

﴿اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْھُمْ ط﴾ ''سوائے اُن میں سے ایک قلیل تعداد کے۔''

﴿فَلَمَّا جَاوَزَہٗ ھُوَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ لا﴾ ''تو جب دریا پار کر کے آگے بڑھے طالوت اور اُس کے ساتھی اہل ایمان''

واضح رہے کہ سب سے پہلی سکریننگ قبل ازیں ہو چکی تھی۔ ان میں سے جو قتال ہی کے منکر ہو گئے تھے وہ پہلے ہی الگ ہو چکے تھے۔ اب یہ دوسری چھلنی تھی۔ جو اُس میں سے نہیں نکل سکے وہ پانی پی کر بے سدھ ہو گئے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے غزوۂ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینہ منورہ سے نکلے تھے اور پھر عین وقت پر تین سو افراد ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ تو جب طالوت اور اُن کے ان ساتھیوں نے جو ایمان پر ثابت قدم رہے تھے' دریا پار کر لیا......

﴿قَالُوْا لَا طَاقَۃَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِہٖ ط﴾ ''تو اُنہوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔''

جالوت (Goliath) بڑا قوی ہیکل اور گرانڈیل انسان تھا۔ زرہ بکتر میں اس کا پورا جسم اس طرح چھپا ہوا تھا کہ سوائے آنکھ کے سوراخ کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں تھا۔ اُس کی مبارزت کے جواب میں کوئی بھی مقابلے پر نہیں آ رہا تھا۔

﴿قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا اللّٰہِ لا کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً م بِاِذْنِ اللّٰہِ ط﴾ ''تو کہا اُن لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ انہیں (ایک دن) اللہ سے ملاقات کرنی ہے' کہ کتنی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ایک چھوٹی جماعت بڑی

جماعت پر غالب آ گئی اللہ کے حکم سے۔“

سو تم آگے بڑھو‘ ہمت کرو‘ اپنی کم ہمتی کا ثبوت نہ دو۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد سے تمہیں فتح حاصل ہو جائے گی۔

﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٢٤٩﴾﴾ ”اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

آیت ۲۵۰ ﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ ”اور جب وہ مقابلے پر نکلے جالوت اور اس کے لشکروں کے“

بَرَزَ کے معنی ہیں ظاہر ہو جانا‘ آمنے سامنے آ جانا۔ اب دونوں لشکر میدانِ جنگ میں آمنے سامنے آئے۔ اِدھر طالوت کا لشکر ہے اور اُدھر جالوت کا۔

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا﴾ ”تو انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے ربّ! ہم پر صبر اُنڈیل دے“

”اَفْرِغْ“ کا مفہوم ہے کسی برتن سے کسی کے اوپر پانی اس طرح گرا دینا کہ وہ برتن خالی ہو جائے۔ طالوت اور ان کے ساتھی اہل ایمان نے دشمن کے مدّمقابل آنے پر دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کا فیضان فرما‘ صبر کی بارش فرما دے۔

﴿وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ ”اور (میدانِ جنگ میں) ہمارے قدموں کو جما دے“

﴿وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٥٠﴾﴾ ”اور ہماری مدد فرما ان کافروں کے مقابلے میں۔“

یہ دعا گویا اہل ایمان کو تلقین کی جا رہی ہے کہ جب بدر کے موقع پر تمہارا کفار سے مقابلہ ہو گا تو تمہیں یہ دعا کرنی چاہیے۔

آیت ۲۵۱ ﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣ﴾ ”تو انہوں نے مار بھگایا اُن کو اللہ کے حکم سے۔“

اہل ایمان نے اللہ کے اذن سے اور اللہ کی مشیت سے دشمنوں کو شکست دی۔

﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ ”اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا“

یہ داؤد وہی حضرت داؤد علیہ السلام ہیں جو جلیل القدر نبی اور بادشاہ ہوئے۔ ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد ایک گڈریے تھے اور جنگل میں اپنی بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک گوپیا ہوتا تھا‘ جس کے اندر پتھر رکھ کر وہ اس کو گھما کر مارتے تھے۔ نشانہ اتنا صحیح تھا کہ اس سے وہ اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے جنگلی جانوروں کے جبڑے توڑ دیا کرتے تھے۔ جب طالوت اور جالوت کے لشکر آمنے سامنے تھے تو داؤد اتفاقاً وہاں آ نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ جالوت للکار رہا ہے کہ ہے کوئی جو میرے مقابلہ میں آئے؟ لیکن ادھر سب کے سب سہمے کھڑے ہیں‘ کوئی آگے نہیں بڑھ رہا۔ یہ دیکھ کر اُن کی غیرت کو جوش آ گیا۔ انہوں نے طالوت سے اس کے مقابلے کی اجازت مانگی اور کہنے لگے کہ میں تو اپنے گوپیے سے شیروں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں‘ بھلا اس نامختون کی کیا حیثیت ہے‘ میں ابھی اس کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہوں۔ (واضح رہے کہ ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے اور یہ ملّتِ ابراہیمی میں ہمیشہ رائج رہا ہے۔ لیکن کفار اور مشرکین کے ہاں ختنہ کا رواج نہیں تھا۔ چنانچہ ”نامختون“ بنی اسرائیل کے ہاں سب سے بڑی گالی تھی۔) داؤدؑ نے سپہ سالار کی اجازت سے اپنا گوپیا اور چند پتھر اٹھائے اور دیو ہیکل جالوت کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ جالوت نے ان کا مذاق اڑایا‘ لیکن انہوں نے اپنے گوپیے میں ایک پتھر رکھ کر ایسے گھما کر چھوڑا کہ وہ سیدھا آنکھ کے سوراخ سے پار ہو کر اس کے بھیجے کے اندر اتر گیا اور جالوت وہیں ڈھیر ہو گیا۔

﴿وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ﴾ ”اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت عطا کی اور جو کچھ چاہا اسے سکھا دیا۔“

طالوت نے داؤدؑ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا‘ اس طرح وہ طالوت کے داماد ہو گئے۔ پھر طالوت نے انہی کو اپنا وارث بنایا اور یہ بادشاہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکومت و سلطنت بھی عطا فرمائی اور حکمت و نبوت سے بھی نوازا۔ ان دونوں اعتبارات سے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو سرفراز فرمایا۔ یہ سب انعامات اس واقعے کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام پر ہوئے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اللہ نے انہیں سکھایا جو کچھ کہ اللہ نے چاہا۔

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ ”اور اگر (اس طریقے سے) اللہ ایک گروہ کو دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا“

زمین میں جب بھی فساد ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی شکل ایسی پیدا کرتا ہے کہ کسی اور گروہ کو سامنے لا کر مفسدوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین میں فساد ہی فساد پھیل گیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جنگوں کے ذریعہ سے فسادی گروہوں کا خاتمہ فرمایا ہے۔ ہر بڑا فرعون جو آتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے مقابل کسی موسیٰ کو کھڑا کر دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر سرکش اور فسادی کے لیے کوئی نہ کوئی علاج تجویز کیا ہوا ہے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٥١﴾﴾ ”لیکن اللہ تعالیٰ تو تمام جہانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔“

آیت ۲۵۲ ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ﴾ ”یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپؐ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں حق کے ساتھ۔“

یہ قول گویا حضرت جبرائیلؑ کی طرف منسوب ہو گا۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپؐ کو سنا رہے ہیں حق کے ساتھ۔ یہ ایک بامقصد سلسلہ ہے۔

﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٥٢﴾﴾ ”اور یقیناً (اے محمد ﷺ) آپ (اللہ کے) رسولوں میں سے ہیں۔“

آیت ۲۵۳ ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۘ﴾ ”ان رسولوںؑ میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔“

یہ ایک بہت اہم اصول بیان ہو رہا ہے۔ یہ بات قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے کہ ”تفریق بین الرسل“ کفر ہے‘ جبکہ ”تفضیل“ قرآن سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اور اس اعتبار سے وہ دوسروں پر ممتاز ہے۔ چنانچہ جزوی فضیلتیں مختلف رسولوں کی ہو سکتی ہیں‘ البتہ کلی فضیلت تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام پر محمد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔

﴿مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ ”ان میں سے وہ بھی تھے جن سے اللہ نے کلام فرمایا“

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا خاص پہلو ہے۔

﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ﴾ ''اور بعض کے درجات (کسی اور اعتبار سے) بڑھا دیے۔''

﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ﴾ ''اور ہم نے عیسیٰ ابن مریمؑ کو بڑے کھلے معجزے دیے''

﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ ''اور ان کی مدد فرمائی روح القدس (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کے ساتھ۔''

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد آنے والے آپس میں نہ لڑتے جھگڑتے''

یعنی نہ تو یہودیوں کی آپس میں جنگیں ہوتیں' نہ یہودیوں اور نصرانیوں کی لڑائیاں ہوتیں' اور نہ ہی نصرانیوں کے فرقے ایک دوسرے سے لڑتے۔

﴿مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ ''اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح تعلیمات آ چکی تھیں''

﴿وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا﴾ ''لیکن انہوں نے اختلاف کیا''

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾ ''پھر کوئی تو اُن میں سے ایمان لایا اور کوئی کفر پر اڑا رہا۔''

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے۔''

یعنی اگر اللہ تعالیٰ جبراً تکوینی طور پر ان پر لازم کر دیتا تو وہ اختلاف نہ کرتے اور آپس میں جنگ و جدال سے باز رہتے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۲۵۳)﴾ ''لیکن اللہ تو کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس حکمت پر بنایا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی آزمائش ہے۔ چنانچہ آزمائش کے لیے اُس نے انسان کو آزادی دی ہے۔ تو جو شخص غلط راستے پر جانا چاہتا ہے اسے بھی آزادی ہے اور جو صحیح راستے پر آنا چاہے اسے بھی آزادی ہے۔

آیات ۲۵۴ تا ۲۵۷

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۵۴) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۲۵۵) لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۵۶) اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵۷)﴾

تقریباً دو رکوعوں پر مشتمل طالوت اور جالوت کی جنگ کے واقعات ہم پڑھ چکے ہیں اور اب گویا غزوۂ بدر کے لیے ذہنی اور نفسیاتی تیاری ہو رہی ہے۔ غزوات کے لیے جہاں سرفروشی کی ضرورت ہے وہاں انفاقِ مال بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ اب یہاں بڑے زوردار انداز میں انفاقِ مال کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ البقرۃ کے نصف آخر میں چار مضامین تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ یعنی انفاقِ مال' قتال' عبادات اور معاملات۔ یہ گویا چار ڈوریاں ہیں جو اِن بائیس رکوعوں کے اندر تانے بانے کی طرح گتھی ہوئی ہیں۔

آیت ۲۵۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ﴾ ''اے اہل ایمان! خرچ کرو اُس میں سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آ دھمکے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی' نہ کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی شفاعت مفید ہوگی۔''

﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۵۴)﴾ ''اور جو انکار کرنے والے ہیں وہی تو ظالم ہیں۔''

یہاں کافر سے مراد اصطلاحی کافر نہیں' بلکہ معنوی کافر ہیں' یعنی اللہ کے حکم کا انکار کرنے والے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے اس حکم انفاق کی تعمیل نہیں کرتا' دیکھتا ہے کہ دین مغلوب ہے اور اس کو غالب کرنے کی جدوجہد ہو رہی ہے' اس کے کچھ تقاضے ہیں' اس کی مالی ضرورتیں ہیں اور اللہ نے اسے مقدرت دی ہے کہ اس میں خرچ کر سکتا ہے لیکن نہیں کرتا' وہ ہے اصل کافر۔

اس کے بعد اب وہ آیت آ رہی ہے جو ازروئے فرمانِ نبوی ﷺ قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت ہے' یعنی ''آیۃ الکرسی''۔ اس کا نام بھی معروف ہے۔ میں نے آپ کو سورۃ البقرۃ میں آنے والے حکمت کے بڑے بڑے موتی اور بڑے بڑے پھول گنوائے ہیں' مثلاً آیۃ الآیات' آیۃ البر' آیۃ الاختلاف' اور اب یہ آیۃ الکرسی ہے جو توحید کے عظیم ترین خزانوں میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے تمام آیاتِ قرآنی کی سردار قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامٌ وَاِنَّ سَنَامَ الْقُرْآنِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ' وَفِيْهَا آيَةٌ هِيَ سَيِّدَةُ آيِ الْقُرْآنِ' هِيَ آيَةُ الْكُرْسِيِّ)) (۳۲)

''ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور یقیناً قرآن حکیم کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے' اس میں ایک آیت ہے جو آیاتِ قرآنی کی سردار ہے' یہ آیۃ الکرسی ہے۔''

جس طرح آیۃ البر اور سورۃ العصر میں ایک نسبت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور نجات کی ساری کی ساری شرائط ایک چھوٹی سی سورۃ میں جمع کر دیں: ﴿وَالْعَصْرِ (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ (۲) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳)﴾ لیکن اس کی تفصیل ایک آیت میں بیان ہوئی ہے اور وہ آیۃ البر ہے۔ چنانچہ ہم نے مطالعۂ قرآن حکیم کا جو منتخب نصاب مرتب کیا ہے اُس میں پہلا درس سورۃ العصر کا ہے اور دوسرا آیۃ البر کا ہے۔ یہی نسبت

آیۃ الکرسی اور سورۃ الاخلاص میں ہے۔سورۃ العصر ایک مختصر سی سورت ہے جبکہ آیۃ البر ایک طویل آیت ہے۔اسی طرح سورۃ الاخلاص چار آیات پر مشتمل ایک چھوٹی سی سورت ہے اور یہ آیۃ الکرسی ایک طویل آیت ہے۔سورۃ الاخلاص توحید کا عظیم ترین خزانہ ہے اور توحید کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین سورت ہے‘ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسے ثلثِ قرآن قرار دیا ہے‘ جبکہ توحید اور خاص طور پر توحید فی الصفات کے موضوع پر قرآن کریم کی عظیم ترین آیت یہ آیۃ الکرسی ہے۔

آیت ۲۵۵ ﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ ج﴾ ”اللہ وہ معبودِ برحق ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔“

﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ج﴾ ”وہ زندہ ہے‘ سب کا قائم رکھنے والا ہے۔“

وہ از خود اور با خود زندہ ہے۔اس کی زندگی مستعار نہیں ہے۔اس کی زندگی ہماری زندگی کی مانند نہیں ہے‘ جس کے بارے میں بہادر شاہ ظفر نے کہا تھا ؎

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں!

اللہ تعالیٰ کی زندگی ”حیاتِ مستعار“ نہیں ہے‘ وہ کسی کی دی ہوئی نہیں ہے۔اس کی زندگی میں کوئی ضعف‘ کوئی کمزوری اور کوئی احتیاج نہیں ہے۔وہ خود اپنی جگہ زندہ و جاوید ہستی ہے اور باقی ہر شے کا وجود اس کے حکم سے قائم ہے۔وہ ”اَلْقَیُّوْمُ“ ہے۔اُس کے اِذن کے بغیر کوئی شے قائم نہیں ہے۔سورۃ الاخلاص میں اللہ تعالیٰ کے لیے دو الفاظ ”اَلْاَحَدُ“ اور ”اَلصَّمَدُ“ آئے ہیں۔وہ اپنی جگہ ”اَلْاَحَدُ“ ہے لیکن باقی پوری کائنات کے لیے ”اَلصَّمَدُ“ ہے۔اسی طرح وہ از خود ”اَلْحَیُّ“ ہے اور باقی پوری کائنات کے لیے ”اَلْقَیُّوْمُ“ ہے۔

﴿لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ط﴾ ”نہ اس پر اونگھ غالب آتی ہے نہ نیند۔“

﴿لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط﴾ ”جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُسی کا ہے۔“

ہر شے کی ملکیتِ تامہ اور ملکیتِ حقیقی اُسی کی ہے۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط﴾ ”کون ہے وہ جو شفاعت کر سکے اس کے پاس کسی کی مگر اس کی اجازت سے!“

سورۃ البقرۃ میں قبل ازیں تین مرتبہ قیامت کے روز کسی شفاعت کا دوٹوک انداز میں انکار (categorical denial) کیا گیا ہے کہ کوئی شفاعت نہیں! یہاں بھی بہت ہی جلالی انداز اختیار کیا گیا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ﴾ یعنی کس کی یہ حیثیت ہے‘ کس کا یہ مقام ہے‘ کس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی حیثیت کی بنیاد پر اللہ کے حضور کسی کی شفاعت کر سکے؟ ﴿اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط﴾ ہاں جس کے لیے اللہ اجازت دے دے! یہاں پہلی مرتبہ استثناء کے ساتھ شفاعت کا ذکر آیا ہے‘ ورنہ سورۃ البقرۃ کے چھٹے رکوع کی دوسری آیت میں ہم الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿وَّلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ﴾ ”اور نہ (اُس روز) کسی کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی“۔اسی طرح پندرہویں رکوع کی دوسری آیت میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَّلَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ﴾ ”اور نہ اُس کو کسی کی شفاعت ہی فائدہ دے گی“۔اور اب اس رکوع کی پہلی آیت میں آ چکا ہے: ﴿وَلَا شَفَاعَۃٌ﴾ ”اور نہ کوئی شفاعت مفید ہوگی“۔لیکن یہاں ایک استثناء بیان کیا جا رہا ہے کہ جس کو اللہ کی طرف سے اِذنِ شفاعت حاصل ہوگا وہ اُس کے حق میں شفاعت کر سکے گا جس کے لیے اِذن ہوگا۔یہ ذرا باریک مسئلہ ہے کہ شفاعتِ حقہ کیا ہے اور شفاعتِ باطلہ کیا ہے۔دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران اس پر تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی جاسکتی۔اس پر میں اپنے تفصیلی درس ریکارڈ کرا چکا ہوں☆۔

﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ج﴾ ”وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔“

عام طور پر دنیا میں ہم کسی کی سفارش کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بھئی میں اس شخص کو بہتر جانتا ہوں‘ اصل میں یہ جیسا کچھ نظر آتا ہے ویسا نہیں ہے‘ اس کے بارے میں جو معلومات آپ تک پہنچی ہیں وہ مبنی برحقیقت نہیں ہیں‘ اصل حقائق کچھ اور ہیں‘ وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔یہ بات اللہ کے سامنے کون کہہ سکتا ہے؟ جبکہ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے۔

﴿وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج﴾ ”اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔“

باقی ہر ایک کے پاس جو علم ہے وہ اللہ کا دیا ہوا‘ عطائی علم ہے۔بڑے سے بڑے ولی‘ بڑے سے بڑے رسول اور بڑے سے بڑے فرشتے کا علم بھی محدود ہے۔فرشتوں کا قول ﴿لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ ہم چوتھے رکوع میں پڑھ آئے ہیں۔

﴿وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج﴾ ”اس کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو محیط ہے۔“

یہاں کرسی کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ایک تو یہ کہ اس کا اقتدار‘ اس کی قدرت اور اس کا اختیار (Authority) پوری کائنات کے اوپر حاوی ہے۔نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار کی علامت کے طور پر واقعتاً کوئی مجسم شے بھی ہو جس کو ہم کرسی کہہ سکیں۔اللہ تعالیٰ کے عرش اور کرسی کے بارے میں یہ دونوں باتیں ذہن میں رکھیں۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی کوئی مجسم حقیقت ہو جو ہمارے ذہن اور تخیل سے ماوراء ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے استعارہ مراد ہو کہ اس کا اختیار اور اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔

﴿وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ج﴾ ”اور اس پر گراں نہیں گزرتی ان دونوں کی حفاظت۔“

آسمانوں اور زمین کی حفاظت اور اِن کا تھامنا اُس پر ذرا بھی گراں نہیں اور اس سے اس پر کوئی تکان طاری نہیں ہوتی۔

﴿وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۲۵۵﴾ ”اور وہ بلند و بالا (اور) بڑی عظمت والا ہے۔“

یہ آیۃ الکرسی ہے جو تمام آیاتِ قرآنی کی سردار اور توحیدِ الٰہی کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔اس کے بعد آنے والی دو آیات بھی حکمت اور فلسفۂ دین کے اعتبار سے بڑی عظیم آیات ہیں۔

آیت ۲۵۶ ﴿لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قف﴾ ”دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔“

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔اسلام میں کسی فرد کو جبراً مسلمان بنانا

حرام ہے۔ لیکن اس آیت کا یہ مطلب نکال لینا کہ نظامِ باطل کو ختم کرنے کے لیے بھی کوئی طاقت استعمال نہیں ہوسکتی' پرلے درجے کی حماقت ہے۔ نظامِ باطل ظلم پر مبنی ہے اور یہ لوگوں کا استحصال کر رہا ہے۔ یہ اللہ اور بندوں کے درمیان حجاب اور آڑ بن گیا ہے۔ لہٰذا نظامِ باطل کو طاقت کے ساتھ ختم کرنا مسلمان کا فرض ہے۔ اگر طاقت موجود نہیں ہے تو طاقت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے' لیکن جس مسلمان کا دل نظامِ باطل کو ختم کرنے کی آرزو اور ارادے سے خالی ہے اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ طاقت اور جبر نظامِ باطل کو ختم کرنے پر صرف کیا جائے گا' کسی فرد کو مجبوراً مسلمان نہیں بنایا جائے گا۔ یہ ہے اصل میں اس آیت کا مفہوم۔

﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ﴾ ''ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔''

جتنی بھی کجیاں ہیں' غلط راستے ہیں' شیطانی پگڈنڈیاں ہیں صراطِ مستقیم کو ان سے بالکل مبرہن کر دیا گیا ہے۔

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾ ''تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے''

دیکھئے' اللہ پر ایمان لانے سے پہلے طاغوت کا انکار ضروری ہے۔ جیسے کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ'' میں پہلے ہر اِلٰہ کی نفی ہے اور پھر اللہ کا اثبات ہے۔ طاغوت طَغٰی سے ہے' یعنی سرکش۔ تو جس نے اپنی حاکمیت کا اعلان کیا وہ طاغوت ہے' جس نے غیر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا وہ بھی طاغوت ہے اور غیر اللہ کی حاکمیت کے تحت بننے والے سارے ادارے طاغوت ہیں' خواہ وہ کتنے ہی خوشنما ادارے ہوں۔ ''عدلیہ'' کے نام سے ایک ادارہ اگر اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کر رہا' کچھ اور لوگوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے کر رہا ہے تو وہ طاغوت ہے۔ ''مقنّنہ'' کا ادارہ اگر اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق قانون سازی نہیں کر رہا تو وہ بھی طاغوت ہے۔ جو کوئی بھی اللہ کے حدودِ بندگی سے تجاوز کرتا ہے وہ طاغوت ہے۔ دریا جب اپنی حدوں سے باہر نکلتا ہے تو یہ طغیانی ہے: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

طَغٰی اور بَغٰی دونوں بڑے قریب کے الفاظ ہیں' جن کا مفہوم طغیانی اور بغاوت ہے۔ فرمایا کہ ''جو کوئی کفر کرے طاغوت کے ساتھ۔''

﴿وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ﴾ ''اور پھر اللہ پر ایمان لائے''

طاغوت سے دوستی اور اللہ پر ایمان دونوں چیزیں یکجا نہیں ہوسکتیں۔ اللہ کے دشمنوں سے بھی یارانہ ہو اور اللہ کے ساتھ وفاداری کا دعویٰ بھی ہو یہی تو منافقت ہے۔ جبکہ اسلام تو ﴿حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ کے مصداق کامل یکسوئی کے ساتھ اطاعت شعاری کا مطالبہ کرتا ہے۔

﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ﴾ ''تو اُس نے بہت مضبوط حلقہ تھام لیا۔''

جس شخص نے یہ کام کر لیا کہ طاغوت کی نفی کی اور اللہ پر ایمان لایا اس نے ایک مضبوط کُنڈا تھام لیا۔ یوں سمجھئے اگر کوئی شخص سمندری جہاز کے عرشے سے سمندر میں گر جائے' اسے تیرنا بھی نہ آتا ہو اور کسی طرح ہاتھ پیر مار کر وہ جہاز کے کسی کُنڈے کو تھام لے تو اب وہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی اسی سے وابستہ ہے' اب میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ وہ کُنڈا اگر کمزور ہے تو اس کا سہارا نہیں بن سکے گا اور اس کے وزن سے ہی اکھڑ جائے گا یا ٹوٹ جائے گا' لیکن اگر وہ کُنڈا مضبوط ہے تو وہ اس کی زندگی کا ضامن بن جائے گا۔ یہاں فرمایا کہ طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لانے والے شخص نے بہت مضبوط کُنڈے پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔

﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ﴾ ''جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔''

کبھی علیحدہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ بہت مضبوط سہارا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ایک خطبہ میں یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں: ((وَاَوْثَقُ الْعُرٰى كَلِمَةُ التَّقْوٰى)) [۳۳] یعنی تمام کنڈوں میں سب سے مضبوط کنڈا تقویٰ کا کنڈا ہے۔ لہٰذا اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی ضرورت ہے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ ''اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

آیت ۲۵۷ ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ﴾ ''اللہ ولی ہے اہلِ ایمان کا''

ایمان درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان ایک دوستی کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ یہ ولایتِ باہمی یعنی دو طرفہ دوستی ہے۔ ایک طرف مطلوب یہ ہے کہ بندہ اللہ کا ولی بن جائے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴾ (یونس) ''یاد رکھو' اللہ کے دوستوں کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا''۔ دوسری طرف اللہ بھی اہل ایمان کا ولی ہے' یعنی دوست ہے' پشت پناہ ہے' مددگار ہے' کارساز ہے۔

﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ﴾ ''وہ انہیں نکالتا رہتا ہے تاریکیوں سے نور کی طرف۔''

آپ نوٹ کریں گے کہ قرآن میں ''نُور'' ہمیشہ واحد آتا ہے۔ ''اَنوار'' کا لفظ قرآن میں نہیں آیا' اس لیے کہ نور ایک حقیقت واحدہ ہے۔ لیکن ''ظُلُمٰت'' ہمیشہ جمع میں آتا ہے' اس لیے کہ تاریکی کے shades مختلف ہیں۔ ایک بہت گہری تاریکی ہے' ایک ذرا اُس سے کم ہے' پھر اُس سے کمتر ہے۔ کفر' شرک' الحاد' مادہ پرستی' لاادریت (Agnosticism) وغیرہ مختلف قسم کی تاریکیاں ہیں۔ تو جتنے بھی غلط فلسفے ہیں' جتنے بھی غلط نظریات ہیں' جتنی بھی عمل کی غلط راہیں ہیں' ان سب کے اندھیاروں سے نکال کر اللہ اہلِ ایمان کو ایمان کی روشنی کے اندر لاتا رہتا ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗــــُٔـھُمُ الطَّاغُوْتُ﴾ ''اور (ان کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا' اُن کے اولیاء (پشت پناہ' ساتھی اور مددگار) طاغوت ہیں۔''

﴿يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ﴾ ''وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔''

اگر کہیں نور کی تھوڑی بہت رمق انہیں ملی بھی تھی تو اس سے انہیں محروم کر کے انہیں تاریکیوں کی طرف دھکیلتے رہتے ہیں۔

﴿اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ ''یہی لوگ ہیں آگ والے' یہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِکَ الْمُؤْمِنِیْنَ' اَللّٰھُمَّ اَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ آمین یا ربّ العالمین!
اس کے بعد حضرت ابراہیم اور حضرت عزیر علیہما السلام کی زندگی کے کچھ واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔

آیات ۲۵۸ تا ۲۶۰

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ۭ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵۸﴾ اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا ۚ فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ ۭ قَالَ کَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَۃَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّہْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ وَلِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُھَا ثُمَّ نَکْسُوْھَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

آیت ۲۵۸ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ ۘ﴾ ''کیا تم نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جس نے حجت بازی کی تھی ابراہیمؑ سے اس وجہ سے کہ اللہ نے اسے بادشاہی دی ہوئی تھی۔''
یہ بابل (عراق) کا بادشاہ نمرود تھا۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ نمرود اصل میں لقب تھا' کسی کا نام نہیں تھا۔ جیسے فرعون (ج فراعنہ) مصر کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا اسی طرح نمرود (ج نمارده) بابل (عراق) کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ''اُر'' میں ہوئی تھی جو بابل (Babylonia) کا ایک شہر تھا اور وہاں نمرود کی بادشاہت تھی۔ جیسے فرعون نے مصر میں اپنی بادشاہت اور اپنی خدائی کا دعویٰ کیا تھا اسی طرح کا دعویٰ نمرود کا بھی تھا۔ فرعون اور نمرود کا خدائی کا دعویٰ درحقیقت سیاسی بادشاہت اور اقتدار کا دعویٰ تھا کہ اختیارِ مطلق ہمارے ہاتھ میں ہے' ہم جس چیز کو چاہیں غلط قرار دے دیں اور جس چیز کو چاہیں صحیح قرار دے دیں۔ یہی اصل میں خدائی اختیار ہے جو انہوں نے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ تحلیل و تحریم اللہ تعالیٰ کا حق ہے' کسی شے کو حلال کرنے یا کسی شے کو حرام کرنے کا اختیار واحد اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور جس شخص نے بھی قانون سازی کا یہ اختیار اللہ کے قانون سے آزاد ہو کر اپنے ہاتھ میں لے لیا وہی طاغوت ہے' وہی شیطان ہے' وہی نمرود ہے' وہی فرعون ہے۔ ورنہ فرعون اور نمرود نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا تھا کہ یہ دنیا ہم نے پیدا کی ہے۔

﴿اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ۭ﴾ ''جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا ربّ تو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اُس نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔''
نمرود نے جیل سے سزائے موت کے دو قیدی منگوائے' ان میں سے ایک کی گردن وہیں اڑا دی اور دوسرے کی سزائے موت معاف کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہنے لگا کہ دیکھو' میں نے جس کو چاہا زندہ رکھا اور جس کو چاہا مار دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ یہ کٹ حجتی پر اترا ہوا ہے' اسے ایسا جواب دیا جانا چاہیے جو اُس کو چپ کرا دے۔
﴿قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ ''ابراہیمؑ نے کہا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے (اگر تو خدائی کا مدعی ہے) تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا''
﴿فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ۭ﴾ ''تو مبہوت ہو کر رہ گیا وہ کافر۔''
اب اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ یہ بات سن کر بھونچکا اور ششدر ہو کر رہ گیا۔
﴿وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵۸﴾﴾ ''اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔''
اللہ نے اسے راہ یاب نہیں کیا' لیکن وہ چپ ہو گیا' اُس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کا کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ اس کے بعد اس نے بت کدے کے پجاریوں کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دیا جائے۔

آیت ۲۵۹ ﴿اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا ۚ﴾ ''یا پھر جیسے کہ وہ شخص (اس کا واقعہ ذرا یاد کرو) جس کا گزر ہوا ایک بستی پر اور وہ اوندھی پڑی ہوئی تھی اپنی چھتوں پر۔''
تفاسیر میں اگرچہ اس واقعے کی مختلف تعبیرات ملتی ہیں' لیکن یہ دراصل حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ ہے جن کا گزر یروشلم شہر پر ہوا تھا جو تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ بابل (عراق) کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے ۵۸۶ ق م میں فلسطین پر حملہ کیا تھا اور یروشلم کو تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ اِس وقت بھی عراق اور اسرائیل کی آپس میں بدترین دشمنی ہے۔ یہ دشمنی درحقیقت ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ بخت نصر کے حملے کے وقت یروشلم بارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا۔ بخت نصر نے چھ لاکھ نفوس کو قتل کر دیا اور باقی چھ لاکھ کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا ہوا قیدی بنا کر لے گیا۔ یہ لوگ ڈیڑھ سو برس تک اسیری (captivity) میں رہے ہیں اور یروشلم اُجڑا رہا ہے۔ وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں بچا تھا۔ بخت نصر نے یروشلم کو اس طرح تباہ و برباد کیا تھا کہ کوئی دو اینٹیں سلامت نہیں چھوڑیں۔ اُس نے ہیکل سلیمانی کو بھی مکمل طور پر شہید کر دیا تھا۔ یہودیوں کے مطابق ہیکل کے ایک تہہ خانے میں ''تابوتِ سکینہ'' بھی تھا اور وہاں ان کے ربائی بھی موجود تھے۔ ہیکل مسمار ہونے پر وہیں ان کی موت واقع ہوئی اور تابوتِ سکینہ بھی وہیں دفن ہو گیا۔ تو جس زمانے میں یہ بستی اُجڑی ہوئی تھی' حضرت عزیر علیہ السلام کا اُدھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں اور کوئی عمارت سلامت نہیں۔
﴿قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا ۚ﴾ ''اُس نے کہا کہ اللہ اس بستی کو' اس کے اس طرح مردہ اور برباد ہو جانے

کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟''

ان کا یہ سوال اظہارِ حیرت کی نوعیت کا تھا کہ اس طرح اُجڑی ہوئی بستی میں دوبارہ کیسے احیا ہو سکتا ہے؟ دوبارہ کیسے اس میں لوگ آ کر آباد ہو سکتے ہیں؟ اتنی بڑی تباہی و بربادی کہ کوئی متنفس باقی نہیں' کوئی دو اینٹیں سلامت نہیں!

﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ ''تو اللہ نے اس پر موت وارد کر دی سو برس کے لیے اور پھر اس کو اٹھایا۔''

﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتَ﴾ ''پوچھا کتنا عرصہ یہاں رہے ہو؟''

﴿قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ''کہنے لگا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔''

ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے تھوڑی دیر کے لیے سویا تھا' شاید ایک دن یا دن کا کچھ حصہ میں یہاں رہا ہوں۔

﴿قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا بلکہ تم پورے سو سال اس حال میں رہے ہو''

﴿فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ ''تو ذرا تم اپنے کھانے اور اپنے مشروب کو (جو سفر میں تمہارے ساتھ تھا) دیکھو' ان کے اندر کوئی بساند پیدا نہیں ہوئی۔''

ان میں سے کوئی شے گلی سڑی نہیں' ان کے اندر کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔

﴿وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ﴾ ''اور (دوسری طرف) اپنے گدھے کو دیکھو (ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں)''

حضرت عزیر علیہ السلام کی سواری کا گدھا اس عرصے میں بالکل ختم ہو چکا تھا' اس کی بوسیدہ ہڈیاں ہی باقی رہ گئی تھیں' گوشت گل سڑ چکا تھا۔

﴿وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ ''اور تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں''

یعنی اے عزیرؑ! ہم نے تو خود تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنانا ہے' اس لیے ہم تمہیں اپنی یہ نشانی دکھا رہے ہیں تا کہ تمہیں دوبارہ اٹھائے جانے پر یقین کامل حاصل ہو۔

﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ ''اور اب ان ہڈیوں کو دیکھو' کس طرح ہم انہیں اٹھاتے ہیں''

﴿ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ ''پھر (تمہاری نگاہوں کے سامنے) ان کو گوشت پہناتے ہیں۔''

چنانچہ حضرت عزیرؑ کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گدھے کی ہڈیاں جمع ہو کر اس کا ڈھانچہ کھڑا ہو گیا اور پھر اس پر گوشت بھی چڑھ گیا۔

﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ﴾ ''پس جب اس کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی''

حضرت عزیر علیہ السلام نے بچشم سر ایک مُردہ جسم کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کر لیا۔

﴿قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٥٩﴾﴾ ''وہ پکار اٹھا کہ میں نے پوری طرح جان لیا (اور مجھے یقین کامل حاصل ہو گیا) کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔''

انہیں یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اس اُجڑی ہوئی بستی کو بھی دوبارہ آباد کر سکتا ہے' اس کی آبادی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے نقیب کی حیثیت حاصل ہے۔ بابل کی اسارت کے دوران یہود اخلاقی زوال کا شکار تھے۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے متذکرہ بالا مشاہدات کرا دیے تو آپؑ نے وہاں جا کر یہود کو دین کی تعلیم دی اور ان کے اندر روحِ دین کو بیدار کیا۔ اس کے بعد ایران کے بادشاہ کیخورس☆ (Cyrus) نے جب بابل (عراق) پر حملہ کیا تو یہودیوں کو اسارت (captivity) سے نجات دی اور انہیں دوبارہ فلسطین میں جا کر آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ اس طرح یروشلم کی تعمیر نو ہوئی اور یہ بستی ۱۳۶ سال بعد دوبارہ آباد ہوئی۔ پھر یہودیوں نے وہاں ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا جس کو وہ معبد ثانی (Second Temple) کہتے ہیں۔ پھر یہ ہیکل ۷۰ عیسوی میں رومن جنرل ٹائٹس کے ہاتھوں تباہ ہو گیا اور اب تک دوبارہ تعمیر نہیں ہو سکا۔ دو ہزار برس ہونے کو آئے ہیں کہ ان کا کعبہ زمین بوس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر کے یہودیوں کے دلوں میں آگ سی لگی ہوئی ہے اور وہ مسجد اقصیٰ کو مسمار کر کے وہاں ہیکل سلیمانی (معبد ثالث) تعمیر کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اس کے نقشے بھی تیار ہو چکے ہیں۔ بس کسی دن کوئی ایک دھماکہ ہو گا اور خبر آ جائے گی کہ کسی جنونی (fanatic) نے وہاں جا کر بم رکھ دیا تھا' جس کے نتیجے میں مسجد اقصیٰ شہید ہو گئی ہے۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ ایک جنونی یہودی ڈاکٹر نے مسجد الخلیل میں ۷۰ مسلمانوں کو شہید کر کے خود بھی خودکشی کر لی تھی۔ اسی طرح کوئی جنونی یہودی مسجد اقصیٰ میں بم نصب کر کے اس کو گرا دے گا اور پھر یہودی کہیں گے کہ جب مسجد مسمار ہو ہی گئی ہے تو اب ہمیں یہاں ہیکل تعمیر کرنے دیں۔ جیسے ایودھیا میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہندوؤں کا موقف تھا کہ جب مسجد گر ہی گئی ہے تو اب یہاں پر ہمیں رام مندر بنانے دو! بہرحال یہ حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ تھا۔ اب اسی طرح کا ایک معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مشاہدہ ہے۔

آیت ۲۶۰ ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ نے بھی کہا تھا پروردگار! ذرا مجھے مشاہدہ کرا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟''

﴿قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کیا تم (اس بات پر) ایمان نہیں رکھتے؟''

﴿قَالَ بَلٰى﴾ ''کہا کیوں نہیں! (ایمان تو رکھتا ہوں)''

﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾ ''لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔''

یہ تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام کا معاملہ ہے کہ انہیں عین الیقین اور حق الیقین کے درجے کا ایمان عطا کیا جاتا ہے۔ انہیں چونکہ ایمان اور یقین کی ایک ایسی بھٹی (furnace) بنانا ہوتا ہے کہ جس سے ایمان اور یقین دوسروں میں سرایت کرے' تو ان کے ایمان و یقین کے لیے ان کو ایسے مشاہدات کروا دیے جاتے ہیں کہ ایمان ان کے لیے صرف ایمان بالغیب نہیں رہتا بلکہ وہ ایمان بالشہادۃ بھی ہو جاتا ہے۔ سورۃ الانعام میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے نظامِ حکومت کا مشاہدہ کرایا تا کہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں آسمانوں پر لے جایا گیا کہ

وہ ہر شے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ان مشاہدات سے انبیاء کو ان ایمانی حقائق پر یقین کامل ہو جاتا ہے جن کی وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ گویا وہ خود ایمان اور یقین کی ایک بھٹی بن جاتے ہیں۔

﴿قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ ''فرمایا' اچھا تو چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے ساتھ ہلا لو' انہیں اپنے ساتھ اس طرح مانوس کر لو کہ وہ تمہاری آواز سن کر تمہارے پاس آ جایا کریں۔

﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ ''پھر ان کے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو''

﴿ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ﴾ ''پھر ان کو پکارو تو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔''

اس کی تفصیل میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاروں پرندوں کے سر' دھڑ' ٹانگیں اور ان کے پر علیحدہ علیحدہ کیے۔ پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر' دوسرے پہاڑ پر چاروں کے دھڑ' تیسرے پہاڑ پر چاروں کی ٹانگیں اور چوتھے پہاڑ پر چاروں کے پر رکھ دیے۔ اس طرح انہیں مختلف اجزاء میں تقسیم کر دیا۔ پھر انہیں پکارا تو ان کے اجزاء مجتمع ہو کر چاروں پرندے اپنی سابقہ ہیئت میں زندہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس دوڑتے ہوئے آ گئے۔

﴿وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦٠﴾﴾ ''اور (اس بات کو یقین کے ساتھ) جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔''

آیات ۲۶۱ تا ۲۷۳

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ
وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ
مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾ قَوْلٌ
مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا
صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ
صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦٤﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ
بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾
اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ
الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا
لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٢٦٧﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا
يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ
اَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ
عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ
وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٢﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ
الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْــَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ
عَلِيْمٌ ﴿٢٧٣﴾﴾

اب جو دو رکوع آ رہے ہیں' ان کا موضوع انفاق فی سبیل اللہ ہے' اور اس موضوع پر یہ قرآن مجید کا **ذروۃ السنام** (climax) ہے۔ ان کے مطالعہ سے پہلے یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے اپنا مال خرچ کرنے کے لیے دین میں کئی اصطلاحات ہیں۔ سب سے پہلی ''اِطعامُ الطّعام'' (کھانا کھلانا) ہے: ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴿٨﴾﴾ (الدھر) دوسری اصطلاح ایتائے مال ہے: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ ...... الخ﴾ (البقرۃ:۱۷۷) پھر اس سے آگے صدقہ' زکوٰۃ' انفاق اور قرضِ حسنہ جیسی اصطلاحات آتی ہیں۔ یہ پانچ چھ اصطلاحات (terms) ہیں' لیکن ان کے اندر ایک تقسیم ذہن میں رکھیے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے مال خرچ کرنے کی دو بڑی بڑی مدیں ہیں۔ ایک مد ابنائے نوع پر خرچ کرنے کی ہے۔ یعنی قرابت دار' غرباء' یتامیٰ' مساکین' محتاج اور بیواؤں پر خرچ کرنا۔ یہ آپ کے معاشرے کے اجزاء ہیں' آپ کے بھائی بند ہیں' آپ کے عزیز و اقرباء ہیں۔ ان کے لیے خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور اس کا اجر ملے گا۔ یہ بھی گویا آپ نے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خرچ کیا۔ جبکہ دوسری مد ہے عین اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا۔

قرآن حکیم میں انفاق اور قرضِ حسنہ کی اصطلاحیں اس دوسری مد کے لیے آتی ہیں اور پہلی مد کے لیے اطعام الطعام' ایتائے مال' صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ کی اصطلاحات ہیں۔ چنانچہ انفاقِ مال یا انفاق فی سبیل اللہ سے مراد ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا' اللہ کے دین کی دعوت کو عام کرنے اور اللہ کی کتاب کے پیغام کو عام کرنے کے لیے خرچ کرنا۔ اللہ کے دین کی دعوت کو اس طرح ابھارنا کہ باطل کے ساتھ زور آزمائی کرنے والی ایک طاقت پیدا ہو جائے' ایک جماعت وجود میں آئے۔

اس جماعت کے لیے ساز و سامان فراہم کرنا تاکہ غلبۂ دین کے ہر مرحلے کے جو تقاضے اور ضرورتیں ہیں وہ پوری ہو سکیں' اس کام میں جو مال صرف ہو گا وہ ہے انفاق فی سبیل اللہ یا اللہ کے ذمہ قرضِ حسنہ۔ تو یہاں اصل میں اس انفاق کی بات ہو رہی ہے ۔ عام طور پر فی سبیل اللہ کا مفہوم بہت عام سمجھ لیا جاتا ہے اور پانی کی کوئی ''سبیل'' بنا کر اسے بھی ''فی سبیل اللہ'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے' وہ بھی سبیل تو ہے' نیکی کا وہ بھی راستہ ہے' سبیل اللہ ہے' لیکن ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا مفہوم بالکل اور ہے۔ فقراء و مساکین اور اہل حاجت کے لیے صدقات و خیرات ہیں۔ زکوٰۃ بھی اصلاً غریبوں کا حق ہے' لیکن اس میں بھی ایک مد ''فی سبیل اللہ'' کی رکھی گئی ہے۔ اگر آپ کے عزیز و اقارب اور قرب و جوار میں اہل حاجت ہیں' غرباء ہیں تو صدقہ و زکوٰۃ میں ان کا حق فائق ہے' پہلے ان کو دیجیے۔ اس کے بعد اس میں سے جو بھی ہے وہ دین کے کام کے لیے لگائیے۔ جب دین یتیمی کی حالت کو آ گیا ہو تو سب سے بڑا یتیم دین ہے۔ اور آج واقعتاً دین کی یہی حالت ہے۔ اب ہم ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

آیت ۲۶۱ ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ﴾ ''مثال ان کی جو اپنے مال اللہ کی راہ میں (اللہ کے دین کے لیے) خرچ کرتے ہیں ایسے ہے جیسے ایک دانہ کہ اُس سے سات بالیاں (خوشے) پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔''

اس طرح ایک دانے سے سات سو دانے وجود میں آ گئے۔ یہ اُس اضافے کی مثال ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے مال کے اجر و ثواب میں ہو گا۔ جو کوئی بھی اللہ کے دین کے لیے اپنا مال خرچ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے مال میں اضافہ کرے گا' اس کو جزا دے گا اور اپنے یہاں اس اجر و ثواب کو بڑھاتا رہے گا۔

﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ ''اللہ جس کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔''

یہ سات سو گنا اضافہ تو تمہیں تمثیلاً بتایا ہے' اللہ اس سے بھی زیادہ اضافہ کرے گا جس کے لیے چاہے گا۔ صرف سات سو گنا نہیں' اور بھی جتنا چاہے گا بڑھاتا چلا جائے گا۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۶۱﴾ ''اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں اور اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔

آیت ۲۶۲ ﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں''

﴿ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ﴾ ''پھر جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں''

ان کا طرزِ عمل یہ نہیں ہوتا کہ دیکھئے جی' میں نے اُس وقت اتنا چندہ دیا تھا' معلوم ہوا کہ میرا حق زیادہ ہے' ہم چندے زیادہ دیتے ہیں تو پھر بات بھی تو ہماری مانی جانی چاہیے! یا اگر کوئی شخص اللہ کے دین کے کام میں لگا ہوا ہے اور آپ اس کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں تاکہ وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو کر اپنا پورا وقت دین کی خدمت میں لگائے' لیکن اگر کہیں آپ نے اس کو جتا بھی دیا' اس پر احسان بھی رکھ دیا' کوئی تکلیف دہ کلمہ کہہ دیا' کوئی دلآزاری کی بات کہہ دی تو آپ کا جو اجر و ثواب تھا وہ صفر ہو جائے گا۔

﴿لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۶۲﴾ ''ان کا اجر اُن کے ربّ کے پاس محفوظ ہے۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ کسی رنج و غم سے دوچار ہوں گے۔''

آیت ۲۶۳ ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ﴾ ''بھلی بات کہنا اور درگزر کرنا''

﴿خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ﴾ ''بہتر ہے اس خیرات سے جس کے بعد اذیت پہنچائی جائے۔''

اگر آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آ گیا ہے' کسی نے ہاتھ پھیلا دیا ہے تو اگر آپ اس کی مدد نہیں کر سکتے تو دلداری کا ایک کلمہ کہہ دیجیے' نرمی کے ساتھ جواب دے دیجیے' معذرت کر لیجیے۔ یا اگر کسی سائل نے آپ کے ساتھ درشت رویہ اختیار کیا ہے تو پھر بھی اسے ڈانٹئے نہیں: ﴿وَاَمَّا السَّاۗىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰﴾ (الضحیٰ) بلکہ درگزر سے کام لیجیے۔ یہ طرزِ عمل اس سے کہیں بہتر ہے کہ ضرورت مند کو کچھ دے تو دیا لیکن اس کے بعد اسے دو چار جملے بھی سنا دیے' اس کی دلآزاری بھی کر دی۔ تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

﴿وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝۲۶۳﴾ ''اللہ تعالیٰ غنی ہے اور حلیم ہے۔''

وہ بے نیاز بھی ہے اور بردبار بھی۔ اگر تم کسی کو کچھ دے رہے ہو تو اصل میں اللہ کو دے رہے ہو۔ اس ضمن میں ایک حدیث قدسی میں بڑی وضاحت آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے دن اللہ عزوجل فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری تیمارداری نہیں کی۔ وہ کہے گا: اے پروردگار! میں تیری تیمارداری کیسے کرتا جبکہ تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی تیمارداری نہیں کی؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی تیمارداری کرتا تو مجھے اس کے پاس موجود پاتا! —— اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا' تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ وہ کہے گا: اے میرے ربّ! میں تجھ کو کھانا کیسے کھلاتا جبکہ تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا' تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اس کھانے کو میرے پاس موجود پاتا! —— اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا' تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا: پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاتا جبکہ تو تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تھا' تو نے اس کو پانی نہیں پلایا تھا' کیا ایسا نہیں ہے کہ اگر تو اس کو پانی پلا دیتا تو اپنے اس عمل کو میرے پاس موجود پاتا!''(۳۴)

چنانچہ یاد رکھو کہ جو کچھ تم کسی ضرورت مند کو دے رہے ہو وہ درحقیقت اللہ کو دے رہے ہو' جو غنی ہے' جس نے تمہیں سب کچھ عطا کیا ہے۔ اور تمہارے طرزِ عمل کے باوجود بھی اگر وہ تم سے درگزر کر رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حلیم ہے' بردبار ہے۔ اگر تم اپنے دل سے اُتری ہوئی شے اللہ کے نام پر دیتے ہو' کوئی بےکار اور ردّی چیز اللہ کے نام پر دے دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی غیرت اگر اسی وقت جوش میں آ جائے تو تمہیں ہر نعمت سے محروم کر دے۔ وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے' لیکن نہیں کرتا' اس لیے کہ وہ حلیم ہے۔

آیت ۲۶۴ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی لا﴾ ''اے اہل ایمان! اپنے صدقات کو باطل نہ کرلو احسان جتلا کر اور کوئی اذیت بخش بات کہہ کر''

﴿کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ ''اُس شخص کی طرح جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لیے''

اگرچہ اپنا مال خرچ کر رہا ہے' لوگوں کو صدقات دے رہا ہے' بڑے بڑے خیراتی ادارے قائم کر دیے ہیں' لیکن یہ سب کچھ ریاکاری کے لیے' سرکار دربار میں رسائی کے لیے' کچھ اپنے ٹیکس بچانے کے لیے اور کچھ اپنی ناموری کے لیے ہے۔ یہ سارے کام جو ہوتے ہیں اللہ جانتا ہے کہ ان میں کس کی کیا نیت ہے۔

﴿وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط﴾ ''اور وہ ایمان نہیں رکھتا اللہ اور یومِ آخرت پر۔''

جو کوئی ریاکاری کر رہا ہے وہ حقیقت میں اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ ریا اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں' جیسا کہ یہ حدیث ہم متعدد بار پڑھ چکے ہیں:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (۳۵)

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اُس نے شرک کیا' اور جس نے دکھاوے کے لیے لوگوں کو صدقہ وخیرات دیا اُس نے شرک کیا۔''

﴿فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْہِ تُرَابٌ﴾ ''تو اس کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر کچھ مٹی (جم گئی) ہو''

اگر کسی چٹان پر مٹی کی تھوڑی سی تہہ جم گئی ہو اور وہاں آپ نے کچھ بیج ڈال دیے ہوں تو ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی فصل بھی اُگ آئے' لیکن وہ انتہائی ناپائیدار ہوگی۔

﴿فَاَصَابَہٗ وَابِلٌ فَتَرَکَہٗ صَلْدًا ط﴾ ''پھر اس پر زوردار بارش پڑے تو وہ اس کو بالکل صاف پتھر چھوڑ دے۔''

بارش کے ایک ہی زوردار چھینٹے میں چٹان کے اُوپر جمی ہوئی مٹی کی تہہ بھی بہہ گئی' آپ کی محنت بھی ضائع ہوگئی' آپ کا بیج بھی اکارت گیا اور آپ کی فصل بھی گئی۔ بارش سے دھل کر وہ چٹان اندر سے بالکل صاف اور چٹیل نکل آئی۔ یعنی سب کچھ گیا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاکاری کا یہی انجام ہوتا ہے کہ ہاتھ سے مال بھی دیا اور حاصل کچھ نہ ہوا۔ اللہ کے ہاں کسی اجر وثواب کا سوال ہی نہیں۔

﴿لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا ط﴾ ''ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔''

ایسے لوگ اپنے تئیں صدقہ وخیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔

﴿وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

وہ ناشکروں اور منکرینِ نعمت کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا اور انہیں بامراد نہیں کرتا۔

اگلی آیت میں فوری تقابل (simultaneous contrast) کے طور پر ان لوگوں کے لیے بھی مثال بیان کی جا رہی ہے جو واقعتاً اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی اُمید رکھتے ہوئے خلوص واخلاص سے خرچ کرتے ہیں۔

آیت ۲۶۵ ﴿وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ﴾ ''اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی رضا جوئی کے لیے''

﴿وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ﴾ ''اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے''

﴿کَمَثَلِ جَنَّۃٍ بِرَبْوَۃٍ﴾ ''اُس باغ کی مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو''

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ قدرتی باغ کا یہی تصور ہوتا تھا کہ ذرا اونچائی پر واقع ہے' اس کے دامن میں کوئی ندی بہہ رہی ہے جس سے خود بخود آب پاشی ہو رہی ہے اور وہ سیراب ہو رہا ہے۔

[قادیانیوں نے اسی لفظ ''ربوہ'' کے نام پر پاکستان میں اپنا شہر بنایا۔]

﴿اَصَابَھَا وَابِلٌ﴾ ''اب اگر اس باغ کے اوپر زوردار بارش برسے''

﴿فَاٰتَتْ اُکُلَھَا ضِعْفَیْنِ ج﴾ ''تو دوگنا پھل لائے۔''

﴿فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ط﴾ ''اور اگر زوردار بارش نہ بھی برسے تو ہلکی سی پھوار (ہی اس کے لیے کافی ہو جائے)۔''

﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۶۵﴾﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔''

لہٰذا تم دروں بینی (intro spection) کرتے رہا کرو کہ تم جو یہ مال خرچ کر رہے ہو واقعتاً خلوصِ دل اور اخلاصِ نیت کے ساتھ اللہ ہی کے لیے کر رہے ہو۔ کہیں غیر شعوری طور پر تمہارا کوئی اور جذبہ اس میں شامل نہ ہو جائے۔ چنانچہ اپنے گریبانوں میں جھانکتے رہو۔

آیت ۲۶۶ ﴿اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ لا﴾ ''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو' جس کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں''

اہل عرب کے نزدیک یہ ایک آئیڈیل باغ کا نقشہ ہے' جس میں کھجور کے درخت بھی ہوں اور انگور کی بیلیں بھی ہوں' پھر اس میں آب پاشی کا قدرتی انتظام ہو۔

﴿لَہٗ فِیْھَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ لا﴾ ''اس کے لیے اس باغ میں ہر طرح کے پھل ہوں''

﴿وَاَصَابَہُ الْکِبَرُ وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ صلے﴾ ''اور اس پر بڑھاپا طاری ہو جائے جبکہ اس کی اولاد ابھی ناتواں ہو۔''

﴿فَاَصَابَھَآ اِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ط﴾ ''اور عین اُس وقت اُس باغ پر ایک ایسا بگولا پھر جائے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جھلس کر رہ جائے؟''

یعنی ایک انسان ساری عمر یہ سمجھتا رہا کہ میں نے تو نیکیوں کے انبار لگائے ہیں' میں نے خیراتی ادارے قائم کیے' میں نے فاؤنڈیشن بنائی' میں نے مدرسہ قائم کیا' میں نے یتیم خانہ بنا دیا' لیکن جب اُس کا نامۂ اعمال پیش ہوگا تو اچانک اسے معلوم ہوگا

کہ یہ تو کچھ بھی نہ تھا۔ع ’’جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا!‘‘ بس بادِسموم کا ایک بگولا آیا اور سب کچھ جلا گیا۔ اس لیے کہ اس میں اخلاص تھا ہی نہیں‘ نیت میں کھوٹ تھا‘ اس میں ریا کاری تھی‘ لوگوں کو دکھانا مقصود تھا۔ پھر اس کا حال وہی ہوگا جس طرح کہ وہ بوڑھا اب کفِ افسوس مل رہا ہے جس کا باغ جل کر خاک ہوگیا اور اس کے کمسن بچے ابھی کسی لائق نہیں۔ وہ خود بوڑھا ہو چکا ہے اور اب دوبارہ باغ نہیں لگا سکتا۔ اس شخص کی مہلت عمر بھی ختم ہو چکی ہوگی اور سوائے کفِ افسوس ملنے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہ ہوگا۔

﴿کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾﴾ ’’اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرو۔‘‘

آیت ۲۶۷ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ﴾ ’’اے ایمان والو! اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو۔‘‘

اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا ہے‘ اللہ کے نام پر دینا ہے تو جو کچھ تم نے کمایا ہے اس میں سے اچھی چیز‘ پاکیزہ چیز‘ بہتر چیز نکالو۔

﴿وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪﴾ ’’اور اس میں سے خرچ کرو جو کچھ ہم نے نکالا ہے تمہارے لیے زمین سے۔‘‘

ظاہر بات ہے کہ زمین سے جو بھی نباتات باہر آ رہی ہیں ان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ چاہے کوئی چراگاہ ہے تو اس کے اندر جو ہریاول ہے وہ اللہ ہی نے پیدا کی ہے۔ کھیت کے اندر آپ نے محنت کی ہے‘ ہل چلایا ہے‘ بیج ڈالے ہیں‘ لیکن فصل کا اُگانا تو آپ کے اختیار میں نہیں ہے‘ یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ع ’پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟‘‘ چنانچہ فرمایا کہ جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اُس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو!

﴿وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْہُ تُنْفِقُوْنَ﴾ ’’اور اس میں سے ردّی مال کا ارادہ نہ کرو کہ اسے خرچ کردو!‘‘

ایسا نہ ہو کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ردّی اور ناکارہ مال چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو۔ مثلاً بھیڑ بکریوں کا گلہ ہے‘ اس میں سے تمہیں زکوٰۃ کے لیے بھیڑیں اور بکریاں نکالنی ہیں تو ایسا ہرگز نہ ہو کہ جو کمزور ہیں‘ ذرا لاغر ہیں‘ بیمار ہیں‘ نقص والی ہیں انہیں نکال کر گنتی پوری کردو۔ اسی طرح عشر نکالنا ہے تو ایسا نہ کرو کہ گندم کے جس حصے پر بارش پڑ گئی تھی وہ نکال دو۔ تیمّم کے معنی قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں۔

﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْہِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْہِ ؕ﴾ ’’اور تم ہرگز نہیں ہو گے اس کو لینے والے (اگر وہ شے تم کو دی جائے) اِلا یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔‘‘

ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم محتاج ہو جاؤ اور تمہیں ضرورت پڑ جائے‘ پھر اگر تمہیں کوئی ایسی چیز دے گا تو تم قبول نہیں کرو گے اِلاّ یہ کہ چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ احتیاج اس درجے کی ہو کہ نفیس یا خبیث جو شے بھی مل جائے چشم پوشی کرتے ہوئے اسے قبول کرلو۔ ورنہ آدمی اپنے طیبِ خاطر کے ساتھ ردّی شے قبول نہیں کرسکتا۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۲۶۷﴾﴾ ’’اور خوب جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے اور حمید ہے۔‘‘

یہاں ’’غنی‘‘ کا لفظ دوبارہ آیا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ تم کسی محتاج اور ضرورت مند کو دے رہے ہو‘ بلکہ یوں سمجھو کہ اللہ کو دے رہے ہو‘ جو غنی ہے‘ سب کی ضرورتیں پوری کرنے والا ہے اور حمید ہے‘ یعنی اپنی ذات میں خود محمود ہے۔ ایک تو کسی شے کی اچھائی یا حسن یا کمال ایسا ہوتا ہے کہ جسے ظاہر کیا جائے کہ بھئی دیکھو اس میں یہ خوبصورتی ہے۔ اور ایک وہ خوبصورتی ہوتی ہے جو از خود ظاہر ہو۔ع ’’حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام را!‘‘ تو اللہ تعالیٰ اتنا ستودہ صفات ہے کہ وہ اپنی ذات میں از خود محمود ہے‘ اسے کسی حمد کی حاجت نہیں ہے۔

آیت ۲۶۸ ﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ﴾ ’’شیطان تمہیں فقر کا اندیشہ دلاتا ہے اور بے حیائی کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ؕ﴾ ’’اور اللہ وعدہ کر رہا ہے تم سے اپنی طرف سے مغفرت کا اور فضل کا۔‘‘

اب دیکھ لو‘ تمہیں کون سا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے: ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

شیطان تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے کہ اس طرح تمہارا مال کم ہو جائے گا اور تم فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اب اگر واقعی تم یہ خوف رکھتے ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر فقر آ جائے‘ لہٰذا مجھے اپنا مال سنبھال سنبھال کر‘ سینت سینت کر رکھنا چاہیے تو تم شیطان کے جال میں پھنس چکے ہو‘ تم اس کی پیروی کر رہے ہو۔ اور اگر تم نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے کہ وہ میری ساری حاجتیں آج بھی پوری کر رہا ہے‘ کل بھی پوری کرے گا (اِن شاء اللہ) تو اللہ کی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

﴿وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۸﴾﴾ ’’اللہ بہت وسعت والا ہے‘ سب کچھ جاننے والا ہے۔‘‘

تم اس کے خزانوں کی محدودیت کا کوئی تصور اپنے ذہن میں نہ رکھو۔

آیت ۲۶۹ ﴿یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ﴾ ’’وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔‘‘

یہ حکمت کی باتیں ہیں‘ جن کا سمجھنا ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہیں۔ ایک چیزوں کا ظاہر ہے اور ایک باطن ہے‘ جو حکمت سے نظر آتا ہے۔ ظاہر تو سب کو نظر آ رہا ہے‘ لیکن کسی شے کی حقیقت کیا ہے‘ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے: ؎

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا؟

جس کسی پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے وہ حکیم ہے۔ اور حکمت اصل میں انسان کی عقل اور شعور کی پختگی کا نام ہے۔

استحکام اسی ''حکمت'' سے ہی بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ عقل وفہم اور شعور کی یہ پختگی اور حقائق تک پہنچ جانے کی صلاحیت جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

﴿وَمَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِىَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا‌ؕ﴾ ''اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیر کثیر عطا ہو گیا۔''
اس سے بڑا خیر کا خزانہ تو اور کوئی ہے ہی نہیں۔

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۲۶۹﴾ ''اور نہیں نصیحت حاصل کر سکتے مگر وہی لوگ جو ہوش مند ہیں۔''

ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو اولوا الالباب ہیں' عقل مند ہیں۔ لیکن جو دنیا پر ریجھ گئے ہیں' جن کا سارا دلی اطمینان اپنے مال و زر' جائیداد' اثاثہ جات اور بینک بیلنس پر ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ اولوا الالباب (عقل مند) نہیں ہیں۔

آیت ۲۷۰ ﴿وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ‌ ؕ﴾ ''اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو (صدقہ و خیرات دیتے ہو) یا جو بھی تم (اللہ کے نام پر) منت مانتے ہو' تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس سب کو جانتا ہے۔''

﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ۝۲۷۰﴾ ''اور (یاد رکھو کہ) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔''

آیت ۲۷۱ ﴿اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ‌ ۚ﴾ ''اگر تم صدقات کو علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے۔''

خاص طور پر زکوٰۃ کا معاملہ تو علانیہ ہی ہے۔ تو اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ کم سے کم فقراء کا حق تو ادا ہو گیا' کسی کی ضرورت تو پوری ہو گئی۔

﴿وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ؕ﴾ ''اور اگر تم انہیں چھپاؤ اور چپکے سے ضرورت مندوں کو دے دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔''

یاد رہے کہ یہ بات صدقاتِ نافلہ کے لیے ہے۔ لیکن جو صدقات واجبہ ہیں' جو لازماً دینے ہیں' مثلاً زکوٰۃ اور عشر' ان کے لیے اخفاء نہیں ہے۔ یہ دین کی حکمت ہے' اس کو ذہن میں رکھیے کہ فرض عبادات علانیہ ادا کی جائیں گی۔ یہ وسوسہ بھی شیطان بہت سوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے کہ کیا پانچ وقت مسجد میں جا کر نماز پڑھنے سے لوگوں پر اپنے تقویٰ کا رعب ڈالنا چاہتے ہو؟ گھر میں پڑھ لیا کرو! یا داڑھی اس لیے رکھو گے کہ لوگ تمہیں سمجھیں کہ بڑا متقی ہے؟ ایسے وساوسِ شیطانی کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے اور جو چیز فرض و واجب ہے' وہ علی الاعلان کرنی چاہیے' اس کے اظہار میں کوئی رکاوٹ نہیں آنی چاہیے۔ ہاں جو نفلی عبادات ہیں' صدقاتِ نافلہ ہیں یا نفل نماز ہے اسے چھپا کر کرنا چاہیے۔ نفل عبادت کا اظہار بہت بڑا فتنہ ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ اگر تم اپنے صدقات چھپا کر چپکے سے ضرورت مندوں کو دے دو تو وہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔

﴿وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ‌ؕ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دور کر دے گا۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۝۲۷۱﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔''

آیت ۲۷۲ ﴿لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰٮهُمۡ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کے ذمہ نہیں ہے کہ ان کو ہدایت دے دیں''
ان کو ہدایت دینے کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے' آپؐ پر ذمہ داری تبلیغ کی ہے۔ ہم نے آپ کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

﴿وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ‌ؕ﴾ ''بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ‌ؕ﴾ ''اور جو بھی مال تم خرچ کرو گے وہ تمہارے اپنے لیے بہتر ہے۔''
اس کا اجر و ثواب بڑھا چڑھا کر تم ہی کو دیا جائے گا' سات سو گنا' چودہ سو گنا یا اس سے بھی زیادہ۔

﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ‌ؕ﴾ ''اور تم نہیں خرچ کرو گے مگر اللہ کی رضا جوئی کے لیے۔''
تبھی تمہیں اس قدر اجر ملے گا۔ اگر ریا کارانہ خرچ کیا تھا تو اجر کا کیا سوال؟ وہ تو شرک بن جائے گا۔

﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ۝۲۷۲﴾ ''اور جو بھی مال تم خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہیں لوٹا دیا جائے گا اور تم پر کوئی ظلم نہیں ہو گا۔''
تمہاری ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔
اب واضح کیا جا رہا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا سب سے بڑھ کر حق دار کون ہے۔

آیت ۲۷۳ ﴿لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ﴾ ''یہ ان ضرورت مندوں کے لیے ہے جو گھر کر رہ گئے ہیں اللہ کی راہ میں''

جیسے رسول اللہ ﷺ کے دور میں اصحابِ صفہ تھے کہ مسجد نبویؐ میں آ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنا وقت تلاشِ معاش میں صرف نہیں کر رہے' آنحضور ﷺ سے علم سیکھ رہے ہیں اور جہاں جہاں سے مطالبہ آ رہا ہے کہ معلمین اور مبلغین کی ضرورت ہے وہاں ان کو بھیجا جا رہا ہے۔ اگر وہ معاش کی جدوجہد کرتے تو یہ تعلیم کیسے حاصل کرتے؟ اسی طرح دین کی کسی خدمت کے لیے کچھ لوگ اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں تو وہ اس کا مصداق ہوں گے۔ آپ نے دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لیے کوئی تحریک اٹھائی ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ ہمہ وقتی کارکن درکار ہوں گے۔ ان کارکنوں کی معاش کا مسئلہ ہو گا۔ وہ آٹھ آٹھ گھنٹے دفتروں میں جا کر کام کریں اور وہاں افسروں کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سنیں' آنے جانے میں بھی دو دو گھنٹے لگائیں تو اب وہ دین کے کام کے لیے کون سا وقت نکالیں گے اور کیا کام کریں گے؟ لہٰذا کچھ لوگ تو ہونے چاہئیں جو اس کام میں ہمہ وقت لگ جائیں۔ لیکن پیٹ تو ان کے ساتھ بھی ہیں' اولاد تو ان کی بھی ہو گی۔

﴿لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِى الۡاَرۡضِ﴾ ''وہ (اپنے کسبِ معاش کے لیے) زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔''
زمین کے اندر گھوم پھر کر تجارت کرنے کا ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔

﴿يَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ‌ۚ﴾ ''ناواقف آدمی ان کو خوشحال خیال کرتا ہے ان کی خودداری کے

سبب۔"

یہ اس طرح کے فقیر تو ہیں نہیں جو لپٹ کر مانگتے ہوں۔ ان کی خودداری کی وجہ سے عام طور پر جو ناواقف شخص ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ غنی ہیں، خوشحال ہیں، انہیں کوئی ضرورت ہی نہیں، انہوں نے کبھی مانگا ہی نہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح کے سوالی نہیں ہیں، وہ فقیر نہیں ہیں، انہوں نے تو اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے اپنے آپ کو لگا دیا ہے۔ یہ تمہارا کام ہے کہ انہیں تلاش کرو اور ان کی ضروریات پوری کرو۔

﴿تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ ۚ﴾ "تم پہچان لو گے انہیں ان کے چہروں سے۔"

ظاہر بات ہے کہ فقر و احتیاج کا اثر چہرے پر تو آ جاتا ہے۔ اگر کسی کو صحیح غذا نہیں مل رہی ہے تو چہرے پر اس کا اثر ظاہر ہو گا۔

﴿لَا يَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا ؕ﴾ "وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔"

وہ ان سائلوں کی طرح نہیں ہیں جو اصل میں اپنی محنت کا صلہ وصول کرتے ہیں کہ آپ کے سر ہو کر آپ سے زبردستی کچھ نہ کچھ نکلوا لیتے ہیں۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں جو لوگ ہمہ وقت لگ جائیں، آخر ان کے لیے ذریعۂ معاش کیا ہو؟ اس وقت اس پر تفصیل سے گفتگو ممکن نہیں۔ بہرحال یہ سمجھ لیجیے کہ یہ دو رکوع انفاق کے موضوع پر قرآن حکیم کا نقطۂ عروج ہیں اور یہ آخری آیت ان میں اہم ترین ہے۔

﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۲۷۳﴾﴾ "اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔"

یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا انفاق اللہ کے علم میں نہیں ہے۔ تم خاموشی کے ساتھ، اخفا کے ساتھ لوگوں کے ساتھ تعاون کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بھرپور بدلہ دے گا۔

آیات ۲۷۴ تا ۲۸۱

﴿اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ
وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَقُوۡمُ الَّذِىۡ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيۡطٰنُ مِنَ
الۡمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَيۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَهٗ
مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَانۡتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمۡرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا
خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِى الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيۡمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ
يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوۡا مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا
فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ۚ وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾
وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ ؕ وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا
تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ ۖ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾﴾

اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا جو رکوع پڑھ رہے ہیں یہ آج کے حالات میں اہم ترین ہے۔ یہ رکوع سود کی حرمت اور شناعت پر قرآن حکیم کا انتہائی اہم مقام ہے۔ اِس دَور میں اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کی سب سے بڑی صورت تو غیر اللہ کی حاکمیت کا تصور ہے، جو سب سے بڑا شرک ہے۔ اگرچہ نفسیاتی اور داخلی اعتبار سے سب سے بڑا شرک مادّے پر توکلّ ہے، لیکن خارجی اور واقعاتی دنیا میں اس وقت سب سے بڑا شرک غیر اللہ کی حاکمیت ہے، جو اَب "عوامی حاکمیت" کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس کے بعد اس وقت کے گناہوں اور بدعملی میں سب سے بڑا فتنہ اور فساد سود کی بنیاد پر ہے۔ اِس وقت دنیا میں سب سے بڑی شیطنت جو یہودیوں کے ذریعے سے پورے کرۂ ارضی کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے بے تاب ہے، وہ یہی سود کا ہتھکنڈا ہے۔ یہاں اس کی حرمت دوٹوک انداز میں بیان کر دی گئی۔ اس مقام پر میرے ذہن میں کبھی کبھی ایک سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس رکوع کی پہلی آیت کا تعلق تو انفاق فی سبیل اللہ سے ہے، لہٰذا اسے پچھلے رکوع کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا، لیکن بعد میں یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ اس آیت کو بڑی حکمت کے ساتھ اس رکوع کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ وہ حکمت مَیں بعد میں بیان کروں گا۔

آیت ۲۷۴ ﴿اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ﴾ "جو لوگ اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں رات کو بھی اور دن میں بھی"

﴿سِرًّا وَّعَلَانِيَةً﴾ "خفیہ طور پر بھی اور علانیہ بھی"

صدقاتِ واجبہ علانیہ اور صدقاتِ نافلہ خفیہ طور پر دیتے ہیں۔

﴿فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾﴾ "اُن کے لیے ان کا اجر (محفوظ) ہے ان کے ربّ کے پاس، نہ تو اُن پر کوئی خوف طاری ہو گا اور نہ ہی وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔"

اس کے برعکس معاملہ اُن کا ہے جو سود کھاتے ہیں۔ وجہ کیا ہے؟ اصل مسئلہ ہے "قدرِ زائد" (surplus value) کا! آپ کا کوئی شغل ہے، کوئی کاروبار ہے یا ملازمت ہے، آپ کما رہے ہیں، اس سے آپ کا خرچ پورا ہو رہا ہے، کچھ بچت بھی ہو رہی ہے۔ اب اس بچت کا اصل مصرف کیا ہے؟ آیت ۲۱۹ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ﴾ "لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو بھی زائد از ضرورت ہو!" چنانچہ اصل راستہ تو یہ ہے کہ اپنی بچت کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ یا محتاجوں کو دے دو یا اللہ کے دین کی نشر و اشاعت اور سربلندی میں لگا دو۔ لیکن سودخورانہ ذہنیت یہ ہے کہ اس بچت کو بھی مزید کمائی کا ذریعہ بناؤ۔ لہٰذا اصل میں سودخوری انفاق فی سبیل اللہ کی ضد

ہے۔ یہ عقدہ مجھ پر اُس وقت کھلا جب میں نے ''اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا'' کے اصول کے تحت سورۃ الروم کی آیت ۳۹ کا مطالعہ کیا۔ وہاں بھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لایا گیا ہے' اللہ کی رضا جوئی کے لیے انفاق اور اس کے مقابلے میں ربا' یعنی سود پر رقم دینا۔ فرمایا: ﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ ۚ﴾ ''اور جو مال تم دیتے ہو سود پر تا کہ لوگوں کے اموال میں (شامل ہو کر) بڑھ جائے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا''۔ محنت کوئی کر رہا ہے اور آپ اس کی کمائی میں سے اپنے سرمائے کی وجہ سے وصول کر رہے ہیں تو آپ کا مال اس کے مال میں شامل ہو کر اس کی محنت سے بڑھ رہا ہے۔ لیکن اللہ کے ہاں اس کی بڑھوتری نہیں ہوتی۔ ﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور وہ جو تم زکوٰۃ (اور صدقات) میں دے دیتے ہو محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے تو یہی لوگ (اپنے مال اللہ کے ہاں) بڑھا رہے ہیں''۔ ان کا مال مسلسل بڑھ رہا ہے' اس کی بڑھوتری ہو رہی ہے۔ چنانچہ انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات وزکوٰۃ وغیرہ کا معاملہ سود کے بالمقابل اور اس کے برعکس ہے۔ اپنے اس بچت کے مال کو یا تو کوئی اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا یا پھر سودی منافع حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ آج کے بینکنگ کے نظام میں سب سے زیادہ زور بچت (saving) پر دیا جاتا ہے اور اس کے لیے سیونگ اکاؤنٹ اور بہت سی پُرکشش منافع بخش سکیمیں متعارف کرائی جاتی ہیں۔ ان کی طرف سے یہی ترغیب دی جاتی ہے کہ بچت کرو مزید کمانے کے لیے! بچت اس لیے نہیں کہ اپنا پیٹ کاٹو اور غرباء کی ضروریات پوری کرو' اپنا معیارِ زندگی کم کرو اور اللہ کے دین کے لیے خرچ کرو۔ نہیں' بلکہ اس لیے کہ جو کچھ تم بچاؤ وہ ہمیں دو' تا کہ وہ ہم زیادہ شرح سود پر دوسروں کو دیں اور تھوڑی شرح سود تمہیں دے دیں۔ چنانچہ انفاق اور سود ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ فرمایا:

آیت ۲۷۵ ﴿اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا﴾ ''جو لوگ سود کھاتے ہیں۔''

﴿لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ﴾ ''وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر اُس شخص کی طرح جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔''

یہاں عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ قیامت کے دن کا نقشہ ہے۔ قیامت کے دن کا یہ نقشہ تو ہو گا ہی' اس دنیا میں بھی سود خوروں کا حال یہی ہوتا ہے' اور ان کا یہ نقشہ کسی سٹاک ایکسچینج میں جا کر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ معلوم ہو گا گویا دیوانے ہیں' پاگل ہیں' جو چیخ رہے ہیں' دوڑ رہے ہیں' بھاگ رہے ہیں۔ وہ نارمل انسان نظر نہیں آتے' مخبوط الحواس لوگ نظر آتے ہیں جن پر گویا آسیب کا سایہ ہو۔

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ﴾ ''اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔''

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں نے سو روپے کا مال خریدا' ۱۱۰ روپے میں بیچ دیا' دس روپے بچ گئے' یہ ربح (منافع) ہے' جو جائز ہے' لیکن اگر سو روپے کسی کو دیے اور ۱۱۰ واپس لیے تو یہ ربا (سود) ہے' یہ حرام کیوں ہو گیا؟ ایک شخص نے دس لاکھ کا مکان بنایا' چار ہزار روپے ماہانہ کرایے پر دے دیا تو جائز ہو گیا' اور دس لاکھ روپے کسی کو قرض دیے اور اُس سے چار ہزار روپے مہینہ لینا شروع کیے تو یہ سود ہو گیا' حرام ہو گیا' ایسا کیوں ہے؟ عقلی طور پر اس طرح کی باتیں سود کے حامیوں کی طرف سے کہی جاتی ہیں۔ (ربح اور ربا کا فرق سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶ کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔) اس ظاہری مناسبت کی وجہ سے یہ مخبوط الحواس سود خور لوگ ان دونوں کے اندر کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا عقلی جواب نہیں دیا' بلکہ فرمایا:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ﴾ ''حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

اب تم یہ بات کرو کہ اللہ کو مانتے ہو یا نہیں؟ رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہو یا نہیں؟ قرآن کو مانتے ہو یا نہیں؟ یا محض اپنی عقل کو مانتے ہو؟ اگر تم مسلمان ہو' مؤمن ہو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرو: ﴿وَمَآ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ ۚ وَمَا نَھٰىکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۚ﴾ (الحشر: ۷) ''جو کچھ رسول تمہیں دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ''۔ یہ تو شریعت کا معاملہ ہے۔ ویسے معاشیات کے اعتبار سے اس میں یہ فرق واقع ہوتا ہے کہ ایک ہے fluid capital اور ایک ہے fixed capital۔ جہاں تک مکان کا معاملہ ہے تو وہ fixed capital ہے۔ دس لاکھ روپے کے مکان میں جو شخص رہ رہا ہے وہ اس سے کیا فائدہ اٹھائے گا؟ وہ اس میں رہائش اختیار کرے گا اور اس کے عوض ماہانہ کرایہ ادا کرے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ نے دس لاکھ روپے کسی کو نقد دے دیے تو وہ انہیں کسی کام میں لگائے گا۔ اس میں یہ بھی امکان ہے کہ دس لاکھ کے بارہ لاکھ یا پندرہ لاکھ بن جائیں اور یہ بھی کہ آٹھ لاکھ رہ جائیں۔ چنانچہ اس صورت میں اگر آپ نے پہلے سے طے شدہ (fix) منافع وصول کیا تو یہ حرام ہو جائے گا۔ تو ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے عقلی جواب نہیں دیا۔ جواب دیا کہ ''اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور ربا کو حرام۔''

﴿فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ﴾ ''تو جس شخص کے پاس اس کے ربّ کی طرف سے یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا ہے وہ اس کا ہے۔''

وہ اُس سے واپس نہیں لیا جائے گا۔ حساب کتاب نہیں کیا جائے گا کہ تم اتنا سود کھا چکے ہو' واپس کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس پر اس کا کوئی گناہ نہیں ہو گا۔

﴿وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ﴾ ''اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔''

اللہ تعالیٰ چاہے گا تو معاف کر دے گا اور چاہے گا تو پچھلے سود پر بھی سرزنش ہو گی۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾﴾ ''اور جس نے (اس نصیحت کے آ جانے کے بعد بھی) دوبارہ یہ حرکت کی تو یہ لوگ جہنمی ہیں' وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

آیت ۲۷۶ ﴿یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ﴾ ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔''

ہمارے زمانے میں شیخ محمود احمد (مرحوم) نے اپنی کتاب ''Man & Money'' میں ثابت کیا ہے کہ تین چیزیں سود کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ جتنا سود بڑھے گا اسی قدر بے روزگاری بڑھے گی' افراطِ زر (inflation) میں اضافہ ہو

گا اور اس کے نتیجے میں شرحِ سود (interest rate) بڑھے گا۔ شرحِ سود کے بڑھنے سے بے روزگاری مزید بڑھے گی اور افراطِ زر میں اور زیادہ اضافہ ہو گا۔ یہ ایک دائرۂ خبیثہ (vicious circle) ہے اور اس کے نتیجے میں کسی ملک کی معیشت بالکل تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ تباہی ایک وقت تک پوشیدہ رہتی ہے' لیکن پھر یکدم اس کا ظہور بڑے بڑے بینکوں کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ابھی جو کوریا کا حشر ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس سے پہلے روس کا جو حشر ہو چکا ہے وہ پوری دنیا کے لیے باعث عبرت ہے۔ سودی معیشت کا معاملہ تو گویا شیش محل کی طرح ہے' اس میں تو ایک پتھر آ کر لگے گا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس معاملہ صدقات کا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ پالتا ہے' بڑھاتا ہے' جیسا کہ سورۃ الروم کی آیت ۳۹ میں ارشاد ہوا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ﴿۲۷۶﴾﴾ ''اور اللہ کسی ناشکرے اور گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔''

اللہ تعالیٰ کو وہ سب لوگ ہرگز پسند نہیں ہیں جو ناشکرے اور گناہگار ہیں۔

آیت ۲۷۷ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ﴾ ''ہاں جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہے ان کے لیے ان کا اجر اُن کے ربّ کے پاس محفوظ ہے۔''

نیک عمل میں ظاہر بات ہے جو شے حرام ہے اس کا چھوڑ دینا بھی لازم ہے۔

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴿۲۷۷﴾﴾ ''اور نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔''

آیت ۲۷۸ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سود میں سے جو باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو''

آج فیصلہ کر لو کہ جو کچھ بھی تم نے کسی کو قرض دیا تھا اب اس کا سود چھوڑ دینا ہے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴿۲۷۸﴾﴾ ''اگر تم واقعی مؤمن ہو۔''

آیت ۲۷۹ ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ﴾ ''پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔''

سود خوری سے باز نہ آنے پر یہ الٹی میٹم ہے۔ قرآن و حدیث میں کسی اور گناہ پر یہ بات نہیں آئی ہے۔ یہ واحد گناہ ہے جس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

﴿وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ﴾ ''اور اگر تم توبہ کر لو تو پھر اصل اموال تمہارے ہی ہیں۔''

تمہارے جو اصل رأس المال ہیں وہ تمہیں لوٹا دیے جائیں گے۔ چنانچہ سود چھوڑ دو اور اپنے رأس المال واپس لے لو۔

﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴿۲۷۹﴾﴾ ''نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

نہ تم کسی پر ظلم کرو کہ اس سے سود وصول کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے کہ تمہارا رأس المال بھی دبا دیا جائے۔

آیت ۲۸۰ ﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ ؕ﴾ ''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی حاصل ہونے تک اسے مہلت دو۔''

اسے مہلت دو کہ اس کے ہاں کشادگی پیدا ہو جائے تاکہ وہ آسانی سے آپ کا قرض آپ کو واپس کر سکے۔

﴿وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ﴾ ''اور اگر تم صدقہ ہی کر دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے''

تمہارا بھائی غریب تھا' اس کو تم نے قرض دیا تھا' اس پر کچھ سود لے کر کھا بھی چکے ہو' باقی سود کو تو چھوڑا ہی ہے' اگر اپنا رأس المال بھی اس کو بخش دو تو یہ انفاق ہو جائے گا' یہ اللہ کو قرضِ حسنہ ہو جائے گا اور تمہارے لیے ذخیرۂ آخرت بن جائے گا۔ یہ بات سمجھ لیجیے کہ آپ کی جو بچت ہے' جسے میں نے قدرِ زائد (surplus value) کہا تھا' اسلامی معیشت کے اندر اُس کا سب سے اونچا مصرف انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو' صدقہ کر دو۔ اس سے کم تر ''قرضِ حسنہ'' ہے۔ آپ کے کسی بھائی کا کاروبار رُک گیا ہے' اس کو قرض دے دو' اس کا کاروبار چل پڑے گا اور پھر وہ تمہیں تمہاری اصل رقم واپس کر دے گا۔ یہ قرضِ حسنہ ہے' اس کا درجہ انفاق سے کم تر ہے۔ تیسرا درجہ مضاربت کا ہے' جو جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر تم زیادہ ہی خسیس ہو تو چلو اپنا سرمایہ اپنے کسی بھائی کو مضاربت پر دے دو۔ اور مضاربت یہ ہے کہ رقم تمہاری ہو گی اور کام وہ کرے گا۔ اگر بچت ہو جائے تو اس میں تمہارا بھی حصہ ہو گا' لیکن اگر نقصان ہو جائے تو وہ کُل کا کُل تمہارا ہو گا' تم اس سے کوئی تاوان نہیں لے سکتے۔ اس کے بعد ان تین درجوں سے بھی نیچے اتر کر اگر تم کہو کہ میں یہ رقم تمہیں دے رہا ہوں' اس پر اتنے فیصد منافع تو تم نے بہرحال دینا ہی دینا ہے' تو اس سے بڑھ کر حرام شے کوئی نہیں ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی جا رہی ہے کہ اگر تمہارا مقروض تنگی میں ہے تو پھر انتظار کرو' اُسے اس کی کشائش اور فراخی تک مہلت دے دو۔ اور اگر تم صدقہ ہی کر دو' خیرات کر دو' بخش دو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۲۸۰﴾﴾ ''اگر تم جانتے ہو۔''

اگر تمہیں اللہ نے حکمت عطا کر دی ہے' اگر تم اولوا الالباب ہو' اگر تم سمجھ دار ہو تو تم اُس بچت کے امیدوار بنو جو اللہ کے ہاں اجر و ثواب کی صورت میں تمہیں ملے گی۔ اس کے مقابلے میں اس رقم کی کوئی حیثیت نہیں جو تمہیں مقروض سے واپس ملنی ہے۔

اگلی آیت نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی آخری آیت ہے۔

آیت ۲۸۱ ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ۗ﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن تم لوٹا دیے جاؤ گے اللہ کی طرف۔''

یہاں وہ آیت یاد کیجیے جو سورۃ البقرۃ میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ دوبار آ چکی ہے: ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴿۴۸﴾﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ

جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ وصول کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی''۔ اور ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کسی کو کوئی سفارش فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

﴿ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ ''پھر ہر جان کو پورا پورا دے دیا جائے گا جو کمائی اس نے کی ہو گی۔''

﴿وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾﴾ ''اور اُن پر کچھ ظلم نہ ہو گا۔''

آیات ۲۸۲، ۲۸۳

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ ۚ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْئًا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰی ؕ وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِیْرًا اَوْ كَبِیْرًا اِلٰۤی اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤی اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ۪ وَلَا یُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَیُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰی سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ یَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۳﴾﴾

آیت ۲۸۲ جو زیرِ مطالعہ ہے، قرآن حکیم کی طویل ترین آیت ہے اور اسے ''آیتِ دَین'' یا ''آیتِ مُدَایَنَۃ'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ کوئی قرض کا باہم لین دین ہو یا آپس میں کاروباری معاملہ ہو تو اسے باقاعدہ طور پر لکھ لیا جائے اور اس پر دو گواہ مقرر کیے جائیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس قرآنی ہدایت کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور کسی بھائی، دوست یا عزیز کو قرض دیتے ہوئے یا کوئی کاروباری معاملہ کرتے ہوئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے کیا لکھوانا ہے، وہ کہے گا کہ انہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ چنانچہ تمام معاملات زبانی طے کر لیے جاتے ہیں، اور بعد میں جب معاملات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو پھر لوگ شکوہ و شکایت اور چیخ و پکار کرتے ہیں۔ اگر شروع ہی میں قرآنی ہدایات کے مطابق مالی معاملات کو تحریر کر لیا جائے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچے گی۔ حدیث نبویؐ کا مفہوم ہے کہ جو شخص قرض دیتے ہوئے یا کوئی مالی معاملہ کرتے ہوئے لکھوا تا نہیں ہے، اگر اس کا مال ضائع ہو جاتا ہے تو اسے اس پر کوئی اجر نہیں ملتا، اور اگر وہ مقروض کے حق میں بددعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی فریاد نہیں سنتا، کیونکہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

آیت ۲۸۲ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ ؕ﴾ ''اے اہلِ ایمان! جب بھی تم قرض کا کوئی معاملہ کرو ایک وقتِ معین تک کے لیے تو اس کو لکھ لیا کرو۔''

آیت کے اس ٹکڑے سے دو حکم معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرض کا وقت معین ہونا چاہیے کہ یہ کب واپس ہو گا اور دوسرے یہ کہ اسے لکھ لیا جائے۔ فَاكْتُبُوْهُ فعلِ امر ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

﴿وَلْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪﴾ ''اور چاہیے کہ اس کو لکھے کوئی لکھنے والا تمہارے مابین عدل کے ساتھ۔''
لکھنے والا کوئی ڈنڈی نہ مار جائے، اسے چاہیے کہ وہ صحیح صحیح لکھے۔

﴿وَلَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ ۚ﴾ ''اور جو لکھنا جانتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے، جس طرح اللہ نے اس کو سکھایا ہے، پس چاہیے کہ وہ لکھ دے۔''

یہ ہدایت تاکید کے ساتھ کی گئی، اس لیے کہ اس معاشرے میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہوتے تھے۔ اب بھی مالی معاملات اور معاہدات بالعموم وثیقہ نویس تحریر کرتے ہیں۔

﴿وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ﴾ ''اور املاء وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے''
یعنی جس نے قرض لیا ہے وہ دستاویز لکھوائے کہ میں کیا ذمہ داری لے رہا ہوں، جس کا مال ہے وہ نہ لکھوائے۔

﴿وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ ''اور وہ اللہ سے ڈرتا رہے اپنے ربّ سے''

﴿وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْئًا ؕ﴾ ''اور (لکھواتے ہوئے) اس میں سے کوئی شے کم نہ کر دے۔''

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا﴾ ''پھر اگر وہ شخص جس پر حق عائد ہوتا ہے، ناسمجھ یا ضعیف ہو''

﴿اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ﴾ ''یا اس کے اندر اتنی صلاحیت نہ ہو کہ املا کروا سکے''

﴿فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ﴾ ''تو جو اُس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔''

اگر قرض لینے والا ناسمجھ ہو، ضعیف ہو یا دستاویز نہ لکھوا سکتا ہو تو اُس کا کوئی ولی، کوئی وکیل یا مختار (attorney) اُس کی طرف سے انصاف کے ساتھ دستاویز تحریر کرائے۔ یہاں ''اِملال'' اِملاء کے معنی میں آیا ہے۔

﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ﴾ ''اور اس پر گواہ بنا لیا کرو اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو۔''

﴿فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ﴾ ''پھر اگر دو مرد دستیاب نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں''

﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ ''یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں''

جن کی گواہی ہر دو فریق کے نزدیک مقبول ہو اور ان پر دونوں کو اعتماد ہو۔ اگر مذکورہ صفات کے دو مرد دستیاب نہ ہو سکیں تو گواہی کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کر لیا جائے۔ یعنی گواہوں میں ایک مرد کا ہونا لازم ہے' محض عورت کی گواہی نہیں چلے گی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر قسم کے معاملات میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے یا یہ معاملہ صرف قرض اور مالی معاملات میں دستاویز تحریر کرتے وقت کا ہے' اس کی تفصیل فقہاء کے ہاں ملتی ہے۔

﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ط﴾ ''تا کہ ان میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری یاد کروا دے۔''

یہاں عقلی سوال پیدا ہو گیا کہ کیا مرد نہیں بھول سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعتاً اللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر نسیان کا مادّہ زیادہ رکھا ہے۔ ﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۱۴﴾ (الملک) ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ بڑا باریک بین اور ہر شے کی خبر رکھنے والا ہے''۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کس میں کون سا مادّہ زیادہ ہے۔ عورت میں نسیان کا مادّہ کیوں زیادہ رکھا گیا ہے' یہ بھی سمجھ لیجیے۔ یہ بڑی عقلی اور منطقی بات ہے۔ دراصل عورت کو مرد کے تابع رہنا ہوتا ہے' لہٰذا اُس کے احساسات کو کبھی ٹھیس پہنچ سکتی ہے' اُس کے جذبات کے اوپر کبھی کوئی کدورت آتی ہے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر بھول جانے کا مادہ ''سیفٹی والو'' کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ تو ان کا معاملہ اس شعر کے مصداق ہو جائے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے اب مجھ سے حافظہ میرا!

چنانچہ یہ نسیان بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے' ورنہ تو کوئی صدمہ دل سے اترنے ہی نہ پائے' کوئی غصہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔ بہر حال خواہ کسی حکم کی علت یا حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے' اللہ کا حکم تو بہر صورت ماننا ہے۔

﴿وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ط﴾ ''اور نہ انکار کریں گواہ جبکہ ان کو بلایا جائے۔''

گواہوں کو جب گواہی کے لیے بلایا جائے تو آ کر گواہی دیں' اس سے انکار نہ کریں۔ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۴۰ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ط﴾ ''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک شہادت موجود ہو اور وہ اسے چھپائے؟''

﴿وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ط﴾ ''اور تساہل مت کرو اس کے لکھنے میں' معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اس کی معین مدت کے لیے۔''

قرض خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اس کی دستاویز تحریر ہونی چاہیے کہ میں اتنی رقم لے رہا ہوں اور اتنے وقت میں اسے لوٹا دوں گا۔ اس کے بعد قرض خواہ اس مدت کو بڑھا بھی سکتا ہے' مزید مہلت دے سکتا ہے' بلکہ معاف بھی کر سکتا ہے۔ لیکن قرض دیتے وقت اس کی مدت معین ہونی چاہیے۔

﴿ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ کے نزدیک بھی زیادہ مبنی بر انصاف ہے''

﴿وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾ ''اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے''

معاملہ ضبطِ تحریر میں آ جائے گا تو بہت واضح رہے گا' ورنہ زبانی یادداشت کے اندر تو کہیں تعبیر ہی میں فرق ہو جاتا ہے۔

﴿وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا﴾ ''اور یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم شبہ میں نہیں پڑو گے''

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ﴾ ''الا یہ کہ کوئی تجارتی لین دین ہو جو تم دست بدست کرتے ہو''

مثلاً آپ کسی دکاندار سے کوئی شے خریدتے ہیں اور نقد پیسے ادا کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ اس کا کیش میمو بھی لیں۔ اگر آپ چاہیں تو دکاندار سے کیش میمو طلب کر سکتے ہیں۔

﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ط﴾ ''تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اسے نہ لکھو۔''

﴿وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ص﴾ ''اور گواہ بنا لیا کرو جب کوئی (مستقبل کا) سودا کرو۔''

''بیع سلم'' جو ہوتی ہے یہ مستقبل کا سودا ہے' اور یہ بھی ایک طرح کا قرض ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی زمیندار سے طے کرتے ہیں کہ آئندہ فصل کے موقع پر آپ اس سے اتنے روپے فی من کے حساب سے پانچ سو من گندم خریدیں گے۔ یہ بیع سلم کہلاتی ہے اور اس میں لازم ہے کہ آپ پوری قیمت ابھی ادا کر دیں اور آپ کو گندم فصل کے موقع پر ملے گی۔ اس طرح کا لین دین بھی باقاعدہ تحریر میں آ جانا چاہیے اور اس پر دو گواہ مقرر ہونے چاہئیں۔

﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ط﴾ ''اور نہ نقصان پہنچایا جائے کسی لکھنے والے کو اور گواہ کو۔ اور نہ نقصان پہنچائے کوئی لکھنے والا اور گواہ۔''

''یُضَآرَّ'' میں یہ دونوں مفہوم موجود ہیں۔ اس لیے کہ یہ معروف بھی ہے اور مجہول بھی۔

﴿وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ط﴾ ''اور اگر تم ایسا کرو گے (نقصان پہنچاؤ گے) تو یہ تمہارے حق میں گناہ کی بات ہو گی۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط﴾ ''اور اللہ سے ڈرتے رہو۔''

﴿وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ط﴾ ''اور اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۲۸۲﴾ ''اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

یہ ایک آیت مکمل ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آخری پارے کی چار پانچ چھوٹی سورتیں جمع کر لیں تو ان کا حجم اس ایک آیت کے برابر ہو گا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ آیات کی تعیین توقیفی ہے۔ اس کا ہمارے حساب کتاب سے' گرامر سے' منطق سے اور علمِ بیان سے کوئی تعلق نہیں۔

آیت ۲۸۳ ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا﴾ ’’اور اگر تم سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ‘‘
اگر دورانِ سفر کوئی لین دین کا یا قرض کا معاملہ ہو جائے اور کوئی کاتب نہ مل سکے۔

﴿فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ ’’تو کوئی شے گروی رکھ لو قبضے میں۔‘‘

قرض لینے والا اپنی کوئی شے قرض دینے والے کے حوالے کر دے کہ میری یہ شے آپ کے قبضے میں رہے گی‘ آپ اتنے پیسے مجھے دے دیجیے‘ میں جب یہ واپس کر دوں گا آپ میری چیز مجھے لوٹا دیجیے گا۔ یہ رہن بالقبضہ ہے۔ لیکن رہن (گروی) رکھی ہوئی چیز سے کوئی فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے‘ وہ سود ہو جائے گا۔ مثلاً اگر مکان رہن رکھا گیا ہے تو اس پر قبضہ تو قرض دینے والا کا ہوگا‘ لیکن وہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتا‘ اس کا کرایہ نہیں لے سکتا‘ کرایہ مالک کو جائے گا۔

﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ ’’پھر اگر تم میں سے ایک دوسرے پر اعتماد کرے‘‘
یعنی ایک شخص دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے بغیر رہن کے اسے قرض دے دیتا ہے۔

﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ ’’تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اُس کو چاہیے کہ وہ اس کی امانت واپس کرے‘‘
ایک شخص کے پاس رہن دینے کو کچھ نہیں تھا یا یہ کہ دوسرے بھائی نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اُس سے کوئی شے رہن نہیں لی اور اس کو قرض دے دیا تو یہ مال جو اُس نے قرض لیا ہے یہ اس کے پاس قرض دینے والے کی امانت ہے‘ جس کا واپس لوٹانا اس کے ذمے فرض ہے۔

﴿وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ ’’اور اللہ سے ڈرے جو اس کا ربّ ہے۔‘‘

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ ’’اور گواہی کو چھپایا نہ کرو۔‘‘

﴿وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ ’’اور جو کوئی گواہی کو چھپائے گا تو اس کا دل گنہگار رہوگا۔‘‘
بعض گناہوں کا اثر انسان کے ظاہری اعضاء تک محدود ہوتا ہے‘ جبکہ بعض کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ شہادت کا چھپانا بھی اسی نوعیت کا گناہ ہے۔ اور اگر کسی کا دل داغ دار ہو گیا تو باقی کیا رہ گیا؟

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾﴾ ’’اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔‘‘

آیات ۲۸۴ تا ۲۸۶

﴿ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَآ ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ﴾

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم سورۃ البقرۃ کے آخری رکوع پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ عظیم الشان رکوع تین آیات پر مشتمل ہے۔ قبل ازیں ہم اسی طرح کا ایک عظیم رکوع پڑھ آئے ہیں جس کی چار آیات ہیں اور اس میں آیت الکرسی بھی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں رکوع اپنی عظمت اور اپنے مقام کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔ آیت الکرسی توحید کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین آیت ہے‘ اور اس رکوع کی آخری آیت جامع ترین دعا پر مشتمل ہے۔

آیت ۲۸۴ ﴿لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ﴾ ’’اللہ ہی کا ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے۔‘‘
آپ دیکھیں گے کہ اکثر و بیشتر اس طرح کے الفاظ سورتوں کے اختتام پر آتے ہیں۔

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ﴾ ’’اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اسے ظاہر کرو خواہ چھپاؤ‘ اللہ تم سے اس کا محاسبہ کر لے گا۔‘‘
تمہاری نیتیں اس کے علم میں ہیں۔ ایک حدیث میں الفاظ آتے ہیں: ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ))[۳۶] ’’یقیناً اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے مال و دولت کو نہیں دیکھتا‘ بلکہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے‘‘۔ تو تمہارے دل میں جو کچھ ہے خواہ اسے کتنا ہی چھپا لو اللہ کے محاسبے سے نہیں بچ سکو گے۔

﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ’’پھر وہ بخش دے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا۔‘‘
اختیارِ مطلق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے ہاں اہل سنت کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں ہے کہ نیکوکار کو اس کی جزا ضرور دے اور بدکار کو اس کی سزا ضرور دے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ ایسا کرے گا‘ لیکن اللہ کی شان اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے کہ اس پر کسی شے کو لازم قرار دیا جائے۔ اس کا اختیارِ مطلق ہے‘ وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۶﴾﴾ (البروج) کی شان کا حامل ہے۔ سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۱۸﴾﴾ ’’یقیناً اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے‘‘۔ اہل تشیع کا موقف یہ ہے کہ اللہ پر عدل واجب ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ عدل کرے گا‘ جزاء و سزا میں عدل ہو گا‘ لیکن عدل کرنا اس پر واجب نہیں ہے‘ بلکہ اللہ نے جو شے اپنے اوپر واجب کی ہے وہ ’’رحمت‘‘ ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ﴾ (الانعام: ۱۲) اور: ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ﴾ (الانعام: ۵۴) ’’تمہارے ربّ نے رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾﴾ ’’اور اللہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔‘‘

آیت ۲۸۵ ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط﴾ ”ایمان لائے رسول (ﷺ) اس چیز پر جو نازل کی گئی اُن کی جانب اُن کے ربّ کی طرف سے اور مؤمنین بھی (ایمان لائے۔)“

یہ ایک غور طلب بات اور بڑا باریک نکتہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر جب وحی آئی تو آپؐ نے کیسے پہچان لیا کہ یہ بدروح نہیں ہے‘ یہ جبرائیل امینؑ ہیں؟ آخر کوئی اشتباہ بھی تو ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ پہلا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے نہ تو آپ ﷺ نے کہانت سیکھی اور نہ آپ نے کوئی نفسیاتی ریاضتیں کیں۔ آپ ﷺ تو ایک کاروباری آدمی تھے اور اہل و عیال کے ساتھ بہت ہی بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔ آپ ﷺ کا بلند ترین سطح کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا۔ یہ درحقیقت آپ ﷺ کی فطرتِ سلیمہ تھی جس نے وحی لانے والے فرشتے کو پہچان لیا اور آپؐ اس وحی پر ایمان لے آئے۔ نبی کی فطرت اتنی پاک اور صاف ہوتی ہے کہ اس کے اوپر کسی بدروح وغیرہ کا کوئی اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال ہمارے لیے بڑی تسکین کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ایمان کے تذکرے کے ساتھ ہمارے ایمان کا تذکرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اصحابِ ایمان میں شامل فرمائے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔

﴿کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ قف﴾ ”یہ سب ایمان لائے اللہ پر‘ اُس کے فرشتوں پر‘ اُس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر۔“

سورۃ البقرۃ میں یہ دوسرا مقام ہے جہاں ایمان کے اجزاء کو گنا گیا ہے۔ قبل ازیں آیۃ البر (آیت ۱۷۷) میں اجزائے ایمان کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

﴿لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ قف﴾ ”(یہ کہتے ہیں کہ) ہم اللہ کے رسولوں میں کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔“

یہ بات تیسری مرتبہ آ گئی ہے کہ اللہ کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔ سولہویں رکوع میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ صلے وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾﴾ ”ہم ان میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے فرماں بردار ہیں“۔ اور سب سے پہلے آیت ۴ میں یہ الفاظ آ چکے ہیں: ﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ج﴾ ”وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس پر بھی جو (اے نبی ﷺ) آپ پر نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا“۔ البتہ رسولوں کے درمیان تفضیل ثابت ہے اور ہم یہ آیت پڑھ چکے ہیں: ﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ م مِنْھُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ ط﴾ (آیت ۲۵۳) ”یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے وہ بھی تھے جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے (کسی اور اعتبار سے) بلند کر دیے۔“

﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ق﴾ ”اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔“

﴿غُفْرَانَکَ رَبَّنَا﴾ ”پروردگار! ہم تیری بخشش مانگتے ہیں“

غُفْرَانَکَ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی نَسْئَلُکَ غُفْرَانَکَ اے اللہ! ہم تجھ سے تیری مغفرت طلب کرتے ہیں‘ ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں۔

﴿وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸۵﴾﴾ ”اور تیری ہی جانب لوٹ جانا ہے۔“

یہاں پر ایمان بالآخرۃ کا ذکر بھی آ گیا جو اوپر ان الفاظ میں نہیں آیا تھا: ﴿کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ قف﴾۔ اب آخری آیت آ رہی ہے۔

آیت ۲۸۶ ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ط﴾ ”اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اس کی وسعت کے مطابق۔“

یہ آیت اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے فضل و کرم کا مظہر ہے۔ میں نے آیت ۱۸۶ کے بارے میں کہا تھا کہ یہ دنیا میں حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے: ﴿اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ ”میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے“۔ ﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ﴾ ”پس انہیں بھی چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں“۔ گویا دو طرفہ بات چلے گی‘ یک طرفہ نہیں۔ میری مانو‘ اپنی منواؤ! تم دعائیں کرو گے‘ ہم قبول کریں گے! لیکن اگر تم ہماری بات نہیں مانتے تو پھر تمہاری دعا تمہارے منہ پر دے ماری جائے گی‘ خواہ قنوتِ نازلہ چالیس دن تو کیا اسّی دن تک پڑھتے رہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری دعاؤں کے باوجود تمہیں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ دیکھنا پڑا‘ تمہیں یہودیوں کے ہاتھوں شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اگرچہ ان مواقع پر حرمین شریفین میں قنوتِ نازلہ پڑھی جاتی رہی‘ لیکن تمہاری دعائیں کیونکر قبول ہوتیں! تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے اللہ کو پیٹھ دکھائی ہوئی ہے‘ اس کے دین کو پاؤں تلے روندا ہوا ہے‘ اللہ کے باغیوں سے دوستی رکھی ہوئی ہے۔ کسی نے ماسکو کو اپنا قبلہ بنا رکھا تھا تو کسی نے واشنگٹن کو۔ لہٰذا تمہاری دعائیں تمہارے منہ پر دے ماری گئیں۔

لیکن آیت زیر مطالعہ اس اعتبار سے بہت بڑی رحمت کا مظہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اندھے کی لاٹھی والا معاملہ نہیں ہے کہ تمام انسانوں سے محاسبہ ایک ہی سطح پر ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ کس کی کتنی وسعت ہے اور اسی کے مطابق کسی کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اور یہ وسعت موروثی اور ماحولیاتی عوامل پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر شخص کو جو genes ملتے ہیں وہ دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان genes کی اپنی اپنی خصوصیات (properties) اور تحدیدات (limitations) ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کو دوسرے سے مختلف ماحول میسر آتا ہے۔ تو ان موروثی عوامل (hereditary factors) اور ماحولیاتی عوامل (environmental factors) کے حاصل ضرب سے انسان کی شخصیت کا ایک ہیولیٰ بنتا ہے‘ جس کو مستری لوگ ”پاٹن“ کہتے ہیں۔ جب لوہے کی کوئی شے ڈھالنی مقصود ہو تو اس کے لیے پہلے مٹی یا لکڑی کا ایک سانچہ (pattern) بنایا جاتا ہے۔

اس کو ہمارے ہاں کاریگر اپنی بولی میں ''پاٹن'' کہتے ہیں۔ اب آپ لوہے کو پگھلا کر اس میں ڈالیں گے تو وہ اسی صورت میں ڈھل جائے گا۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ ''شاکلہ'' ہے جو ہر انسان کا بن جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلۡ کُلٌّ یَّعۡمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ ؕ فَرَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ہُوَ اَہۡدٰی سَبِیۡلًا ﴿۸۴﴾﴾ (بنی اسراءیل) ''کہہ دیجیے کہ ہر کوئی اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ پس آپ کا ربّ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سیدھی راہ پر ہے''۔ اس شاکلہ کے اندر اندر آپ کو محنت کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کس کا شاکلہ وسیع تھا اور کس کا تنگ تھا' کس کے genes اعلیٰ تھے اور کس کے ادنیٰ تھے' کس کے ہاں ذہانت زیادہ تھی اور کس کے ہاں جسمانی قوت زیادہ تھی۔ اسے خوب معلوم ہے کہ کس کو کیسی صلاحیتیں ودیعت کی گئیں اور کیسا ماحول عطا کیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ماحولیاتی عوامل اور موروثی عوامل کو ملحوظ رکھ کر اُس کی استعدادات کے مطابق حساب لے گا۔ فرض کیجیے ایک شخص کے اندر استعداد ہی ۲۰ درجے کی ہے اور اس نے ۱۸ درجے کام کر دکھایا تو وہ کامیاب ہو گیا۔ لیکن اگر کسی میں استعداد سو درجے کی تھی اور اس نے ۵۰ درجے کام کیا تو وہ ناکام ہو گیا۔ حالانکہ کمیت کے اعتبار سے ۵۰ درجے ۱۸ درجے سے زیادہ ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کا محاسبہ جو ہے وہ انفرادی سطح پر ہے۔ اس لیے فرمایا گیا: ﴿وَ کُلُّہُمۡ اٰتِیۡہِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فَرۡدًا ﴿۹۵﴾﴾ (مریم) ''اور سب لوگ قیامت کے دن اس کے حضور فرداً فرداً حاضر ہوں گے''۔ وہاں ہر ایک کا حساب اکیلے اکیلے ہو گا اور وہ اس کی وسعت کے مطابق ہو گا۔

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ؕ﴾ کے الفاظ میں جو ایک اہم اصول بیان کر دیا گیا ہے' بعض لوگ دنیا کی زندگی میں اس کا غلط نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں۔ وہ دنیا کے معاملات میں تو خوب بھاگ دوڑ کرتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے اندر صلاحیت اور استعداد ہی نہیں ہے۔ یہ محض خود فریبی ہے۔ استعداد و استطاعت اور ذہانت و صلاحیت کے بغیر تو دنیا میں بھی آپ محنت نہیں کر سکتے' کوئی نتائج حاصل نہیں کر سکتے' کچھ کما نہیں سکتے۔ لہٰذا اپنے آپ کو یہ دھوکہ نہ دیجیے اور جو کچھ کر سکتے ہوں' وہ ضرور کیجیے۔ اپنی شخصیت کو کھود کھود کر اس میں سے جو کچھ نکال سکتے ہوں وہ نکال لیجیے! ہاں آپ نکال سکیں گے اتنا ہی جتنا آپ کے اندر ودیعت ہے۔ زیادہ کہاں سے لے آئیں گے؟ اور اللہ نے کس میں کیا ودیعت کیا ہے' وہ وہی جانتا ہے۔ تمہارا محاسبہ اسی کی بنیاد پر ہو گا جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے۔ اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ کیجیے کہ یہ قرآن مجید میں پانچ مرتبہ آیا ہے۔

﴿لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ عَلَیۡہَا مَا اکۡتَسَبَتۡ ؕ﴾ ''اسی جان کے لیے ہے جو اس نے کمایا اور اسی کے اوپر وبال بنے گا جو اس نے بُرائی کمائی۔''

اس مقام پر بھی ''ل'' اور ''علٰی'' کے استعمال پر غور کیجیے۔ ﴿لَہَا مَا کَسَبَتۡ﴾ سے مراد ہے جو بھی نیکی اس نے کمائی ہو گی وہ اس کے لیے ہے' اس کے حق میں ہے' اس کا اجر و ثواب اسے ملے گا۔ ﴿وَ عَلَیۡہَا مَا اکۡتَسَبَتۡ ؕ﴾ سے مراد ہے کہ جو بدی اس نے کمائی ہو گی اس کا وبال اسی پر آئے گا' اس کی سزا اسی کو ملے گی۔

اب وہ دعا آ گئی ہے جو قرآن مجید کی جامع ترین اور عظیم ترین دعا ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا ۚ﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے۔''

ایمان اور عملِ صالح کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی شخصیت کے کونوں کھدروں میں سے امکان بھر اپنی باقی ماندہ توانائیوں (residual energies) کو بھی نکال نکال کر اللہ کی راہ میں لگا لیں' لیکن اس کے بعد بھی اپنی محنت پر' اپنی نیکی' اپنی کمائی اور اپنے کارناموں پر کوئی غرّہ نہ ہو' کوئی غرور نہ ہو' کہیں انسان دھوکہ نہ کھا جائے۔ بلکہ اس کی کیفیت تواضع' عجز اور انکساری کی رہنی چاہیے۔ اور اسے یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے پروردگار! ہماری بھول چوک پر ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا۔

انسان کے اندر خطا اور نسیان دونوں چیزیں گندھی ہوئی ہیں: ((اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الْخَطَأِ وَالنِّسْیَانِ)) خطا یہ ہے کہ آپ نے اپنی امکانی حد تک تو نشانہ ٹھیک لگایا تھا' لیکن نشانہ خطا ہو گیا۔ اس پر آپ کی گرفت نہیں ہو گی' اس لیے کہ آپ کی نیت صحیح تھی۔ ایک اجتہاد کرنے والا اجتہاد کر رہا ہے' اس نے امکانی حد تک کوشش کی ہے کہ صحیح رائے تک پہنچے' لیکن خطا ہو گئی۔ اللہ معاف کرے گا۔ مجتہد مخطی بھی ہو تو اس کو ثواب ملے گا اور مجتہد مصیب ہو' صحیح رائے پر پہنچ جائے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔ اور نسیان یہ ہے کہ بھولے سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأَ وَالنِّسْیَانَ))(۳۷) ''اللہ تعالیٰ نے میری اُمت سے خطا اور نسیان معاف فرما دیا ہے۔''

﴿رَبَّنَا وَ لَا تَحۡمِلۡ عَلَیۡنَاۤ اِصۡرًا کَمَا حَمَلۡتَہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ﴾ ''اور اے ربّ ہمارے! ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا جو ہم سے پہلے تھے۔''

ایک حمل (بوجھ) وہ ہوتا ہے جس کو لے کر انسان چلتا ہے۔ اسی سے ''حمال'' بنا ہے جو ایک بوری کو یا بوجھ کو اٹھا کر چل رہا ہے۔ جو بوجھ آپ کی طاقت میں ہے اور جسے لے کر آپ چل سکیں وہ ''حمل'' ہے' اور جس بوجھ کو آپ اٹھا نہ سکیں اور وہ آپ کو بٹھا دے اس کو ''اِصر'' کہتے ہیں۔ یہ لفظ سورۃ الاعراف (آیت ۱۵۷) میں پھر آئے گا: ﴿وَ یَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ﴾ ان الفاظ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے لوگوں کے وہ بوجھ جو اُن کی طاقت سے بڑھ کر تھے' ان کے کندھوں سے اتار دیے۔ ہم سے پہلے لوگوں پر بڑے بھاری بوجھ ڈالے گئے تھے۔ شریعتِ موسوی ہماری شریعت کی نسبت بہت بھاری تھی۔ جیسے ان کے ہاں روزہ رات ہی سے شروع ہو جاتا تھا' لیکن ہمارے لیے یہ کتنا آسان کر دیا گیا کہ روزے سے رات کو نکال دیا گیا اور سحری کرنے کی تاکید فرمائی گئی: ((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السُّحُوْرِ بَرَکَۃً))(۳۸) ''سحری ضرور کیا کرو' اس لیے کہ سحریوں میں برکت رکھی گئی ہے''۔ پھر رات میں تعلق زن و شو کی اجازت دی گئی۔ ان کے روزے میں خاموشی بھی شامل تھی۔ یعنی نہ کھانا' نہ پینا' نہ تعلق زن و شو اور نہ گفتگو۔ ہمارے لیے کتنی آسانی کر دی گئی ہے! ان کے ہاں یوم سبت کا حکم اتنا سخت تھا کہ پورا دن کوئی کام نہیں کرو گے۔ ہمارے ہاں جمعہ کی اذان سے لے کر نماز کے ادا ہو جانے تک ہر کاروبارِ دنیوی حرام ہے۔ لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد آپ کاروبار کر سکتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ ۚ﴾ ''اور اے ربّ ہمارے! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہم میں طاقت نہ ہو۔''

﴿وَاعۡفُ عَنَّا﴾ ''اور ہم سے درگزر فرماتا رہ!''
ہماری لغزشوں کو معاف کرتا رہ!
﴿وَاغۡفِرۡ لَنَا﴾ ''اور ہمیں بخشتا رہ!''
ہماری خطاؤں کی پردہ پوشی فرمادے!
مغفرت کے لفظ کو سمجھ لیجیے۔اس میں ڈھانپ لینے کا مفہوم ہے۔مِغۡفَرۡ 'خود' (ہیلمٹ) کو کہتے ہیں' جو جنگ میں سر پر پہنا جاتا ہے۔یہ سر کو چھپالیتا ہے اور اسے گولی یا تلوار کے وار سے بچاتا ہے۔تو مغفرت یہ ہے کہ گناہوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ڈھانپ دے' ان کی پردہ پوشی فرمادے۔
﴿وَارۡحَمۡنَا﴾ ''اور ہم پر رحم فرما۔''
﴿اَنۡتَ مَوۡلٰـنَا﴾ ''تو ہمارا مولا ہے۔''
تو ہمارا پشت پناہ ہے' ہمارا والی ہے' ہمارا حامی و مددگار ہے۔ہم یہ آیت پڑھ آئے ہیں: ﴿اَللّٰـهُ وَلِيُّ الَّـذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ﴾ (آیت ۲۵۷)۔
﴿فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ﴿۲۸۶﴾﴾ ''پس ہماری مدد فرما کافروں کے مقابلے میں۔''
انہی الفاظ پر وہ دعا ختم ہوئی تھی جو طالوت کے ساتھیوں نے کی تھی۔اب اہل ایمان کو یہ دعا تلقین کی جا رہی ہے' اس لیے کہ مرحلہ سخت آرہا ہے۔گویا:

تاب لاتے ہی بنے گی غالب مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!

اب کفار کے ساتھ مقابلے کا مرحلہ آرہا ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا جارہا ہے۔یہ درحقیقت غزوۂ بدر کی تمہید ہے۔

بارك الله لی ولکم فی القرآن العظیم و نفعنی و ایاکم بالآیات و الذکر الحکیم